یورپ کے دن

یورپ کا سفر نامہ

الطاف شیخ کی اپنی ویب سائیت

www.altafshaikh.com.pk

دنیا کو کھلی آنکھوں سے دیکھئے

سب سے دلچسپ مطالعہ انسان کا ہے اور ایک دانا کے بقول اگر تم انسان کو سمجھنا چاہتے ہو تو سفر کرو۔ بقول غالب:

کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

الطاف شیخ صاحب خوش نصیب ہیں کہ ان کی پیشہ ورانہ زندگی میں جہاں گردی شامل ہے۔ غالباً یہ محاورہ کہ اس شخص نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے، انہی پر صادق آتا ہے۔ انہوں نے سفر نامے کثرت سے لکھے ہیں۔ ایک بار سفر کے ساتھ لکھنے کی چاٹ پڑ جائے تو لکھنے والے کے ذوقِ تجسس کی تسکین نہیں ہوتی لیکن ان کی زیرِ نظر کتاب غالباً محض سفر نامہ نہیں، بلکہ اور بہت کچھ ہے۔ یورپ کے مختلف ملکوں میں قیام کے تجربات ہیں، خاص طور پر سوئیڈن کی سرگزشت جہاں انہوں نے نسبتاً زیادہ عرصہ قیام کیا۔ یہ ان کے شب روز کا احوال اور ایک تہذیب کے اندر سفر کرنے کی روداد ہے۔

وہ لوگ جو اپنی ہی معاشرت کے دائرے میں زندگی گذارتے ہیں، انہیں اس دائرے سے باہر کے لوگ بالعموم معاشرتی آداب سے عاری، ان کے چہرے مہرے اجنبی، زبان اور لب و لہجہ بیگانہ، رہن سہن اور طور طریقے ناپسندیدہ لگتے ہیں۔ ان میں اگر تنگ نظری پیدا ہو جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن اس معاشرتی تنگ نائے میں رہنے والے لوگ بھی ہمیشہ تنگ نظر نہیں ہوتے، بشرطیکہ وہ دور تک پھیلی ہوئی زندگی کو اپنے مطالعے کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کریں، اگر وہ سفر اختیار کریں تو غیروں سے ان کی اجنبیت دور ہو جاتی ہے۔ ان میں رواداری پیدا ہوئی ہے۔ وہ ے ہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس باغ جہاں کی رونق رنگارنگ پھولوں سے اور رنگارنگ تہذیبوں سے ہے۔ اگر سبھی لوگ ایک جے سے ہوں، تو ے ہ یکسانیت آدمی کو زندگی سے بیزار کر دے گی۔

اب مثلاً سوئیڈن کی ستر سالہ بڑی بی جو میک اپ سے آراستہ تتلی کی طرح اڑتی پھرتی ہیں، ہمارے لئے قابل برداشت ہو جاتی ہیں، جب ہم انہیں ان کی معاشرت کے پس منظر میں دے کھتے ہیں:

"ارے بھائی ے ہ یورپ ہے اور یورپ کے بھی شمالی ممالک جن کے مقابلے میں جرمنی، فرانس، اٹلی، اسپین بھی کچھ نہیں ہے۔ ے ہاں اس قسم کی باتیں عام ہیں۔ ے ہاں آپ کو ایسی کئی عورتیں ملیں گی، جن کو اکثر آپ ے ہ کہتے ہوئے سنیں گے کہ ے ہ پرس مجھے پہلے شوہر نے دیا تھا، ے ہ سینڈل برتھ ڈے پر مے رے یونانی بوائے فرینڈ نے دی تھی، ے ہ پرفیوم مے رے دوسرے میاں نے طلاق کے بعد نیو ائر ڈے پر بھیجا تھا، ے ہ قلم مے رے تے سرے شوہر نے دیا تھا اور خود اس وقت چوتھے یا پانچویں شوہر کے ساتھ ہوں گی"

"توبہ توبہ اللہ معاف کرے" ہماری خاتون ے ہی کہیں گی۔ لیکن ستر سالہ یوزے کا تقاضا ے ہ تو نہیں ہے کہ ایشیائی ملکوں کی عورتیں بھی ویسی ہی بن جائیں۔ لیکن سوئیڈن میں جاکر رہنا ہو یا یورپ کے کسی اور ملک میں شمالی یا جنوبی امریکہ میں جاکر رہنے کا اتفاق ہو، تو ان کی معاشرت کو سمجھنے کی کوشش ضرور کریں، وہ کون سے عوامل اور محرکات ہیں، جن کی جڑوں سے ے ہ معاشرت پھوٹی ہے، ان کا مطالعہ کریں۔ ے ہ دنیا اور اس دنیا کے لوگ بہت دلچسپ ہیں، ے ہاں ہر فرد ایک کہانی ہے۔ اسے پڑھتے جائیں، کہانی کبھی ختم نہیں ہو گی۔

الطاف شیخ کی ے ہ کتاب بھی ناولوں کی طرح دلچسپ ہے، اسے پڑھنا شروع کریں تو ہاتھ سے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ ے ہ ایک مہذب روادار اور خوش طبع مصنف کے تجربات کی سرگزشت ہے، جو آپ کو طرح طرح کے لوگوں سے ملاقات کا موقع فراہم کراتا ہے۔ مختلف ملکوں کے باشندوں کے عادات و خصائل سے متعارف کراتا ہے۔ ان میں تیونس، الجیریا، لیبیا، مشرقِ وسطیٰ کے باشندے جنوبی ایشیا سے آئے ہوئے سکھ، چپسی اور مختلف خصوصیات کے حامل افراد شامل ہیں۔

اب کہ دنیا ایک گلوبل گاؤں بن گئی ہے اور ساری انسانی برادری ایک ہی شامیانے کے نے چے سمٹی آ رہی ہے، انسانوں کو ایک دوسرے کے لئے روادار اور فراخ دل بننا پڑے گا۔ دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلی ہوئی دہشت گردی کا ایک سبب ے ہی ہے کہ انسان نے انسان کو قریب سے دے کھنے اور سے کھنے میں کوتاہی کی ہے۔ اپنی معاشرت کے دائرے میں اسیر وہ صرف اپنے وجود کو اعلیٰ وارفع ءاور اپنے طور طریقوں کو مثالی سمجھتا ہے، اور دوسروں کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔

حسن عابدی

مئی 2003

ے یورپ ہے....

سوئیڈن میں 20 سال سے رہائش پذیر مشرقی یورپ کے ایک باشندے سے میں نے ایک دن کہا:

"سوئیڈن کی زندگی بھی عجیب ہے! شادی اور طلاق، دوستی اور جدائی توے ہاں بس ایسی ہی ہے جے سے کوئی چھوٹا بچہ نیکر تبدیل کرے۔"

اور پھر میں نے اسے ہماری آٹھ منزلہ عمارت کے ایک فلیٹ میں رہنے والی ایک معمر خاتون، جس کا نام یوزے ہے کا قصہ سنایا۔

"ہماری عمارت کی چوتھی منزل پر رہنے والی خاتون ے وزے صاحبہ تقریباً پینسٹھ یا ستر سال کی ہوں گی۔"

"ے ہاں ے ہ عمر تو کچھ بھی نہیں اور اسے بڑھاپے میں تو شمار کیا ہی نہیں جاتا۔"

اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"آپ نے بالکل صحیح کہا،" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا، "ے ہاں دو سال رہ کر مجھے اس بات کا احساس ہے اور روز دیکھ رہا ہوں کہ یہاں کی اسّی سال کی بوڑھی خواتین بھی سولہ سنگھار کر کے نکلتی ہیں جن کے چہروں پر ہر وقت تازہ اور اعلیٰ قسم کا میک اپ ہوتا ہے لیکن میں آپ کو میڈم یوزے کی ایک اور تعجب خیز بات بتاتا ہوں۔"

"مجھے لگتا ہے آپ نے اسے کسی کلب یا ڈسکو میں ڈانس کرتے ہوئے دے کھا ہے؟" اس یورپی باشندے نے کہا جو سامنے والی بلڈنگ میں رہتا ہے اور اکثر بس اسٹاپ پر ملتا ہے۔

"ہاں بس کچھ اس قسم کی ہی بات ہے بلکہ اس میں کچھ میری سادگی کا بھی عمل دخل ہے، جس پر میں خود بھی اپنے آپ پر ہنستا رہتا ہوں۔

میں جب سوئیڈن میں آیا اور مذکورہ عمارت میں رہائش اختیار کی تو یوزے سے میری پہلے دن ہی لفٹ میں اور پھر بس اسٹاپ پر ملاقات ہو گئی۔ ہم لوگ ساتویں منزل پر رہتے تھے اور ے ہ چوتھی منزل کے ایک فلیٹ میں۔ ہمارے آنے سے ایک مہینہ قبل اس کے میاں کا انتقال ہو چکا تھا اس نے بڑی عمر میں شادی کی تھی اور اس کا میاں اس سے بھی پندرہ برس بڑا تھا۔

یوزے سے روزانہ میری ملاقات اکثر بس میں، لفٹ میں یا قریبی دکان، "کانسوم" میں ہو جاتی تھی۔ شکل سے غمگین لگتی تھی لیکن میک اپ اور چمکتے دھمکتے کپڑوں میں اے سے لگتی تھی جے سے لندن کے کسی تھیٹر میں کام کر کے آ رہی ہو۔ میرا ایک ایرانی پڑوسی تویوزے کو ہر وقت بناٹھنا دے کھ کر کہتا تھا کہ "ے ہ عورت تو ملکہ ایلزبتھ کی ماں لگتی ہے۔ اسے ان فلیٹوں میں رہنے کی بجائے بکنگھم پیلس میں رہنا چاہے ے۔" ے وزے کبھی کبھی پائپ پیتے ہوئے اس

رعب سے چلتی تھی تو مجھے اور مے رے گھر والوں کو ہمارا ایک سندھی قلمکار اور دانشور سراج میمن یاد آتا تھا لیکن ہمارے دوسرے پر تگالی پڑوسی کو (شاید یوزے کے ناز نخروں کو دھیان میں رکھ کر) اطالوی فلمی اداکارہ صوفیہ لورین یاد آتی تھی۔

ہم یوزے کے ساتھ اورے وزے ہم سے بات کرنے کے لئے بے چین رہتی تھی لیکن زبان مسئلہ بن جاتی تھی کیونکہ یوزے کی مادری زبان فرنسیسی تھی۔ شادی سے پہلے جرمن سے کھی تھی اورے ہاں رہنے کے بعد سوئیڈش بولنے لگی اورے ہ تینوں زبانیں ہمیں نہیں آتی تھیں۔ وہ کچھ ٹوٹی پھوٹی انگریزی ضرور جانتی تھی بہر حال کچھ اشاروں میں کچھ اس ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اور کچھ ڈکشنری کی مدد سے ے وزے مجھے اور میری بیوی کو اپنے قصے سناتی رہتی تھی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ے وزے نے فرانس سے سوئیڈن آکر ے ہاں رہائش اختیار کرلی تھی۔ اس کا میاں جس سے اس کی دس سال پہلے شادی ہوئی تھی ایک امریکی صحافی تھا۔ ے وزے نے اس کی کئی تصاویر جو اس نے اپنے البم اور فلیٹ کی دیواروں پر سجار کھی تھی ہمیں دکھائیں۔ اس کے علاوہ اس نے ہمیں اپنے میاں کی طرف سے اس کی سالگرہ پر دے ئے گئے تحفے اور ٹائم اور لائف میگزین کے وہ پرانے پرچے دکھائے جن میں اس کے میاں کے مضامین شائع ہوئے تھے۔ کچھ زبان سے اور کچھ اشاروں سے ہمارے سامنے اپنے غم کا اظہار کرتی تھی کہ وہ تنہائی میں اپنے پے ارے شوہر کا سوچ سوچ کر آنسو بہاتی رہتی ہے۔ کسی بھی چیز میں اس کا دل نہیں لگتا۔ دو دو دن گزر جاتے ہیں لیکن بھوک نہیں لگتی۔ زبردستی دو چار نوالے زہر مار کرتی ہوں ورنہ پورا دن شراب پی کر غم غلط کرتی رہتی ہوں۔ نیند بھی صحیح طرح نہیں آتی اور اگر آتی ہے تو ہڑبڑا کر اٹھ جاتی ہوں۔ کیا کروں ہر وقت اور ہر چیز سے مجھے اپنے میاں کی یاد ستاتی ہے۔ شوہر کے بغیر ے ہ چیزوں سے بھرا گھر کاٹنے کا دوڑتا ہے۔"

ے وزے کی یہ دکھ بھری باتیں سن کر مجھے ایسا لگا کہ ے ہ خاتون اپنے شوہر کی موت کے صدمے کے باعث اب مری کہ اب۔ پھر میں ے ہ بھی دعا کرتا تھا کہ اپنے میاں کے غم میں اگر اس کی اچانک سانس نکلنی ہو تو لفٹ، بس اسٹاپ یا اپنے گھر میں اس وقت نہ نکلے جس وقت ہم اس کے ساتھ ہوں کیونکہ ہو سکتا ہے مقامی لوگ ے ہی سمجھیں کہ اس بڑھیا کو ہم نے مارا ہے۔ میڈم ے وزے کو میاں کی یاد میں اس قدر غمزدہ دیکھ کر مجھے کئی بار خیال آتا کہ اسے تسلی دی جائے لیکن ایک ایک جملہ بنا کر یوزے کو سمجھانا تے شے سے نہر کھودنے کے برابر تھا اور دوسری بات ے ہ کہ ے ہ ضروری نہیں کہ مغرب کی اس دنیا میں مشرق کے ے ہ ڈائیلاگ کارگر بھی ہوں گے۔ "بس جی قسمت میں ے ہ لکھا تھا۔ تمہارے میاں کے لئے دعا کرتے ہیں کہ اسے جنت میں جگہ نصیب ہو اور آپ کو اللہ تعالیٰ صبر جمیل عطا فرمائے۔" وغیرہ یا اس کی بڑی عمر کا سوچ کر ے ہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ زندگی کے باقی دن اللہ اللہ کرو تا کہ جلد ہی تم جنت میں اپنے میاں سے جاملو۔

ایک دفعہ یوزے نے اپنے متوفی میاں کا جب ذکر چھیڑا تو میں کہنے والا تھا کہ آپ کے میاں کے مرنے سے بہتر تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کے ہاتھوں میں موت دے دیتا اس سے کم از کم زندگی کے آخری دنوں میں اکے لے دکھ تو کاٹنے نہ پڑتے۔ لیکن اچھا ہوا میں یہ جملہ زبان پر نہ لایا۔ ہمارے ملک میں پہلی بات یہ کہ ستر سال کی عورت بڑی مشکل سے نظر آئے گی اگر ہو گی بھی تو اسے خود ہی احساس ہو گا کہ وہ زندگی کے آخری دنوں میں ہے اور وہ غریب ہر ایک کو کہتی پھرے گی کہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں۔ لیکن یہاں یورپ میں خصوصاً ان اسکنڈنیوین ممالک میں کسی بڑھیا کے لئے ستر سال واقعی بڑی عمر نہیں ہے۔ اس دن مے رے دلاسہ دے نے سے قبل ہی وہ بول پڑی "غلطی کی، اس شوہر سے تو فلاں سے شادی کر لیتی تو اچھا تھا۔ ابھی تک ہٹا کٹا پھر رہا ہے۔ ابھی تک جی رہا ہے اور اپنی بیوی کو بھی خوب عیش کراتا ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود مے رے میاں جیسا سچا عاشق مجھے نہیں ملے گا۔ وہ تو بس مجھ پر فدا تھا۔"

میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہتا تھا اور شوہر کے لئے اس کی سچی محبت کی تعریف کرتا تھا۔ "ہم مشرقی لوگ" میں نے دل ہی دل میں سوچا "صرف اپنے آپ کو ہی سچا عاشق سمجھتے ہیں۔ ہیر رانجھا، لیلیٰ مجنوں، سسی پنوں جے سے عاشقوں کا وجود صرف مشرق میں ہی سمجھتے ہیں لیکن قدرت نے یورپ کے ان برفانی ملکوں میں بھی بڑے بڑے عاشق پیدا کئے ہیں۔ سچے دل والی کئی مو ملیں اور ہیریں مغرب میں بھی بستی ہیں۔"

ے وزے کی تنہائی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس کی اولاد نہیں تھی ورنہ وو اپنے بچوں اور پوتوں نواسوں کے شور شرابے اور مسائل میں مصروف رہتی۔ اس بات کا میں نے ایک دن ذکر کیا تو میڈم ے وزے نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں بالکل صحیح کہتے ہو۔ بچہ نہ اس شوہر سے ہوا نہ پہلے والے سے۔"

"کیا اس سے قبل بھی تمہاری کسی سے شادی ہوئی تھی۔" نہ جانے کیوں یہ سوال کرتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوا جے سے تھانے پر کسی چور یا ڈاکو سے پوچھا جا رہا ہو، کہ کیا اس سے پہلے بھی تم نے ڈاکے ڈالے ہیں۔

"جی ہاں" ے وزے نے مجھے چونکاتے ہوئے کہا۔ "لیکن بہت پہلے"

"پھر وہ کب ے وہاں چھوڑ گیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں وہ کمبخت مرا نہیں۔ اسے میں نے چھوڑ دیا۔" ے وزے نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ "وہ آج بھی حیات ہے اور سمندر کے اس پار کوپن ہیگن (ڈنمارک) میں رہتا ہے۔ کبھی کبھی کرسمس یا نیا سال شروع ہونے پر فون بھی کرتا ہے۔" ے وہ کہہ کر یوزے اپنی کرسی سے اٹھی اور بحیرہ بالٹک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ کھڑکی کا پردہ ہٹا کر وہ سامنے گھورتی رہی جے سے اس کا سابق شوہر سامنے کھڑا ہو۔

میں نے نظریں اٹھا کر کھڑکی سے دے کھا بحیرہ بالٹک کی بپھری ہوئی موجیں تھیں جن میں چند فیری نما جہاز اور ہوور کرافٹ ہچکولے کھا رہے تھے اور ان کے پے چھے اس پار ڈنمارک کے شہر کوپن ہیگن کی عمارتیں تھیں جو دھند کی وجہ سے صاف نظر نہیں آ رہی تھیں۔

"لو بھئی ے ہ بھی خوب رہی۔" میں نے دل میں سوچا اور اس سے مزید شوہروں کا پوچھا۔

وہ کھڑکی کا پردہ کھینچ کر واپس کرسی پر آ بیٹھی۔ کڑوی کافی کا ایک گھونٹ پی کر بڑی نزاکت سے ٹشو پیپر اٹھا کر اپنے ہونٹ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے دو سے زیادہ شادیاں نہیں کیں البتہ ایک بوائے فرینڈ کے ساتھ میں نے کافی لمبا عرصہ گذارا لیکن اس سے بھی نہ بچہ ہوا نہ شادی رچائی۔ ایک اور بوائے فرینڈ کے ساتھ تقریباً چھ مہ ہے نے کا مختصر وقت گزارا لیکن شادی جیسا بندھن نہ اسے پسند تھا نہ مجھے۔ ے ہ دونوں افیئر اس وقت کے ہیں جب میں ٹین ایجر تھی۔"

ے وزے کی ایک سوتیلی بہن پیرس میں رہتی تھی وہ اس کے پاس ے ہاں سوئیڈن میں کبھی کبھی گھومنے کے لئے آتی تھی۔ ایک دن ے وزے نے بتایا کہ اس دفعہ وہ اس کے پاس پیرس جا رہی ہے۔

"ے ہ تو بہت اچھا کر رہی ہو تمہارا دل بہل جائے گا۔" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔

بہر حال شوہر کے انتقال کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد ے ہ پہلی دفعہ اپنا شہر مالمو چھوڑ کر ایسٹر کی چھٹیاں منانے کے لئے اپنی بہن کے پاس پیرس روانہ ہوئی اور دو ڈھائی ہفتے لفٹ میں، بس میں، ٹرینگلمیں (شہر کے مرکزی علاقے) میں وہ نظر نہ آئی۔ بیسویں دین پیرس سے لوٹی تو اس کا ایک ہاتھ اپنی شولڈر بیگ میں تھا جس میں وہ سفر کا سامان ڈال کر گئی تھی اور دوسرا ہاتھ اس کی عمر کی لگ بھگ ایک بوڑھے آدمی کی کمر میں تھا۔ پتہ چلا کہ پہلی رات ہی پیرس کے ایک نائٹ کلب میں اسے ے ہ رنڈوا مل گیا اور دونوں کی ایک دوسرے سے بن گئی۔ بہن کے گھر تقریباً ایک ہفتہ بھی مشکل سے رہی اس کے بعد روج اور لپ اسٹک سے سجا اپنا چہرہ اور میک اپ سے بھرا بیگ لے کر باقی دن اپنے یار کے فلیٹ پر جا گزارے۔ واپسی پر اسے گھیر گھار کر ے ہاں مالمو لے آئی۔

میاں صاحب سولہ سنگھار کرنے والی اس بڑھیا سے خوش یا شاید اس ملک سوئیڈن سے بہت متاثر نظر آنے لگے جو بڑے ادب اور پیار سے اس بوڑھی حسینہ کو بازو سے پکڑ کر اس ملک کی سخت سردی اور برف باری میں شہر کے کبھی اس چوراہے پر تو کبھی اس نکڑ پر، کبھی سینما ہال کے باہر تو کبھی برف سے ڈھکے پارک میں واک کرتے نظر آنے لگے اور ے ہ ہماری بڑھیا ے وزے بھی ایک عدد نیا شوہر حاصل کر کے بغیر رسی کے مست ہرنی بن گئی۔ اب تو اس کے قدم قدم سے ڈرامہ بازی ٹپکنے لگی۔ بس سے بھی اس وقت تک نے چے نہیں اترتی جب تک اس کا ے ہ فرانس سے درآمد کر کے لایا گیا نیا یار پہلے اتر کر اس کی انگلی پکڑ کر نے چے اترنے کا اشارہ نہ کرے۔ لفٹ میں، بس میں، راستے

میں، جہاں ملتی تھی بات ہو یا نہ ہو مسکراتی اور قہقہے لگاتی نظر آتی۔ وے سے توے وزے ہم ایشیائی لوگوں کو ہر وقت سمجھاتی رہتی تھی کہ باہر سخت سردی میں منہ کھول کر بات نہیں کیا کرو اور جمائی آئے تو اپنے منہ پر ہاتھ رکھنا چاہیے اور اب تو ماشاءاللہ خود تو جیسی زلیخا بی بی بن گئی۔ ناز نخرے، کپڑوں، جوتوں اور سرخی پاؤڈر میں تو وے سے ہی وہ فلپائن کی امیر ملڈا سے کم نہیں تھی اور اب تو نئے شوہر کی لاٹری نکلنے پر اپنے ناخنوں پر بھی ٹیکنیکا لمر نیل پالش لگانے لگی اور اس سے ملتا جلتا مفلر اور ٹوپی پہننے لگی۔ اس تبدیلی کو پڑوس والی عمارت میں رہنے والے اور ہمارے بس اسٹاپ سے بس پکڑنے والے بنگلہ دیش کے کیپٹن حبیب نے بھی محسوس کیا جو ایک دن بس میں چڑھتے ہی اس نے مجھے اردو میں کہا۔ "یار تمہاری عمارت والے بڑھیا سٹھیا گئی ہے۔ اوور کوٹ پہننے کی بجائے ہاتھ میں لیکر پھرتی ہے اسے نمونیا نہ ہو جائے۔"

"مے رے بھائی! ساٹھ کی تو وہ آج سے دس سال پہلے ہو چکی تھی۔" میں نے کیپٹن حبیب کو بتایا۔

"بہر حال۔" اس نے میری بات کو اہمیت نہ دے تے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "بڑھیا ہے بڑی چالاک، شوہر کے روپ میں اس نے ایک عدد نوکر رکھ لیا ہے۔" (یاد رہے کہ سوئیڈن وہ ملک ہے جہاں ذاتی نوکر رکھنا غیر قانونی ہے) وے سے یوزے نے بھی اپنے اس نئے شوہر / دوست سے کمال کا برتاؤ رکھا ہوا تھا۔ ے وزے چونکہ ایک عورت تھی اور پوری عمارت میں رہنے والے تمام افراد سے بڑی عمر کی ہونے کی وجہ سے ہم سب اس کا احترام کرتے تھے۔ عمارت کا دروازہ کھولنے سے لی کر بس میں چڑھنے یا لفٹ منگوانے کے لئے بٹن دبانے تک کا کام ہم کرتے تھے لیکن اب اس کے ے ہ سارے کام اس کا فرانسیسی عاشق کرتا تھا بلکہ کبھی کبھی تو وہ بیچارا ہمارے لئے بھی دروازہ کھول کر کھڑا رہتا تھا اور ے ہ فرانسیسی میں اس سے ہماری تعریفیں کرتی رہتی تھی۔

بہر حال میڈم ے وزے کا ے ہ نیا شوہر شروع شروع میں تو اس پر فدا ہوتا رہا اور ے وزے پر اپنی جان تو کیا پیرس اور روم تک قربان کرنے کے لئے تیار نظر آتا تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ اس کی طبیعت میں چڑچڑا پن آتا گیا اور تقریباً دو ہفتے کے بعد وہ اس خاتون سے سخت بیزار نظر آنے لگا۔ اپنی اس بوڑھی محبوبہ کے لئے عمارت یا لفٹ کا دروازہ کھولنا بھول جاتا تھا یا جان بوجھ کر پیچھے ہٹ جاتا تھا تاکہ وہ خود جا کر کھولے اور کبھی اسے کھولنا بھی پڑتا تو وہ اس بیزاری سے کھولتا تھا جے سے دروازے اور اس کے بازو کی Mechanism کے کل پرزے گھس گئے ہوں اور دونوں کو (یعنی دروازے اور اس کے فرانسیسی عاشق نامدار کو) گریز اور تیل کی ضرورت ہے۔

مزید ایک ہفتے بعد ان میں اور بھی دوری آ گئی۔ دن کو جب ے وزے کی سیر کا وقت ہوتا تھا اس وقت ے ہ سر درد کا بہانہ بنا کر سوتا رہتا تھا اور شام کو جب ے وزے زیادہ پی کر مدہوش ہو جاتی تھی تو ے ہ اسے اکیلا چھوڑ کر مالمو کی گلیوں میں ٹہلنے نکل پڑتا تھا۔ ایک رات میں جہاز کی ڈیوٹی کر کے دیر سے واپس آیا تو ے وزے کے دلبر جاناں کو عمارت کا

مین گیٹ کھولتے دے کہا۔ نشے میں دھت ہونے کی وجہ سے اس کو صحیح چابی نہیں مل رہی تھی۔ میں نے اپنی چابی سے دروازہ کھول کے لفٹ بلانے کے لئے بٹن دبایا۔ اس نے لفٹ کا تھوڑی دیر انتظار کیا پھر اچانک اسے کوئی خیال آیا اور مجھ سے جرمنی جانے والی ٹرین کا شیڈول پوچھا۔

"خیریت؟" میں نے اسے وقت بتاتے ہوئے دریافت کیا۔

"میں وہاں سے پیرس جانا چاہتا ہوں۔ آج ہی۔" اس نے جواب دیا۔ اتنے میں لفٹ آگئی لیکن وہ لفٹ میں آنے کی بجائے مین گیٹ کھول کر باہر چلا گیا۔ مجھے اے سے لگا جے سے اس نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ وہ زندگی کے مزید دن اس بور بڑھیا کی قید میں نہیں گذارے گا۔

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ اس کے بعد فرانس سے درآمد کیا ہوا ے ہ عاشق مالمو کی گلیوں میں پھر نظر نہیں آیا۔ ہماری عمارت والی بڑھیا (یوزے) مستقل تین چار دن باہر نہ نکلی۔ زیادہ خوشی یا زیادہ غم کے موقع پر ے ہاں کے لوگ شراب پی کر پڑے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ان بوڑھے اور اکے لے رہنے والوں کا خدشہ ہوتا ہے کہ کہیں ان کا انتقال تو نہیں ہو گیا۔ بہر حال اس صورت میں مر جانے والے کے کمرے سے بدبو اٹھتی ہے یا اس کے پاس اگر کتا ہے تو وہ روٹین پوری نہ ہونے پر (اسے کھانا نہ ملنے اور ٹوائلٹ کے لئے نہ لے جانے پر) بھونکنا شروع کر دیتا ہے اور محلے والے پولیس کو فون پر اطلاع کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اے سے اکے لے رہنے والوں کو حکومت سے ایک الیکٹرانک الارم دیا جاتا ہے جس کے ذرے عے وہ دن میں دو یا تین بار پولیس اسٹیشن یا اسپتال سگنل بھے جتے رہتے ہیں۔ نہ بھے جنے کی صورت میں ان کو تشویش ہوتی ہے اور اکے لے رہنے والے کے گھر ایمبولینس پہنچ جاتی ہے۔

لیکن ہماری پڑوسن یوزے زندہ تھی۔ چوتھے دن گھر سے باہر نظر آئی۔ اس کے ہاتھ میں رنگین ہیٹ تھا اور چہرے پر اداسی۔ میں نے ہیلو کر کے اس سے اس کے فرانسیسی محبوب کا پوچھا۔

اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "چلا گیا۔"

"آپ نے اسے نکال دیا؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"نہیں اسے ے ہاں رہنا پسند نہیں آیا۔" یوزے نے بتایا۔

"کیوں؟ فرانس سے تو سوئیڈن اچھا ہے۔" میں نے کہا

"بس" یوزے نے خلاء میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔ "کہتا تھا ے ہاں کا موسم اور ماحول اچھا نہیں ہے۔ ہر وقت بادل اور اندھیرا چھاے ا رہتا ہے۔ ہر وقت سردی اور بر فباری ہوتی رہتی ہے۔" اور پھر ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ "آج وہ بہت یاد آرہا ہے۔"

"کون؟ تمہارا امریکی شوہر؟" میں نے پوچھا۔

"اسے تو میں تقریباً بھلا ہی چکی ہوں۔ میرا فرانسیسی دوست.... کے سے ساتھ ساتھ مالمو میں ہم گھوما کرتے تھے، شہر کی ایک ایک چیز مجھے اس کی یاد دلائے گی۔ گھر میں بیٹھتی ہوں تو گھر کی ایک ایک چیز کاٹنے کو دوڑتی ہے، ایک ایک چیز کے ساتھ اس کی یاد وابستہ ہے۔"

میں نے وزے کی ے ہ بات ختم کر کے اپنے ورپی دوست کی طرف حیرت سے دے کھا تو اس نے ہنس کر کہا۔

"ارے بھائی ے ہ یورپ ہے اور یورپ کے بھی Scandinavian (شمالی) ممالک جن کے مقابلے میں جرمنی، فرانس، اٹلی، اسپین بھی کچھ نہیں ہے۔ ے ہاں اس قسم کی باتیں عام ہیں۔ ے ہاں آپ کو ایسی کئی عورتیں ملیں گی جن کو اکثر آپ ے ہ کہتے ہوئے سنیں گے کہ ے ہ پرس مجھے پہلے شوہر نے دیا تھا، ے ہ سینڈل برتھ ڈے پر مے رے یونانی بوائے فرینڈ نے دی تھی، ے ہ پرفیوم مے رے دوسرے میاں نے طلاق کے بعد نیو ایئر ڈے پر بھیجا تھا، ے ہ قلم میرے تیسرے شوہر نے دیا تھا اور خود اس وقت چوتھے یا پانچویں شوہر کے ساتھ ہوں گی۔"

"آپ نے بالکل صحیح کہا۔" میں اس کی بات مانتے ہوئے بولا۔ "آپ کے یورپی تو کیا اس ملک اور اس ماحول میں رہ کر ہمارے ایشیائی بھی بدل گئے ہیں اور آپ تو چیزوں کے لئے بتاتے ہیں۔ میں نے تو بچوں کے لئے بھی کچھ ایسا ہی سنا۔ اسٹاک ہوم میں ایک پاکستانی سے ملاقات ہوئی بتانے لگا کہ اس کا بیٹا پاکستان میں اپنی دادی کے پاس رہتا ہے۔ اس پر میں نے پوچھا۔ اپنی ماں کو تو یاد کرتا ہو گا؟"

"نہیں۔ وہ کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی بعد میں میں نے اسے طلاق دے دی۔"

"تو ے ہ عورت کون ہے جو آپ کے ساتھ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ے ہ میری دوسری بیوی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ اس وقت ایک بچے کو کھے لتے دے کھ کر میں نے کہا "ے ہ لڑکا غالباً آپ کا اس بیوی سے ہو گا۔"

"نہیں ے ہ میرا بیٹا نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "ے ہ لڑکا میری اس دوسری بیوی کا ضرور ہے لیکن اس کے پہلے والے شوہر سے۔"

سوئیڈن میں ایک ٹیونیشین سے ملاقات

یورپ میں ہمارے ساتھ جو دنیا بھر کے جہازراں تھے ان میں منصف نام کا تیونس کا ایک کیپٹن بھی تھا جو ہم سے ایک سال سینئر تھا۔ وہ بالکل خاموش طبع اور اپنے آپ میں مگن رہتا تھا۔ یہاں تک کہ کسی کو اس کی موجودگی کا احساس تک نہیں رہتا تھا۔ مجھے بھی سال کے آخر میں پتہ چلا جب وہ اپنے دو سال مکمل کر کے اب اپنے ملک واپس جانے والا تھا، اور یہ بھی اس لئے کہ مجھے اس سے کمپیوٹر خریدنا پڑ گیا ورنہ اس سے شاید بات چیت بھی نہ ہوتی۔

اپنا تھیسز ٹائپ کرنے کے لئے میں اپنا ذاتی کمپیوٹر خریدنا چاہتا تھا اور کوشش میں تھا کہ دکان سے نیا خریدنے کی بجائے اچھی کنڈیشن والا سیکنڈ ہینڈ کمپیوٹر لے لوں۔ مے رے پڑوسی ایران کی بندرگاہوں کے ڈائرے کٹر جنرل سید علی استری کو جب پتہ چلا تو اس نے بتایا، "آپ کو کمپیوٹر لینا ہے تو ٹیونیشیا کے کیپٹن منصف سے خریدیں کیونکہ وہ اپنے ملک واپس جاتے وقت کمپیوٹر نہیں لے جانا چاہتا۔"

مے رے لئے ےہ نیا نام تھا۔ میں نے ایک دو افراد سے منصف کا پوچھا تو پتہ چلا کہ اس کا زیادہ تر وقت یونیورسٹی کے بجائے گھر میں ہی گزرتا ہے اور بہت ہی کم لوگوں سے اس کی بات چیت ہے۔ اہم سیمینار یا اجلاسوں میں بھی کبھی کبھار نظر آتا ہے اور وہ مقامی لوگوں کے اے سے محلے میں رہتا ہے جہاں ہم جہازرانوں میں سے کوئی نہیں ہے اس لئے اس سے لوگوں کی ملاقات کم ہی ہوتی ہے۔

مے رے نصیب اچھے کے منصف مجھے دوسرے دن ہی یونیورسٹی کی کینٹین میں نظر آ گیا بلکہ ایک ایرانی کیپٹن نے مجھے اس سے ملوایا۔ میں نے اس سے کمپیوٹر کی بات کی۔

"ہاں میں اسے بیچنا چاہتا ہوں۔" منصف نے بتایا۔ "میں نے اسے صرف تھیسز لکھنے کے لئے خریدا تھا اسے تقریباً دو مہینے ہوئے ہیں۔"

"پیسوں کا بتائیں کتنے میں دیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"دو ہزار کرونے (کوئی دس ہزار روپے) میں"۔ منصف نے بتایا۔

"منصف ےہ طے شدہ قیمت ہے یا کم کرو گے؟" میں نے پوچھا۔

"بس اتنے میں کسی نے خریدا تو ٹھیک ہے ورنہ...." منصف آگے کچھ بولتا اس سے پہلے مے رے ساتھ کھڑے اور مے رے ساتھ مالمو (سوئیڈن) میں آئے ہوئے پاکستانی دوست کیپٹن سلیم نے اس کا جملہ پورا کرنے کے لئے کہا۔

"ورنہ تیونس لے جاؤ گے۔"

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔" منصف نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "کسی کو مفت میں دے جاؤں گا۔"

"اچھا بھائی دکھاتو دو۔" میں نے کہا۔

"ابھی نہیں۔ آج میں اپنے تھیسز کے سلسلے میں فیلڈ ورک کے لئے جرمنی جارہاہوں۔ تین دن کے بعد اسی وقت اس جگہ ملنا۔ ٹھیک ہے؟"

ہم لوگ اسے خدا حافظ کہہ کر باہر نکلے۔ راستے میں کیپٹن سلیم نے کہا۔ "یارے وہ منصف بہت ہی سنجیدہ قسم کا انسان ہے۔ نہ مذاق سمجھتا ہے نہ ہنستا ہے۔ وے سے تو کہتے ہیں کہ خریدار Boss ہوتا ہے لیکن ے ہاں الٹا حساب ہے۔ قیمت بھی کم نہیں کرتا اور رعب بھی دکھاتا ہے۔"

جرمنی کی ٹرپ کے بعد جب اس سے کینٹین میں ملاقات ہوئی تو میں نے اس سے پھر کمپیوٹر دے کھنے کی بات کی۔

"دے کھنے سے کیا فائدہ؟" اس نے فلسفیوں والا سوال کیا۔

"ے وہ بات بھی صحیح ہے آپ صرف اس کے بارے میں کچھ بتادیں۔" میں نے کہا۔

"اچھا ایسا کریں ابھی ابھی مے رے ساتھ چلیں اور چل کر دیکھیں۔" منصف جو چند منٹ پہلے سستی محسوس کر رہا تھا اے سے اٹھ کھڑا ہوا جے سے کلاس روم میں ٹیچر آنے پر بچے اچانک کھڑے ہو جاتے ہیں۔

"بس مجھے صرف دو منٹ دو تو میں کیپٹن سلیم قاسم کو بھی بلالوں۔" میں نے منصف کے بدلتے ہوئے موڈ کو دھیان میں رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

"دیر نہ کرنا میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا، مجھے کہیں اور بھی جانا ہے۔" اس نے گھڑی میں وقت دے کھ کر کینٹین والے کو کافی لانے سے منع کر دیا۔

"آپ ہماری وجہ سے آرڈر کینسل نہ کریں۔" میں نے منصف سے کہا۔

منصف کچھ ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ "یا آپ مجھے کافی پے نے دیں یا چل کر کمپیوٹر دے کھیں۔" منصف کے ساتھ بیٹھے ہوئے ایرانی جہازرانوں میں سے ایک جہازران کیپٹن شہریار جو مجھے ایک دن پہلے منصف کے اترتے اور چڑھتے ہوئے بلڈ پریشر اور غصے کا بتا چکا تھا وہ مجھے آنکھ مار کر مسکرانے لگا۔ یعنی منصف سے کر لو خریداری! میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ اس شخص کے ماتحت اس کے دفتر یا سمندر پر (جہاز میں) جو کام کرتے ہوں گے وہ بے چارے تو عذاب میں ہوتے ہوں گے لیکن اس کے جاننے والے ایرانی افسران نے ے وہ بھی بتایا تھا کہ منصف دل کا نرم اور صاف ہونے کی وجہ سے لوگ اسے پسند بھی کرتے ہیں۔

خوش قسمتی سے ہمارے ملک کا جہازران کیپٹن سلیم قاسم وہیں مل گیا اور ہم تینوں چل پڑے۔ سامنے ہی بس اسٹاپ تھا جہاں پہنچنے کے لئے دو تین سڑکیں عبور کرنی پڑتی تھیں۔ منصف ٹریفک کے لال سگنلوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے سڑکیں پار کرتا گیا اور ہم بھی آج پہلی دفعہ اس شہر میں ٹریفک کا قانون توڑنے لگے اور جب ساری سڑکیں بغیر کسی گاڑی کے نے چے اور پولیس کے پکڑ میں آنے کے عبور کرلی تو ایسا لگا جے سے کسی کے گھر میں دن دہاڑے ڈاکہ مار کر

بھاگے ہوں۔ پورا جسم کانپ رہا تھا اور ے ہ ہمارا منصف بالکل نارمل لگ رہا تھا جے سے ے ہ اس کے روز کے کام ہوں۔

"کیپٹن منصف! مالمو کی پولیس تمہاری دوست ہے کیا؟" کیپٹن سلیم نے اسے ٹوکا اور وہ سمجھ گیا۔ جواب میں کچھ بولنے کے بجائے تھوڑا سا مسکرایا۔ بس آنے میں ابھی آٹھ دس منٹ تھے ایک دوسری کی صرف شکل دے کھنے کی بجائے میں نے اس دن کا گرما گرم موضوع چھیڑا اور منصف سے پوچھا آیا ہم غیر ملکیوں کے لئے ے ہاں سوئیڈن میں ٹی وی لائسنس کی فیس دے نی ضروری ہے یا نہیں۔

"یارے ہ بیکار کی باتیں ہیں۔" اس نے بیزاری سے جواب دیا۔

"لیکن آج اخبار میں تھا کہ لائسنس فیس بروقت نہ دے نے پر ڈیڑھ ہزار کرونے جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ شرافت سے ایک سو کرونے کی لائسنس فیس دی جائے۔" میں نے منصف سے مشورہ لیا۔

"میں تو دیتا ہی نہیں ہوں۔" منصف نہ کہا۔

"اور اگر ٹی وی کی آواز سے معائنہ ٹیم کو پتہ چل جائے تو"

"میں نے ٹی وی کو چادر میں باندھ کر اسٹور روم میں پھینک دیا ہے۔" منصف نے باندھنے اور پھینکنے کے اشارے ہاتھ سے کرتے ہوئے بتایا۔

"اس کا مطلب ے ہ ہوا کہ آپ ٹی وی دے کھتے ہی نہیں؟" ہم نے منصف سے پوچھا۔

"نہیں۔ کہہ تو دیا کہ اس شیطانی چرخے کو میں نے کوڑے کرکٹ کے ساتھ فی الحال اسٹور روم میں بند کر دیا ہے۔ ے ہ ٹیلیویزن، ریڈیو، باجے وغیرہ ساری بیکار کی چیزیں ہیں جو انسان کی نارمل زندگی کو ڈسٹرب کرتی ہیں۔ مجھے قرآن شریف، تفسیر اور اسلامی کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ ٹی وی ان کی پڑھائی میں ڈسٹرب کرتی ہے۔"

منصف کی ے ہ بات سن کر ہم نے ے ہ اندازہ لگایا کہ ٹیونیشیا کا ے ہ باشندہ حالانکہ وے سے تھوڑا سا کھسکا ہوا لگتا ہے لیکن مذہبی قسم کا ہے۔ اس کے اپنے خیال اور اصول ہیں جن پر وہ ہمیشہ قائم رہتا ہے اور ان میں ذرا برابر بھی لچک کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے بہت سارے لوگ اسے پسند نہیں کرتے اس لئے وہ لوگوں سے دور ہی رہتا ہے۔

بس ابھی نہیں آئی تھی کچھ کہنے کے خیال سے میں نے منصف سے پوچھا کہ وہ ے ہاں اہل خانہ کے ساتھ رہتا ہے یا اکیلا۔

"اکیلا۔" منصف نے مختصر جواب دیا۔

"پھر تو آپ ہاسٹل میں ہی ٹھہر جاتے۔" میں نے کہا۔

"ہاں ے ہ تو ہے۔" منصف نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔ "لیکن ہاسٹل میں رہنا ایسا ہے جے سے سمندر میں جہاز پر، ہر وقت جہاز کے لوگوں کے ساتھ رہنا اور ہر وقت جہازوں اور سمندروں کی باتیں بور کر دیتی ہیں اور ہولما جے سے علاقوں میں رہنا جہاں عرب، ایرانی، پاکستانی، انڈونیشی وغیرہ رہتے ہیں ایسا ہے جے سے کوئی ایشیا کے کسی شہر میں ٹھہرا ہوا ہے۔ پھر سوئیڈن مے ں آنے کا کیا فائدہ؟ اس لئے میں نے پہلے ہفتے ہی ہاسٹل چھوڑ کر سوڈروان علاقے میں فلیٹ لے لیا اور وہاں سارے لوگ مقامی سوئیڈش ہیں۔"

منصف ایشیا اور افریقہ کے لوگوں سے بہت کم متاثر نظر آ رہا تھا۔ بات بات میں ان سے بیزاری کا اظہار کر رہا تھا اور کچھ حد تک اس کی باتوں میں حقیقت بھی تھی یا شاید اپنی بات منوانے کا اسے فن آتا تھا۔ بس میں بیٹھتے ہی میں نے اس سے پوچھا۔

"منصف! ے ہ تو بتاؤ کہ تمہارے تھیسز کا موضوع کیا ہے؟"

منصف نے برا سا منہ بنا کر خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "اب ے ہاں دو سال کے لئے پھنس گئے ہیں تو ظاہر ہے کسی نہ کسی چیز پر تحقیق تو کرنی ہو گی۔ آپ کس پر لکھ رہے ہیں۔"

"میں بین الاقوامی ادارے آئی ایم او (IMO) پر لکھ رہا ہوں کہ انٹرنیشنل میری ٹائم آرگنائزیشن نے جہازوں کی سلامتی اور سمندر کو آلودگی سے پاک رکھنے کے لئے کیا کردار ادا کیا ہے۔" میں نے کہا۔

"اور آپ؟" منصف نے کیپٹن سلیم قاسم سے پوچھا۔

"میں ایس اینڈ آر پر لکھ رہا ہوں۔" کیپٹن سلیم نے جواب دیا۔

"وہ کیا ہوتا ہے؟" منصف نے اس انداز سے سوال کیا کہ ہم سمجھ نہ سکے کہ وہ اس کا لفظی مطلب جاننا چاہتا ہے یا اسے وہ معلوم ہے اور اس کا "کیا ہوتا ہے" سے ے ہ مطلب ہے کہ ے ہ تو کوئی خاص موضوع نہیں ہے۔

"لو یار اب تو پھنس گئے۔" کیپٹن سلیم جو شروع سے مجھے کیپٹن منصف سے زیادہ باتیں کرنے سے منع کر رہا تھا اب اس کے سوال پر وضاحت کرنے کے بجائے مجھ سے اردو میں کہا۔ اب کیپٹن سلیم کی بجائے میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"ایس اینڈ آر سے مراد Search & Rescue ہے۔ یعنی بحری جہاز اور ان پر سفر کرنے والے لوگ جو سمندر میں ڈوب جاتے ہیں یا لاپتہ ہو جاتے ہیں ان کو ڈھونڈنے اور بچانے کا علم۔ اس سلسلے میں کیپٹن سلیم لندن اور جاپان جا رہے ہیں جہاں کے سمندروں میں زیادہ تر جہاز ڈوب جاتے ہیں۔" میں نے ے ہ کہہ کر کیپٹن منصف کے چہرے پر پیدا ہونے والے تاثر کو پڑھنے کی کوشش کی کہ وہ میری بات یا ہمارے چنے ہوئے نئے مضامین سے متاثر ہوا یا نہیں۔

کیپٹن منصف نے ہم دونوں پر سر سے پاؤں تک ایسی نظر ڈالی جے سے ہم اپنی پتلون کی زپ بند کرنا بھول گئے ہوں۔ ہم خاموشی سے منصف کے تبصرے کا انتظار کرنے لگے۔ آخر اس نے منہ کھولا: "فرانسیسی تو آپ کو آتی نہیں کہ آپ کو ایک کہاوت سناؤں۔ بس انگریزی میں صرف اتنا کہوں گا کہ آپ دونوں انتہائی احمق ہیں۔" منصف نے کہا۔ اس نے لفظ احمق (Idiot) پر اتنا زور دے کر کہا کہ کم از کم آدھی بس کے مسافر پیچھے مڑ کر ہم لوگوں کو دے کھنے لگے۔ لیکن ے ہ بھی شکر ہے کہ ہمارے علاوہ باقی سارے سوئیڈش تھے جو اکثر انگریزی سے ناواقف ہوتے ہیں۔ سلیم نے میری ٹانگ کو دباتے ہوئے ہلکی آواز سے اردو میں کہا "اب بھی وقت ہے بس سے اتر جائیں۔"

"کیوں" سلیم کے مشورے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے میں نے منصف سے سبب پوچھا۔

"مے رے بھائی! تھیسز اے سے موضوع پر لکھنا چاہے ے"، کیپٹن منصف اب ہمیں پیار سے سمجھانے لگا۔ "جس کا مواد اپنی یونیورسٹی کی لائبریری میں ہی مل جائے۔ بیکار کی چھان بین اور تفتیش میں دور دراز کے ممالک اور جزائر پر مارے مارے پھرنے سے کیا فائدہ؟"

"ہم اپنے ملک کے لئے محنت کرنا چاہتے ہیں۔" کیپٹن سلیم نے جذباتی اور غصے لے لہجے میں کہا۔ "تا کہ ہماری محنت کا فائدہ ہمارے جہاز رانوں کی آنے والی نسلوں کو ہو سکے۔"

"مے رے بھائی ٹھنڈے ہو جائیں۔ آپ کے اور ہمارے آفریکا کے ممالک کی حالت ایک جیسی ہی ہے۔ مے رے ملک ٹیونیشیا میں میرا تھیسز کوئی ایک بار بھی کھول کر نہیں پڑھے گا۔ میں جو لکھ رہا ہوں چند سال بعد اسے دیمک کھا جائے گی۔ ے ہاں سوئیڈن میں جو علم اور نئی نئی چیزیں سے کھ کر جا رہا ہوں وہ سننے کے بجائے میرا باس مجھے ڈانٹ کر کہے گا سیانے بننے کی کوشش نہ کرو جس طرے قے سے پہلے کام کر رہے تھے وے سے ہی کرتے رہو ورنہ کوئی جہاز پکڑو اور سمندر میں دھکے کھاؤ۔ تم آفس میں بے ٹھنے کے قابل نہیں ہو۔"

"وے سے ے ہ بات ہے کہ ان وجوہات کی بناء پر ہم تیسری دنیا کے لوگ اس رفتار سے ترقی نہیں کر رہے ہیں جس سے یورپ آگے بڑھ رہا ہے۔" میں نے منصف کی بات کی تائید کی۔

My friend! Our developing countries will always remain developing. They "
".will never be developed

منصف نے قدرے غصے سے کہا۔

کیپٹن منصف جس کی مادری زبان عربی ہے، فرانس کے اسکولوں اور کالجوں سے پڑھا اور اپنے ملک ٹیونیشیا کے دفتر میں فرانسیسی بولتا ہے۔ اتنی ہی اچھی انگریزی بھی جانتا ہے اور اس وقت وہ ہم سے انگریزی میں بات کر رہا تھا۔ "دنیا میں دو قسم کے ممالک ہیں: ترقی یافتہ (Developed) اور ترقی پذیر (Under-developed) جس میں ہم

لوگ آجاتے ہیں اور چونکہ ہم اپنے اس لیبل کو برا منانے لگے تو سیانے گوروں نے اس کی جگہ Developing کا لفظ ایجاد کیا۔ لیکن سچ پوچھیں تو اس خانے میں ملائیشیا، تھائی لینڈ، کوریا، چین، تائیوان، تھائی لینڈ جے سے ملک تو آجاتے ہیں ہمارے جے سے ملک ہر گز نہیں۔ ہمارے ملک جس تے سرے خانے میں آتے ہیں اس کو ہم کبھی ترقی نہ کرنے والے (Never to be developed) ممالک کہہ سکتے ہیں۔"

"آپ اس سلسلے میں اتنے قنوطیت پسند کیوں ہیں۔ ہم بھی ترقی یافتہ بن سکتے ہیں۔" کیپٹن سلیم نے منصف کو ٹوکا۔

"ہر گز نہیں۔" منصف نے جواب دیا۔ "اس لئے کہ ہم میرٹ سے زیادہ دوستی یاری اور اقرباءپروری کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہم محنت سے زیادہ آرام پسند کرتے ہیں۔ یورپ اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک سے سبق حاصل کر کے اپنے ملک میں کھلے دل سے کام نہیں کر سکتے۔ ہم لوگوں میں یورپی افراد کی طرح ایک دوسرے سے تعاون کرنے کی عادت نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس ہم ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں۔ یورپ کے لوگ جہاز، راکٹ، کمپیوٹر جیسی بڑی بڑی چیزیں ایجاد کر کے اس کے بنانے کا علم اور طریقہ دوسروں میں بھی عام کر رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں کوئی بڑھیا باجرے کی روٹی یا پیاز کا اچار بناتی ہے تو محلے والوں سے تو کیا گھر میں موجود نندیا دیورانی سے بھی چھپاتی پھرتی ہے کہ کہیں وہ بھی میری طرح قابل نہ ہو جائے جس سے میری عزت میں کمی آجائے۔ اب مجھے بتائیں ہمارے ملک ترقی کے سے کر سکتے ہیں وہ NTBD (نیور ٹو بی ڈیویلپڈ) ہی رہیں گے۔"

میں نے موضوع بدلنے کے لئے کہا۔ "منصف آپ نے اپنے تھیسز کے بارے میں تو بتایا ہی نہیں کہ آپ کس موضوع پر لکھ رہے ہیں۔"

"فائر فائٹنگ پر۔" منصف نے مختصر سا جواب دیا۔

"ے ہ تو مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ آپ جہازوں پر آگ بجھانے کے طریقوں پر لکھ رہے ہیں لیکن ے ہ چیز آپ کسی ملک کے حوالے سے لکھ رہے ہیں، مثلاً ٹیونیشیا میں کیا ہو رہا ہے۔ آپ کے ملک میں Halon گیس جیسی چیزوں سے آگ بجھانے کو اچھا سمجھا جاتا ہے یا کسی اور نعم البدل کی تلاش میں ہیں۔"

منصف کوئی جواب دے نے کی بجائے مجھے غصے سے اے سے گھورنے لگا جے سے کہہ رہا ہو۔ "عجیب بیوقوف انسان ہو اور کے سے بیکار کے سوال کرتے ہو۔" لیکن میں بھی وقت گزارنے کے لئے اور کچھ عرب انجینئر صالح الشہری کے کہنے پر منصف سے اس چیز کی تفصیل معلوم کرنا چاہتا تھا۔ مے رے ساتھ کام کرنے والا سعودی بحریہ کا انجینئر جہازوں پر آگ بجھانے کے لئے جہاز رانوں کے لئے ضروری تربیت پر تھیسز لکھ رہا تھا اس کو جب پتہ چلا تھا کہ میں ایک دو دن میں منصف سے ملنے والا ہوں تو اس نے مجھے تاکید کی کہ میں اس کی خاطر منصف سے اس سلسلے میں

تفصیلی معلومات ضرور حاصل کروں۔ صالح منصف کی طبیعت سے ضرور واقف ہو گا تبھی تو اس نے خود پوچھنے کی آج تک ہمت نہ کی۔ میرے دوسری مرتبہ پوچھنے پر منصف نے منہ کھولا۔

"یار اپنے ملک بھی کوئی ملک ہیں جن کے حوالے دیے جائیں۔ ٹیونیشیا آج تک تو آگ بجھانے کے لئے Fire Extinguisher نہیں بنا سکا، کوئی اور چیز ایجاد کرنا تو دور کی بات ہے۔ اس کا اپنے تھ یسز میں کیا مثال یا حوالہ دے سکتا ہوں۔ ے ہی تو ہمارے ترقی پذیر ملکوں کی نادانی ہے۔ دکان میں ایک بوری ادرک اور ایک بوری لہسن رکھ کر خود کو بڑے بیوپاری سمجھتے ہیں۔ اپنی شان میں جھوٹی تعریفیں کر کے جگ ہنسائی کراتے ہیں۔"

میں نے دل میں سوچا۔ "اب میں بھی اس موضوع کی جان چھوڑ دوں ورنہ ے ہ قذافی کا پڑوسی مجھ پر ہی غصہ نکالے گا۔"

"اچھا منصف! ے ہ تو بتاؤ کہ تم نے کمپیوٹر لیا کیوں؟ ماملو کی ورلڈ میری ٹائم یونیورسٹی تمہاری رہائش سے اتنا قریب ہے کہ ے ہ چند صفحے وہاں بھی ٹائپ کر سکتے تھے۔"

"اس لئے کہ مے رے لکھنے پڑھنے کے اوقات کچھ الٹے سیدھے ہیں۔ میں گھر میں بیٹھ کر اپنے ذاتی کمپیوٹر پر ہی کام کر سکتا ہوں۔ مجھ سے دن میں نہ ، میں پڑھا جاتا۔ میں عشاء کی نماز جلدی پڑھ کر سو جاتا ہوں پھر آدھی رات کو اٹھ کر پڑھتا ہوں۔"

"تہجد کے لئے اٹھتے ہوں گے۔" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں! اللہ کا کرم ہے کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے آج تک نماز ایک وقت کی بھی نہیں چھوڑی، ہر نماز وقت پر پڑھتا ہوں۔ پڑھائی اور نوکری کے دوران میں لندن، پیرس، نجانے کن کن جگہوں پر رہا ہوں لیکن آج تک نماز اور روزہ نہیں چھوڑا۔ نماز وہ فرض ہے جو نبیوں کو بھی معاف نہیں ہوا۔ دنیا کی کوئی چیز نماز سے زیادہ نہیں ہے۔"

منصف کی ے ہ بات میں نے اپنے دماغ میں اس کے لئے پائے جانے والے اچھے خانے میں نوٹ کر لی۔ اس شخص کا اپنے پروردگار کے ساتھ اتنا مضبوط ناتا ہے کہ اسے کسی دوسرے کی پرواہ ہی نہیں۔ کئی لوگ نوکری کی مشغولیت کا یا موسم کی خرابی کا بہانہ کر کے نماز چھوڑ دیتے ہیں لیکن منصف ان میں سے نہیں ہے۔ میں نے منصف کے چہرے کو غور سے دیکھا پھر ہم دونوں نے بس کی کھڑکی سے باہر کی طرف گرتی ہوئی برف کو دیکھا۔ رات سے برفباری ہو رہی تھی ہر چیز سفید ہوتی جا رہی تھی۔ اتنے میں منصف نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"دراصل الطاف ے ہ زندگی بہت مختصر ہے۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں قریب کر کے کہا "شاید اتنی۔ انسان کی زیادہ سے زیادہ کیا عمر ہے؟ ے ہی کوئی سو سال اور اس سو سال عمر کو دنیا کی جانے کتنی صدیوں سے یا یوں

کہیں کہ جب سے حضرت آدمؑ پیدا ہوئے موازنہ کیا جائے تو زندگی ایک خواب کے مانند ہے۔ پھر اس خواب جیسی زندگی میں انسان کو غرور کرنا یا وہ مختصر عرصہ یونہی برباد کرنا اچھا نہیں ہے۔"

ہماری بس نمبر 20 مالمو اسٹیڈیم سے مڑتی ہوئی شہر کے اہم اسٹاپ سوڈروان پر رکی اور ہم منصف کا اشارہ پا کر بس سے نیچے اترے۔ منصف کا فلیٹ بس اسٹاپ سے دو تین گلیاں چھوڑ کر تھا۔ ہم ایک دفعہ پھر منصف کے پیچھے پیچھے لال سگنل کی موجودگی میں گاڑیوں سے بچتے بچاتے سڑکیں پار کرنے لگے۔ اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے پاکستان چوک کے علاقے میں گھوم رہے ہوں۔ کیپٹن سلیم نے اس وقت اپنے بٹوے میں دے کھ کر مجھ سے کہا۔

"مے رے پاس تین سو کرونے (تقریباً ڈیڑھ ہزار روپے) ہیں باقی نو سو کرونے آپ کے پاس ہوں گے؟"

میں سلیم کا مطلب سمجھ کر ہنسنے لگا۔ مالمو میں غلط وقت یعنی لال سگنل پر سڑک پار کرنے کا 600 کرونے جرمانہ ہے۔ ے ہ جرمانہ گاڑیوں والوں اور پیدل چلنے والوں کے لئے برابر ہے۔

"یار صحیح کہتے ہو۔" میں نے کیپٹن سلیم سے کہا۔ "بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ جس حساب سے ہم دھڑا دھڑ سڑکیں پار کر رہے ہیں۔ اس حساب سے لگتا ہے اس سے بھی زیادہ جرمانے ہوں گے۔"

منصف نے اپنے ایک کمرے کے فلیٹ کا دروازہ کھولا تو سامنے ہی کمپیوٹر نظر آیا۔ میز پر کمپیوٹر کے علاوہ جہاز رانی سے متعلق کتابیں، قرآن مجید اور اس کا فرانسیسی ترجمہ، تفسیر اور کچھ اور عربی میں لکھی مذہبی کتابیں بھی تھیں۔ کونے میں ایک صوفہ سیٹ اور زمین پر ایک سادہ بستر بچھا ہوا تھا۔ ٹیبل کے قریب جانماز بچھی ہوئی تھی۔ دیوار پر امام خمینی کی تصویر تھی۔ "معلوم نہیں ے ہ سنی ہے یا اہل تشیع لیکن ے ہ یقین سے کہا جاتا ہے کہ امام خمینی ان کی پسندیدہ شخصیت ہیں۔" میں نے کیپٹن سلیم سے آہستہ سے کہا۔

"اور اگر قسمت نے اس کا ساتھ دیا اور صحیح مواقع ملے تو ے ہ بھی امام خمینی کی طرح سیاسی یا سماجی انقلاب ضرور لائے گا، اور نہیں تو ٹیکنیکل انقلاب تو لائے گا ہی.... پورے ملک میں نہیں تو کم از کم اپنے دفتر میں ہی سہی۔" سلیم نے کہا۔

منصف نے فلیٹ میں داخل ہوتے ہی جلدی جلدی فریج کھول کر ایک ایک سیب اور ایک ایک کیلا ہمارے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"مے رے پاس وقت نہیں ہے کہ آپ لوگوں کے لئے چائے بناؤں۔ بینک بند ہونے میں تقریباً پندرہ بیس منٹ رہ گئے ہیں۔ بس آپ لوگ کمپیوٹر دے کھیں تو چلتے ہیں۔"

"یار دے کھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس صرف ہارڈ ڈسک میموری، ریم وغیرہ معلوم کرنا تھا۔"

میرا ے ہ کہنا تھا کہ منصف جو تھوڑی دیر پہلے جلدی جلدی کر رہا تھا۔ ایک دم اسٹاپ پر آ گیا۔

"مے رے محترم بھائی! میرا فرض بنتا ہے کہ بے چنے سے پہلے آپ کو وہ چیز اچھی طرح دکھاؤں اور خریدنے والے کو بھی چاہے ے کہ آنکھیں کھول کر اچھی طرح دے کھ کر خرے دے۔"

"برے پھنسے۔" سلیم نے آہستہ سے کہا۔

کمپیوٹر آن کر کے دے کھا ہر چیز ٹھیک ٹھاک تھی۔

"منصف قیمت ے ہی رہے گی یا کچھ کم کرو گے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک تو قیمت کم نہیں کروں گا دوسری بات ے ہ کہ تھ یسز مکمل کر کے ایک مہینے بعد دوں گا۔" منصف نے جواب دیا۔

"چلیں ٹھیک ہے سودا پکا سمجھیں۔" ہم نے مل کر کہا۔

"ے ہ کمپیوٹر بہت اچھی حالت میں ہے۔" منصف نے گھر کی لائٹس اور دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔"میں نے مشکل سے ایک ڈیڑھ مہینہ استعمال کیا ہے اور میں نے اسے صرف چند صفحے ٹائپ کرنے کے لئے لیا ہے۔ اے سے کمپیوٹر تیونس میں واقع مے رے دفتر کے ہر کمرے میں پڑے ہیں اور انہیں کوئی پوچھنے والا ہی نہیں ہے۔ ے ہاں پر ایک دو دوست ساتھیوں سے اُدھار مانگا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ توبہ نعوذ باللہ کیا زمانہ آگیا ہے۔ کوئی کسی کی مدد کرنے کو تیار نہیں ہے۔ میں ے ہاں آنے سے قبل اپنے نئے ماڈل کی کار دوستوں کو دے آیا کہ میری غیر موجودگی میں استعمال کریں، خواہ مخواہ دو سال ایسے ہی کھڑی رہے گی۔ لیکن ے ہاں پر معمولی سے کمپیوٹر کے لئے بھی کسی سے کوئی امید نہیں رکھ سکتے ہر ایک دوسرے کو مصیبت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ ہم تیسری دنیا کے لوگ کبھی نہیں سدھریں گے کیونکہ ہم مدد کرنے کی بجائے ایک دوسرے کی زندگی اجیرن کرنا چاہتے ہیں، ہم تعاون کی بجائے مقابلہ بازی چاہتے ہیں۔"

گھر کو بند کر کے ہم بس اسٹاپ کی طرف لوٹے۔ ایک دفعہ پھر لال پے لے سگنلوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے منصف کے پے چھے سڑکیں پار کیں اب مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے منصف سے کہا۔

"مجھے لگتا ہے سارے شہر کی پولیس تمہاری واقف ہے کیونکہ تم بے دھڑک سڑکیں پھلانگتے رہتے ہو۔"

منصف نے پہلی مرتبہ قہقہہ لگا کر کہا۔"نہیں یار جلدی میں ہوں اس لئے آج ایسا کر رہا ہوں۔ خیر ابھی تک تو بچ گئے ہیں اب آئندہ ہری بتی پر سڑک پار کریں گے۔" ایک دفعہ پھر زور سے ہنس کر کہا"ایک لطیفہ سناتا ہوں جو ہمارے ملک تیونس میں لیبیا کے لوگوں کے لئے مشہور ہے۔ ایک دفعہ لیبیا کا ایک باشندہ اپنے شہر طرابلس سے تیونس گھومنے آیا۔ ے ہ اس وقت کی بات ہے جب ہمارے ملک میں ٹریفک سگنلوں کا رواج جنم لے رہا تھا جبکہ لیبیا میں ابھی تک پولیس اہلکار ٹریفک کنٹرول کرتا تھا۔ ٹریفک کی رنگین بتیاں دے کھ کر اس نے پوچھا: ے ہ تین رنگ کی بتیاں ٹریفک

کو کے سے کنٹرول کرتی ہیں؟ جواب میں تیونس کے مقامی دوست نے اسے بیوقوف بناتے ہوئے کہا: ہرے رنگ کی بتی ہم تیونس والوں کے لئے ہے جس کے جلنے پر ہم لوگ گاڑی چلاسکتے ہیں۔ پے لے رنگ کی بتی الجیریا والوں کے لئے ہے اور لال بتی آپ لیبیا والوں کے لئے ہے۔"

"دوسری مرتبہ وہ اپنی کار میں تیونس گھومنے کے لئے آیا تو ڈرائیونگ کے دوران ایک چوراہے پر سگنل جے سے ہی لال ہوا دوسروں نے گاڑیاں روک دیں لیکن اس نے گاڑی آگے بڑھادی۔ پے چھے سے پولیس والے نے سیٹی بجا کر اس کو اشارہ کیا کہ رک جاؤ۔ لیکن ےہ کار روکنے کی بجائے کھڑکی کا شیشہ نے چے کر کے اپنا پاسپورٹ لہرا کر پولیس والے کو زور زور سے کہنے لگا میرا تعلق لیبیا سے ہے۔"

منصف نے لطیفہ سنا کر ختم کیا تو ہماری بس آگئی۔ بس میں بیٹھتے ہی کیپٹن سلیم نے کہا۔ "آج واقعی ایک دلچسپ شخصیت سے ملاقات ہوئی ہے اس پر دو تین سطریں ضرور لکھئے گا۔"

سوئیڈن میں پاکستانی

سوئیڈن کی اس جنوبی بندر گاہ مالمو میں کئی پاکستانی آباد ہیں حالانکہ ان کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہے جتنی پڑوسی ملک ڈنمارک کے شہر کوپن ہیگن میں یا انگلینڈ اور یورپ کے شہروں لندن، بریڈ فورڈ، مانچسٹر، ہیمبرگ، فرینکفرٹ، اوسلو وغیرہ میں ہے ماضی قریب میں کسی اکا دکا پاکستانی کو سوئیڈن میں رہنے کی اجازت ملی ہو گی کیونکہ سوئیڈن حکومت نے غیر ملکیوں کو ے ہاں سوئیڈن میں رہنے کے لئے قوانین سخت کر دے ئے ہیں۔

آج سے تیس سال قبل 1973 میں جب میرا پہلی دفعہ بحری جہاز پر ان ممالک میں آنا ہوا تو مجھے ے ہاں صرف مقامی لوگ ہی نظر آئے۔ بعض بڑے شہروں میں اگر کوئی ایشیائی ملتے تو صرف پاکستانی اور بھارتی وہ بھی گنے چنے۔ افریقی تو شاید ہی کوئی نظر آتا تھا اور عرب ایرانیوں کے ے ہاں ہونے کا تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن آج کل سوئیڈن، ناروے، ڈنمارک میں تقریباً ہر ملک کے باشندے نظر آئیں گے جنہوں نے اپنے مذہب اور اپنی حکومت (سیاسی نظام) کے بے جا ظلم کا بہانہ بنا کر ے ہاں سیاسی پناہ حاصل کر لی ہے۔ ان میں زیادہ تعداد ایرانیوں، عراقیوں، سری لنکا کے تامل باشندوں، پاکستان کے باشندوں کی ہے۔ شروع میں ے ہاں کا قانون ایسا تھا کہ کوئی بھی اپنی دکھ درد بھری جھوٹی سچی داستان سنا کر ے ہاں کی رہائش اختیار کر سکتا تھا لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔ اب یورپ کے ان ممالک میں سیاسی پناہ ملنا تقریباً ناممکن ہو چکا ہے۔

شروع شروع میں جو ے ہاں پاکستانی رہائش پذیر تھے، ان میں اکثریت ان کی تھی جنہوں نے ے ہاں شادی کے بہانے پاسپورٹ حاصل کیا۔ ان میں سے کچھ آج بھی ان عورتوں کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں جبکہ بعض نے پاسپورٹ اور رہائش حاصل کرنے کے بعد مقامی عورتوں سے علیحدگی اختیار کر لی اور پاکستان سے شادی کر آئے۔

ہمارے گھر کے قریب بھی کچھ پاکستانی رہتے ہیں جن میں ایک سندھ کا وزیر علی سومرو ہے جو اپنی سوئیڈش بیوی لینا اور دو بیٹوں یوسف اور یونس کے ساتھ رہتا ہے اور اس کی عمارت کے سامنے والے فلیٹ مین ان کے بچپن کا دوست کوئٹہ کا عبدالواحد بلوچ رہتا ہے جس کی بیوی اینگر بھی سوئیڈش ہے۔ اس کے بھی دو بیٹے ہیں جن کے نام مصطفی اور سلیم ہیں۔ ان کی اور ہماری عمارت کے درمیان والی عمارت کی پہلی منزل پر ان کا تیسرا کوئٹہ کا دوست ارباب داؤد اپنی سوئیڈش بیوی EVA کے ساتھ رہتا ہے جس کا اسلامی نام حوا ہے۔ وزیر اور اس کے ے ہ دونوں دوست آج سے

تقریباً تیس سال قبل ے ہاں آئے تھے۔ وزیر کا بچپن بھی کوئٹہ میں گزرا تھا اور مذکورہ تین دوست اسکول میں بھی ساتھ پڑھتے تھے۔

داؤد کو پشتو اور بلوچی کے علاوہ اردو اور سندھی بھی صاف صاف آتی ہے۔ داؤد اور مے رے دفتر اور آرام کے اوقات ایک جے سے ہونے کی وجہ سے ہماری اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ داؤد جب بھی فارغ ہوتا ہے تو مجھے بلالیتا یا فون پر حال احوال سناتا ہے۔

'سائیں کیا کر رہے ہو؟ جاگنگ چھوڑو، ادھر مے رے پاس آؤ تو گپ شپ کریں اور قہوہ پئیں" وہ مجھے نے چے ٹہلتا دے کھ کر اپنی کھڑکی سے آواز دیتا۔

ارباب داؤد نے حالانکہ کسی یونیورسٹی سے علم سیاسیات میں تعلیم حاصل نہیں کی لیکن اس کا تعلق کوئٹہ کے سیاسی خاندان سے ہے اور اس کے علاوہ پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا رہا ہے۔ مجھے اس کی صاف گوئی اور حقیقت پسندی کی عادت نے بہت متاثر کیا۔

"سائیں! ان ملکوں میں رہنا کوئی آسان کام نہیں ہے خصوصاً اپنی جوان اولاد کے ساتھ۔ ے ہاں کے مغربی اور نیم عریاں ماحول میں زندگی گزارنا بڑا مشکل کام ہے خصوصاً ان لوگوں کے لئے جن کی بیٹیاں ہیں۔ پاکستان کے دور دراز دیہات سے آئے ہوئے لوگ جو مشرقی ماحول میں پرورش پاکر آئے ہیں ان سے ان کی نوجوان اولاد کے خیالات اور قدریں مختلف ہیں۔ ان کے بچے مغرب کے ماحول میں پلے بڑھے ہیں اور وہ بھی سوئیڈن، ڈنمارک، ناروے، فن لینڈ جے سے ماحول میں جن کے سامنے انگلینڈ، فرانس، اٹلی، اسپین جے سے یورپی ممالک بھی گنوار اور غیر ترقی یافتہ سمجھے جاتے ہیں۔ بہر حال ہمارے پاکستانی بھائیوں کی بیٹیاں جب بڑی ہوتی ہیں تو ان کے والدین قطعی ے ہ نہیں چاہتے کہ ان کی شادیاں یورپ میں ہوں۔ وہ ان کی شادیاں اپنے بھانجے بھتیجے یا دیہات کے کسی عزیز سے ہی کرواتے ہیں۔ وہ ے ہی سوچتے ہیں کہ ان کی بیٹیاں پاکستانی کے گھر میں پیدا ہوئی ہیں، پاکستانی کھانے کھائے ہیں، ان کے پاکستانی نام ہیں اس لئے ان کی سوچ بھی والدین کی طرح پاکستانی ہوگی۔ لیکن ان بیوقوفوں کو کون سمجھائے کہ سوئیڈن میں پلی بڑھی لڑکی شکل سے ضرور پاکستانی لگتی ہے لیکن یورپ میں رہ کر اس کا دماغ تو یقیناً یورپی ہو جاتا ہے۔ وہ بچپن سے لے کر جوان ہونے تک اسکول کالج، پڑوس اور گھر میں ٹی وی پر دن رات بوائے فرینڈ، گرل فرینڈ، نیم عریاں کپڑوں میں ڈانسنگ، تنہا اور رومانوی مقامات پر پکنک اور ڈیٹنگ، جنسی آزادی اور کھلے عام بوس و کنار جیسی چیزیں دے کھنے اور سننے (اور پسند کرنے) کے بعد میر پور، رحیم یار خان، ساہیوال کے گاؤں / دیہہ چک فلاں کے پگڑ باندھنے والے اپنے دیہاتی کزن سے شادی کر کے لال رنگ کی موٹی چادر اوڑھ کر ڈھیلی چارپائی پر کے سے بیٹھ سکتی ہے، جس کے سامنے سوئیڈن کے خوبصورت نظاروں کی بجائے کیچڑ سے لتھڑی بھینسیں اور بیمار کتے ہیں گوبر کی بدبو اور مچھر ہیں۔

نیتجتاً وہ موقع پا کر اس ماحول سے بھاگ نکلتی ہے۔ سوئیڈن جو اب اس کا ملک ہے جس کا وہ پاسپورٹ رکھتی ہے، وہاں کے ائیر پورٹ پر پہنچ کر پہلا کام وہ یہ کرتی ہے کہ پولیس کو فون کر کے اطلاع کرتی ہے کہ اس کے والدین نے اس کی مرضی کے خلاف آدھے تھان کی شلوار میں ملبوس جس پگڑ خان سے اس کی شادی کرائی ہے اس کے ساتھ وہ کسی صورت میں نہیں رہ سکتی اور اب سوئیڈن میں موجود اس کے دقیانوسی خیال کے باپ سے اسے تحفظ فراہم کیا جائے۔

"ایسی صورت میں سوئیڈن کے قانون کے مطابق حکومت کی طرف سے لڑکی کو کسی محفوظ جگہ پر رہائش کے لئے فلیٹ مہیا کیا جاتا ہے جس کا پتہ راز میں رکھا جاتا ہے تاکہ لڑکی کے والدین کو اس کا علم نہ رہے۔ اس وقت ایسی دو ہزار کے قریب لڑکیاں سوئیڈن میں موجود ہیں جنہوں نے والدین کے اس "ظلم" کے خلاف حکومت سے پناہ لے رکھی ہے۔"

ارباب داؤد ہر سال سخت سردی کے دو تین مہینے اپنے شہر کوئٹہ میں گزارتا ہے باقی وقت وہ ہاں سوئیڈن میں۔ گزشتہ سال اس نے کوئٹہ میں اپنا گھر بنوایا ہے جس کا نام ارباب ہاؤس رکھا ہے۔ یہ گھر کوئٹہ کی معروف شاہراہ کرم خان روڈ پر واقع ہے۔ یہ سڑک ان کے دادا ارباب کرم خان کے نام پر ہے۔

پختون قبیلے کاسی کی دو شاخیں ہیں۔ ایک ملک اور دوسری ارباب جس سے داؤد کا تعلق ہے۔ ارباب داؤد کا دادا خان بہادر ارباب کرم خان اور ان کے بھائی ارباب خداداد بلوچستان کی اہم شخصیات تھیں ارباب داؤد کے والد ارباب عبدالقادر نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ انگریزوں اور حکومت کے ظلم کے خلاف جیلوں میں گزارا۔ آپ 1912ء میں پیدا ہوئے اور اب تک 25 سال جیل کاٹ چکے ہیں ان کے دوستوں میں ولی خان شامل ہے۔

ارباب داؤد نے بتایا کہ یہ ہاں سوئیڈن میں بچوں کو مذہب اور مشرقی اخلاقیات سے کھنے کے لئے وقت ہے نہ ماں باپ کو اس کی کوئی پرواہ۔ زیادہ سے زیادہ بچے اسلام علیکم کہتے ہیں یا کلمہ پڑھتے ہیں تو ان کے والدین خوش ہوتے ہیں کہ بچے کو کلمہ پڑھنا آتا ہے وہ اس ماحول میں پکا مسلمان سمجھا جاتا ہے۔

داؤد نے اپنے پالتو طوطے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو کلمہ تو مے رے طوطے کو بھی یاد ہے اور جے سے ہی کوئی گھر میں داخل ہوتا ہے تو یہ السلام علیکم کی گردان شروع کر دیتا ہے۔ اور جب تک ڈانٹو نہیں السلام علیکم کی ہی رٹ لگا رکھتا ہے۔"

سوئیڈن دنیا کی صحیح معنوں میں سوشل ویلفیئر ریاست ہے جس کی حکومت ملک میں رہنے والے ہر شخص کا خیال رکھتی ہے۔ نوکری روزگار سے لے کر صحت اور علاج تک، خاص طور پر بچوں اور بوڑھوں کو بہت توجہ دی جاتی ہے۔ بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتے ہی ماں کو حکومت کی طرف سے بچے کا الاؤنس ملنا شروع ہو جاتا ہے۔ پیدا ہونے کے بعد یہ مزید بڑھ جاتا ہے اور گھر کے کرائے میں بھی آدھا حکومت دیتی ہے۔ یہ الاؤنس اس کے علاوہ ہے جو ماں باپ کو

بے روزگاری کی حالت میں ملتا ہے۔ بچے کی وجہ سے ماں باپ کو پے سے کے معاملے میں اتنی مدد ملتی ہے کہ ے ہاں رہائش اختیار کرنے والے اے شیائی لوگوں نے زیادہ سے زیادہ پیسہ حاصل کرنے کے لئے بچے پیدا کرنے پر زور دے رکھا ہے۔ بہر حال اس کیش الاؤنس کے علاوہ بچوں کے لئے حکومت کی طرف سے علاج معالجہ اور اسکول کی مفت سہولیات حاصل ہیں۔ بس یا ٹرین میں سفر کرنے کا ٹکٹ اور اسکول میں کھانا مفت ملتا ہے۔ بچے کے ساتھ موجود اس کی ماں یا باپ بھی مفت سفر کر سکتے ہیں۔ اس طرح ریٹائر یا بوڑھے ہونے پر مزید الاؤنس ملتے ہیں۔ کفن دفن کا بندوبست بھی حکومت کرتی ہے۔ اس لئے اس ملک کے لئے ے ہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ ے ہاں کی حکومت اپنے لوگوں کا (جن میں ایشیا اور افریقہ کے لوگ بھی آجاتے ہیں جن کے پاس ے ہاں کا پاسپورٹ ہے) صحیح معنوں میں پیدا ہونے سے مرنے تک (From Womb to Tomb) خیال رکھتی ہے۔

لیکن حکومت جہاں بچوں کا اتنا خیال رکھتی ہے اور ان کی خاطر والدین کو خوب پیسہ دیتی ہے وہاں ان پر ے ہ فرض بھی عائد کرتی ہے کہ بچوں کی ہر جائز ضروریات پوری کی جائے اور ان کو دکھ نہ پہنچایا جائے۔ ایسا تو نہیں ہے کہ بچے کا الاؤنس ماں باپ ہڑپ کر لیں اور بچے کو بھوکا پیاسا رکھیں اور اس کی رہائش اور کپڑوں کا خیال نہ کریں۔ اس معاملہ میں ے ہاں کی حکومت اتنی سخت ہے کہ کوئی بچہ اگر پولیس کو فون کر لے، اسکول میں اپنی استانی سے ذکر کر لے یا کوئی پڑوسی سوشل ڈپارٹمنٹ کو اطلاع کر لے کہ بچے کے ساتھ اس کے ماں باپ صحیح سلوک نہیں کر رہے ہیں تو اسی وقت ہی پولیس پہنچ جاتی ہے کیونکہ ایک طرح دے کھا جائے تو بچے پیدا تو ماں باپ کرتے ہیں لیکن وہ ریاست کی ملکیت ہیں جو ان پر خرچہ کرتی ہے اور غریب سے غریب بچے کو بھی ہر وہ بنیادی چیز مل جاتی ہے جو امیر کے بچے کو حاصل ہے۔ سردی میں کوئی بچہ اگر بغیر گرم کپڑوں کے اسکول میں یا شام کو گھر کے باہر کھیلتا نظر آئے تو پولیس اس کے ماں باپ پر سختی کرتی ہے کیونکہ حکومت بچے کی ہر ضرورت کے لئے والدین کو خرچہ دیتی ہے۔ بلکہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی دیتی ہے۔

"دوسرے یورپی ممالک کی طرح ے ہاں سوئیڈن میں بھی لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ اسکول میں پڑھتے ہیں، کھے لتے ہیں اور گھومنے پھرنے تک ملتے ہیں۔ ارباب داؤ دنے بتایا کہ سوئیڈن کی تعلیمی پالیسی کے مطابق سوئمنگ، پکنک اور جمناسٹک جیسی چیزیں بھی لڑکے اور لڑکیوں کو مل جل کر کرنی پڑتی ہیں۔ پھر جب ہمارے ممالک کے لوگ اس چیز کو برا سمجھ کر کہ لڑکیوں کو مختصر لباس پہن کر تیراکی یا جمناسٹک کرنے سے منع کرتے ہیں تو کئی لڑکیاں ماں باپ کے خلاف ہو جاتی ہیں۔ وہ ے ہی کہتی ہیں کہ جب ترکی، لبنان، مراکش ممالک کی لڑکیاں جو ان کی ہی طرح مسلمان ہیں دوسرے لڑکوں کے ساتھ مل کر نہا سکتیں ہیں تو ان کو منع کیوں کیا جاتا ہے۔ اور ان کے ماں باپ ان کو اسکول جانے سے روک کر جب زبردستی گھر مین بٹھاتے ہیں تو اسکول کی طرف سے والدین کے لئے تنبیہہ کا لیٹر آجاتا ہے کہ وہ

لوگ قوم کے مستقبل کے لئے مسائل کیوں پیدا کرتے ہیں اور اس کے ساتھ حکومت کی طرف سے نفسیاتی معالج مقرر کیا جاتا ہے کہ ان کے دماغ کا جائزہ لیا جائے کہ کہیں ےہ پاگل تو نہیں ہوگئے کہ اپنے بچوں کو تیراکی اور جمناسٹک جے سے صحت مند کھے لوں سے منع کرتے ہیں اور اگر والدین ملک کی پالیسی پر نکتہ چینی کرتے ہیں یا ےہ کہتے ہیں کہ ہمارے مذہب نے ان چیزوں سے منع کیا ہے تو ان کو ےہی جواب ملتا ہے کہ اس صورت میں اپنے ملک واپس چلے جاؤ، ہم نے تو آپ کو نہیں بلایا تھا۔ آپ خود ہی آئے تھے اور رونا رونے لگے تھے کہ ہمارے ملک میں صحیح حکومت نہیں ہے، مولوی لوگوں نے تنگ کیا ہوا ہے، وغےرہ وغےرہ۔ اور اب ہر چیز میں نقص نکال رہے ہو۔

"اور پھر مشرقی والدین کشمکش میں پڑ جاتے ہیں۔ ےہاں تک کہ ان کی اولاد بھی ان کا ساتھ نہیں دیتی۔ ےہی باتیں ہیں جن کی وجہ سے ےہاں کی مقامی نوجوان نسل ہم ایشیائی افراد سے خائف ہے۔ وہ ےہی کہتے ہیں کہ ہم ایشیائی اے سے بھوکے اور پے سے کے لالچی ہیں کہ محض مذہب اور سیاست کا بہانہ بنا کر ان کے ممالک میں دولت کی خاطر رہتے ہیں۔"

"وے سے ظاہری طور پر تو ےہاں کے لوگ بہت فراخ دل اور انسان دوست نظر آتے ہیں۔" میں نے داؤد سے کہا۔

"پہلے بہت تھے۔" داؤد نے بتایا۔ "لیکن اب وہ اتنے نہیں رہے ہیں خاص طور پر ان کی نوجوان نسل۔ وہ کہتی ہے کہ ہم ایشیائی لوگ کسی ظلم و ستم سے تنگ آکر نہیں بلکہ دولت کمانے اور عیاشی کرنے ےہاں آئے ہیں۔ اور اس کے بدلے میں ان کے ملک کا ماحول خراب کرتے ہیں۔ اسمگلنگ، چوری، زیادتی جیسی کئی وارداتوں میں کئی ایشیائی (پاکستانی، افغانی، عراقی اور ایرانی) مسلمان پکڑے گئے ہیں۔ کچھ مہے نے پہلے کچھ قادیانیوں نے ےہ کہہ کر ےہاں سیاسی پناہ مانگی کہ ان کے ساتھ مذہب کی بناء پر پاکستان میں ظلم ہوا ہے اور وہ لوگ جان بچا کر ےہاں پہنچے ہیں۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ ےہ سب جھوٹ تھا، خاص طور پر ان لوگوں کی کہانی جھوٹی تھی وہ تو کئی برس سے پڑوسی ممالک پولینڈ اور جرمنی میں غیر قانونی طور پر ملازمت کر رہے تھے اور موقع پا کر سوئیڈن پہنچ گئے کیونکہ ےہاں کوئی نوکری نہ کرے تو بھی سرکار اسے گھر بیٹھے بیروزگاری کا خاص بھتہ پہنچاتی ہے۔ لیکن اب دن بدن سختی بڑھتی جا رہی ہے۔ ناروے جے سے ممالک نے سیاسی پناہ دینی بند کر دی ہے۔ جو اس بنیاد پر ان کے ملک میں آتے ہیں انہیں ملائیشیا کی طرح الگ کیمپوں میں رکھ دے تے ہیں۔ وہاں پڑے بور ہوتے رہتے ہیں پھر دو تین مہینے عدالت میں مقدمہ چلا کر اپنے اپنے ملک واپس بھیج دے تے ہیں۔ کرائے کے پے سے بھی اس کے سفارتخانے سے وصول کر لے تے ہیں۔

چند روز قبل سری لنکا سے تامل لوگ ناروے پہنچے جن میں زیادہ تر بوڑھی عورتیں اور بچے تھے اور جن کے ساتھ واقعی ظلم ہوا تھا اور ان کو رکھنے کے لئے ناروے پر عالمی دباؤ بھی پڑا تھا جس پر انہوں نے مجبور ہو کر ان کو سیاسی پناہ دی

لے کن شہروں میں رکھنے کی بجائے ایک ویران جزے رے پر بسایا گیا جہاں سنا ہے کہ وہ اتنے بیزار ہیں کہ ے ہاں رہنے کی بجائے واپس اپنے ملک جانے کو ترجیح دے رہے ہیں۔"

داؤ دنے بتایا کہ ے ہاں کی نوجوان نسل پُر تشدد بھی ہوتی جارہی ہے۔ کٹر قوم پرست موقع ملنے پر ایشیا کے لوگوں کو گالی گلوچ یا مالی نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ے ہاں کے ممالک میں قانون سخت ہے اور اس پر عمل بھی ہوتا ہے اس لئے ذرا ڈرتے ہیں اور ہم لوگ ے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں ورنہ ے ہاں کے مقامی لوگوں کو ہم باہر والوں پر بہت غصہ ہے۔ حکومت کا تحفظ نہ ملے یا غنڈہ گردی بڑھ جائے تو ہم ایشیائی اور افریقی لوگوں کو ے ہاں سے بستر گول کرنا پڑ جائے۔ ہمیں تو کیا پولینڈ، ہنگری، اٹلی، پرتگال، البانیہ جے سے یورپی ممالک کے لوگوں کو بھی سوئیڈن چھوڑنا پڑ جائے۔ ے ہاں کے یعنی سوئیڈن کے لوگوں کے لئے اگر دنیا میں اچھے، بہتر اور حسین لوگ ہیں تو وہ ان کے اپنے پڑوسی ممالک ڈنمارک، ناروے اور فن لینڈ کے ہیں جو Scandinavian ممالک کہلاتے ہیں۔

شمالی یورپی ممالک اور ان کی زبانیں

شمالی یورپ کے ممالک ناروے، ڈنمارک، سوئیڈن اور فن لینڈ سارے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور قطبی Scandinavian یا Nordic (شمالی) ممالک کہلاتے ہیں جے سے دبئی، دوحہ، عمان، شارجہ وغیرہ (خلیجی ریاستیں) متحدہ عرب امارات کہلاتی ہیں۔ یا پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش وغے رہ برصغیر کے ممالک کہلاتے ہیں۔ ان

شمالی ملکوں کے باشندے اسکینڈی نیوین کہلاتے ہیں۔ وے سے تو فن لینڈ کا رہنے والا فن (Finn) پکارا جاتا ہے، ڈنمارک کا ڈینش، ناروے کا نارویجن اور سوئیڈن کا سوئیڈ (اور کبھی کبھی سوئیڈش) کہلاتا ہے۔

ان ممالک کے باشندوں کی چال ڈھال اور ثقافت کا اپنا ہی ایک ڈھنگ ہے اور یورپ کے دوسرے ملکوں سے بالکل مختلف ہے ں۔ ان ممالک کے لوگ دودھ کی طرح سفید، طویل القامت اور نیلی یا ہری آنکھوں والے ہیں اور ان کے بالوں کا رنگ سرمئی ہے۔ سوائے فن لینڈ کے باقی تین ممالک ناروے، سوئیڈن اور ڈنمارک کی زبانیں بھی بہت ملتی جلتی ہیں۔ پنجابی، سرائیکی اور سندھی میں بھی بڑا فرق ہے لیکن ان زبانوں میں اتنا بھی نہیں ہے۔ کچھ کچھ الفاظ کی ادائگی اور ان کے لہجے مختلف ضرور ہیں۔ بہر حال تینوں ملکوں کے لوگ ایک دوسرے کی زبان اچھی طرح سمجھ لے تے ہیں۔ ے ہ دوسری بات ہے کہ بول نہیں سکتے۔ کسی محفل میں ڈینش، سوئیڈ اور نارویجن ہوں گے تو کسی اور کی مادری زبان میں بات کرنے کی بجائے ہر ایک اپنی زبان میں بولتا رہے گا جو ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ سننے والا لہجے سے اندازہ لگا سکتا ہے کہ کس کا کس ملک سے تعلق ہے۔ جے سے ہمارے ہاں ایک ٹھٹھہ کا سندھی شکار پور یا تھری باشندے سے مختلف لب ولہجہ میں بات کرے گا۔ کسی نے کہا کہ ڈنمارک ایک ہموار سطح والا یعنی نشیب و فراز کے بغیر ملک ہے تو وہاں کے لوگوں کے بولنے کا لہجہ اور انداز بھی ہموار اور نازک ہے کسی بھی اتار چڑھاؤ کے بغیر۔ ناروے پہاڑی علاقہ ہے تو وہاں کے لوگوں کا لہجہ بہت کھردرا اور شوخ ہے۔ سوئیڈن کا کچھ حصہ ہموار ہے تو کچھ پہاڑی تو وہاں کے لوگوں کا بولنے کا اسٹائل درمیانہ سا ہے۔ ان کے بولنے میں مٹھاس بھی ہے اور شوخی بھی۔ بہر حال فن لینڈ کے لوگوں کی جسامت یا شکلیں سوئیڈن، ڈنمارک اور ناروے کے لوگوں سے ضرور ملتی ہیں لیکن ان کی زبان بالکل مختلف ہے اور بہت نرم اور شیریں لگتی ہے۔ جے سے چینی اور جاپانی زبانوں میں جاپانی زیادہ شیریں لگتی ہے۔ فن لینڈ کی زبان بحیرہ بالٹک کے اس پار کے پڑوسی ملک ایسٹونیا سے کافی ملتی ہے۔ ایسٹونیا کسی زمانے میں متحدہ روس کی ریاست تھی اور اب ایک الگ ملک ہے اور لیتھونیا اور لیٹویا کی طرح با لکن ریاست کہلاتی ہے۔

اسکینڈی نیویا کے ممالک کی کرنسی کرونا ہے جبکہ فن لینڈ کی کرنسی مارکا ہے۔

جے سے ملائیشیا اور انڈونیشیا میں صرف ایک موسم بارش کا ہوتا ہے اس طرح ان شمالی ملکوں میں سارا سال سردی رہتی ہے۔ فن لینڈ کا دارالحکومت ہیلسنکی ناروے کا اوسلو، اور سوئیڈن کا اسٹاک ہوم پھر بھی اتنے شمال میں نہیں ہے جتنے اور شہر ہیں جن میں نہ صرف سخت سردی رہتی ہے بلکہ سردیوں کے مہینوں میں تو اکثر اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ نومبر دسمبر کے مہینوں میں تو تقریباً چوبیس گھنٹے اندھیرا رہتا ہے۔ ہر کام گھڑی کی سوئیوں پر ہوتا ہے۔ اسی طرح جون اور جولائی کے مہینوں میں مستقل سورج کی روشنی رہتی ہے اور ان مہینوں (جن میں آدھی رات کو بھی سورج نظر آتا

ہے) کی راتوں کو "بغیر اندھے رے کی راتیں" Nights Nightless کہتے ہیں اور ان ملکوں کو Midnight Sun والے ملک کہتے ہیں۔

کتا پالنا آسان کام نہیں ہے

ایک سوئیڈش نے مجھ سے کہا۔

"آپ مسلمان لوگ کتا کیوں نہیں پالتے؟"

"ہمارے مذہب میں اس کی اجازت نہیں ہے۔" میں نے اسے جواب دیا "کیونکہ اسے نجس جانور سمجھا جاتا ہے۔ خصوصاً اس کی زبان سے جو لعاب ٹپکتا ہے وہ ناپاک ہے۔"

میں نے اسے وہی جواب دیا جو ملائیشیا کے ملئی لوگ اکثر دیتے ہیں جب ان سے کوئی غیر ملکی پوچھتا ہے کہ آپ کے ملک (ملائیشیا) میں چینی لوگ تو کتا پالتے ہیں لیکن تم لوگ (ملئی) کیوں نہیں۔ آپ کسی بھی ملئی گاؤں میں چلے جائیں آپ کو وہاں بلیلاں تو نظر آئیں گی لیکن کتا کہیں بھی نظر نہیں آئے گا۔

بہر حال سوئیڈش نے وہ جواب سن کر کہا:

"یار سچ کہتے ہو۔ سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے اس کے باوجود کتے کو پالنا آسان نہیں۔ اس کو صاف ستھرا رکھنا اور اس کے جراثیم سے بچنے کے لئے بڑی محنت اور خدمت کرنی پڑتی ہے۔ ہر وقت نہلانے دھونے کے علاوہ وقت کی پابندی سے اسے کئی دوائیاں کھلانی پڑتی ہیں۔ سال بھر کئی ٹے کے لگانے پڑتے ہیں پھر بھی اس کے صاف ستھرے ہونے سے دل مطمئن نہیں ہوتا۔ کسی وقت بھی اس کو کوئی بیماری لگ سکتی ہے یا اس کی لگی ہوئی بیماری انسانوں میں پھیل سکتی ہے۔"

اتنی مشکلوں کے باوجود ہے ہاں کے لوگوں کو کتا پالنے کی ہمت ہے۔ وہ اپنے پالتو کتوں کو ان کی نسل کے مطابق مقررہ وقت پر خوراک دے تے ہیں۔ سیر کراتے ہیں اور سردی ہو یا بر فباری، روزانہ مقرر کئے ہوئے وقت پر اپنے کتے کو رفع حاجت کے لئے باہر پارک میں یا ویران جگہ پر لے جاتے ہیں۔ مجال ہے کوئی کتا گھر میں گندگی کرے۔ اور مجال ہے کسی کتے کا مالک معمول کے اس کام میں کسی قسم کا ناغہ کرے۔

ایک دن میں اپنے سوئیڈش پڑوسی کے پاس بیٹھا تھا تو شہر کے دوسرے کونے میں رہنے والا اس کا بھائی اسے ملنے آیا۔ جس کے ساتھ اس کا کتا بھی تھا۔ وہ اپنی آنکھوں کا آپریشن کرانے کے لئے اسپتال میں داخل ہونے والا تھا۔

"مے رے لائق کوئی خدمت؟" مے رے پڑوسی نے اپنے بھائی سے پوچھا۔

"مجھے کسی اور چیز کی فکر نہیں ہے۔" اس کے بھائی نے کہا۔ "بس اس کتے کو تمہارے حوالے کرنے آیا ہوں۔ اس کے کھانے پے نے، ٹہلانے اور ٹوائلٹ کے اوقات لکھ لو جو تمہارے کتے کے وقت سے کافی ملتے ہیں بس ے ہی تکلیف تمہیں دینی تھی۔"

اس کے جانے کے بعد مے رے پڑوسی نے بتایا کہ وہ جب دوسرے شہر یا ملک جاتا ہے تو اپنا کتا اپنے بھائی کے حوالے کر جاتا ہے۔ کیونکہ اپنے کتے کو اکیلا گھر میں یا گلی میں چھوڑ جانا جرم ہے۔ کھانے کا مسئلہ تو یوں بھی حل ہو سکتا ہے کہ میں غیر موجودگی والے دنوں کے لے ے کچھ زیادہ کھانا کتے کے پاس چھوڑ کر چلا جاؤں جو وہ روز کھاتا رہے لیکن صبح کے وقت اسے ٹوائلٹ کے لئے نہ نکالنے پر وہ بھونک بھونک کر پوری عمارت سر پر اٹھالے گا اور محلے والے جمع ہو کر مے رے خلاف تھانے میں شکایت درج کرا دیں گے۔

سوئیڈن میں کتا پالنے والے کے لئے حالانکہ اتنی سختی نہیں ہے جتنی سنگاپور میں ہے جہاں کتے کی وجہ سے سڑک یا پارک گندا ہونے پر ایک ہزار ڈالر (چالیس ہزار روپے) جرمانہ ہے۔ سوئیڈن میں اخلاقی طور پر ہر سوئیڈش پر صرف ے ہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ جب اپنے کتے کو سیر کرانے کے لئے نکلے تو اپنے ساتھ جیب میں پلاسٹک کی تھیلی ضرور لے چلے تاکہ اس کا کتا بغیر شیڈول کے ٹوائلٹ کرے تو وہ (یعنی مالک) تھیلی کو ہاتھ پر چڑھا کر اپنے کتے کے فضلے کو ایک دم اٹھالے اور کسی گلی کے نکڑ پر اس مقصد کے لئے رکھے ہوئے ڈبے میں ڈال دے۔

سوئیڈن میں مردوں سے زیادہ عورتیں کتا پالتی ہیں۔ بوڑھی عورتیں چھوٹے قد اور جسامت کے کتے پالتی ہیں جن سے وہ کھیلتی اور باتیں کرتی رہتی ہیں شاید احساس تنہائی مٹانے کے لئے۔ نوجوان عورتیں اور ٹین ایج لڑکیاں .... خاص طور وہ لڑکیاں جو کم آبادی والے علاقوں میں اکیلی رہتی ہیں بہت بڑے اور خوفناک شکل کے کتے پالتی ہیں۔ شاید اپنے بچاؤ کے لئے۔ لیکن ان کتے پالنے والی لڑکیوں اور بوڑھیوں میں ایک بات ضرور مشترکہ ہے کہ وہ اپنے کتے

کو سیر کراتے وقت اپنے ساتھ پلاسٹک کی تھیلیاں لے چلتی ہیں اور بوقت ضرور وہ اپنے کتے کا فضلہ اٹھا کر سڑک کو صاف رکھنے میں نہ تو اپنی بے عزتی محسوس کرتی ہیں نہ اسے عیب سمجھتی ہیں۔

جس طرح پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہیں۔ اس طرح سوئیڈن کے سارے لوگ بھی ایک جے سے نہیں ہیں۔ کبھی کبھی اے سے لوگ بھی نظر آجاتے ہیں جو اپنے کتے کی گندگی نہیں اٹھاتے۔ ان میں سے ہولما کے بس اسٹاپ کی قریبی عمارت میں رہنے والی ایک موٹی عورت ہے۔ اس کے پاس دو کتے ہیں جن کو وہ روزانہ شام کو ایک بس اسٹاپ کے عقبی پارک میں سیر کے لئے لاتی ہے۔ اس عورت کو ہم نے کبھی بھی صفائی کا کام کرتے نہیں دے کھا۔ کبھی کبھی تو اس کے کتے بس اسٹاپ کے اس حصے کو بھی خراب کر دے تے ہیں جہاں ہم (ہولما کے علاقے کے لوگ) بس کا انتظار کرتے ہیں۔

"ے ہ عورت ے ہاں کی رہنے والی نہیں ہے۔ یعنی سوئیڈش نہیں ہے۔" مے رے سوئیڈش پڑوسی نے مجھے ایک دن بتایا اور اس کے سر کے لال بالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ے ہ پولش ہے۔ تقریباً دس بارہ سال قبل پولینڈ چھوڑ کر ے ہاں آ بسی تھی۔ اب اس کے پاس سوئیڈن کی قومیت اور پاسپورٹ ضرور ہے لیکن افسوس کہ اس کی ذہنیت ابھی تک وہی ہے۔" اور پھر کچھ دیر سوچ کر کہنے لگا۔ "اسی لئے تو ہم باہر سے آئے ہوئے لوگوں سے خائف ہیں۔ وہ ہمارے ملک سوئیڈن میں رہ کر ہمارے ملک کے فائدے اور سہولتیں تو حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن ے ہاں کے نظم و ضبط اور اصولوں کی پابندی نہیں کرنا چاہتے۔ اور اس طرح ہمارے خوبصورت ملک سوئیڈن کی پرانی قدروں کو مٹا رہے ہیں۔ مختلف ممالک سے آئے ہوئے ے ہ لوگ سوئیڈن کے لوگوں کو دیکھ کر ہر چیز کی چاہ تو کرتے ہیں مگر ذمہ داری اور فرائض سے بھاگتے ہیں، ملک کے قاعدے قانون کا احترام نہیں کرتے، اپنے پڑوسیوں اور شہر کے رہنے والوں کا خیال نہیں رکھتے۔"

بس کا ٹکٹ اور طلاق

سوئیڈن میں میاں بیوی کی علیحدگی کی صورت میں بچوں پر ماں کا حق ہوتا ہے، مرد کو ہر مہینے بچوں کی ماں کو عدالت کی معرفت اپنی تنخواہ کا مقرر کردہ حصہ دینا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ طلاق شدہ عورت کو حکومت کی طرف سے مزید الاؤنس بھی ملتا ہے جو اس کے علاوہ ہے جو ہر بچے کے لئے اسے دیا جاتا ہے۔ عورت کی اگر کوئی نوکری نہیں ہے تو اسے بیروزگاری الاؤنس بھی ملتا ہے۔ بچہ ہونے پر وے سے ہی گھر کا کرایہ کم ہو جاتا ہے لیکن طلاق کے بعد ے ہ کرایہ مزید کم ہو کر تقریباً نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو ے ہاں کے قانون کے مطابق طلاق کی صورت

میں عورت کو ہر قسم کا فائدہ ملتا ہے۔ طلاق کے بعد میاں کو تین کپڑوں مین گھر چھوڑنا پڑتا ہے اور ایک سال تک شادی نہیں کر سکتا۔ بچے عورت کو ملتے ہیں اور اسے بچے ملنے کی خوشی ہو یا نہ ہو لیکن بچوں کے لئے حکومت سے اٹھارہ سال تک ہر مہ ہنے جو پے سے ملتے ہیں وہ اچھی خاصی رقم ہوتی ہے اور اس کے مقابلے میں ذمہ داری کچھ بھی نہیں کیونکہ حکومت نے تعلیم اور صحت کی مفت سہولتیں دے رکھی ہیں۔ بچوں کو حاصل کرنے کے لئے باپ بھی پورا زور لگاتا ہے لیکن بچے باپ کو صرف اس صورت میں ملتے ہیں جب وہ ثابت کر دے کہ بچوں کی ماں نشے کی عادی ہے اس لئے وہ ان کا خیال نہیں رکھ سکے گی یا یہ معلوم ہو جائے کہ بچوں کی ماں بدمزاج قسم کی عورت ہے اور بچوں کو مارتی پیٹتی رہتی ہے۔

غرض یہ کہ بچوں کی تقریباً ساری ذمہ داری یہاں کی حکومت پر ہے۔ جس کے جتنے زیادہ بچے ہیں اسے اتنے ہی زیادہ پیسے سوشل سیکورٹی کی طرف سے ملتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ سوئیڈن کے لوگ بچے کم، اور کتے زیادہ پالتے ہیں۔ ہر سوئیڈش خاندان میں ایک ہی بچہ ہو گا بہت زیادہ ہوا تو دو ورنہ کئی اے سے خاندان بھی ملیں گے جن میں ایک بچہ بھی نہیں ہے۔ لیکن گزشتہ پندرہ بیس سال میں ایشیا اور افریقہ کے لوگ جو سیاسی پناہ لے کر یہاں رہنے لگے ہیں، لگتا ہے کہ ان کا پسندیدہ مشغلہ بچے پیدا کرنا ہے۔ ان میں زیادہ تر لوگ کسی نوکری یا مزدوری کی تلاش تو نہیں کرتے لیکن زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ ایک عراقی عرب نے شرمندہ ہونے کی بجائے ہنس کر بتایا۔

"نوکری یا محنت مزدوری کے لئے کوشش کیوں کروں جب مجھے حکومت کی طرف سے گھر بیٹھے تین چار ہزار کرونے بے روزگاری الاؤنس مل جاتا ہے۔ نوکری میں مجھ جے سے ان پڑھ آدمی کو زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار کرونے ملیں گے یعنی ایک ڈیڑھ ہزار کرونوں کی خاطر اپنا آرام کیوں خراب کروں۔ چار بچے پیدا کر دے ئے ہیں جن کا الاؤنس مل جاتا ہے جس میں سے کچھ ہر مہینے اپنے ملک بھیجتا ہوں، خوب عیش بھی کرتا ہوں پھر بھی بچ جاتا ہے۔"

اس کے علاوہ اس شخص نے بتایا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ سال میں دو تین مرتبہ پولینڈ، ہنگری اور ترکی کے چکر لگاتا ہے جہاں سے وہ چوری چھپے وہ چیزیں یہاں اسمگل کر کے لے آتا ہے جو یہاں مہنگی ہیں جن کو بیچنے سے اس کی آمدنی اور بڑھ جاتی ہے۔ باہر کے ملکوں سے آکر یہاں سوئیڈن میں رہنے والے اے سے کئی لوگ ملیں گے جن کو یہاں آنے پر کسی دفتر میں نوکری یا کارخانے، فیکٹری میں مزدوری مل گئی ہوتی ہے لیکن اب وہ اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ وہ کسی طرح طبی طور پر ناموزوں قرار دے دے ئے جائیں تاکہ ان کو محنت مزدوری کرنے کی بجائے گھر بیٹھے تنخواہ ملتی رہے۔ کئی لوگ اس میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں اور یہاں کے قانون کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دراصل یہ چیزیں ایسی ہیں جن کو مقامی سوئیڈش لوگ پسند نہیں کرتے اور ہمارے غلط کاموں کی وجہ

سے ان لوگوں کو ہم سے نفرت کرنا ایک فطری عمل ہو گیا ہے۔ ہماری ان ناجائز طرے قوں سے حکومت سے سہولتیں حاصل کرنے پر اب کئی چیزیں سب کے لئے بند ہو رہی ہیں جس پر مقامی لوگ غصہ کرتے ہیں کہ باہر کے لوگوں کے آنے سے ان کو نقصان ہو رہا ہے۔

ایک چیز جو غلط استعمال کی وجہ سے ہمارے سامنے بند ہوئی وہ بس یا گاڑی میں مفت سفر کرنے کی سہولت ہے۔ ے ہاں کے قانون کے مطابق چار یا پانچ سال تک بچہ اپنی ماں یا باپ کے ساتھ ے ہاں کی بس میں مفت سفر کر سکتا تھا۔ مے رے خیال میں سوئیڈن دنیا کا وہ واحد ملک ہے جہاں بس کا ٹکٹ سب سے مہنگا ہے۔ ے ہ سمجھیں کہ صدر سے ٹاور تک ڈیڑھ سو روپیہ ہے جس میں چاہے آپ ایک کونے سے دوسرے کونے تک یعنی صدر سے ٹاور تک سفر کر لیں یا صرف ایک یا دو اسٹاپ تک۔ فرض کریں آپ کو صدر سے ٹاور تک سعید منزل، جامع کلاتھ مارکیٹ، لائٹ ہاؤ س اور بولٹن مارکیٹ میں بھی کام ہے تو ہر اسٹاپ پر اترنے کے بعد دوبارہ بس میں چڑھ کر آگے جانے کے لئے نیا ٹکٹ خریدنا ہوتا ہے۔ یعنی اس حساب سے آپ کو پانچ دفعہ ٹکٹ لینا پڑے گا یعنی 750 روپے خرچ کرنا پڑیں گے جو دے کھا جائے تو کافی بڑا خرچہ ہے۔ اب اس خرچے کو بچانے کے لئے ہمارے ایشیائی اور افریقی بھائیوں نے چھوٹے بچے کا سہارا لینا شروع کر دیا۔ نوکری تو ہے نہیں بیروز گاری الاؤ نس مل رہا ہے، وقت پاس کرنے کے لئے اور شہر میں یار دوستوں سے ملنے کے لئے بچے کی گاڑی (پرام) میں ہاتھ ڈالا اور چل پڑے۔ کبھی اس اسٹاپ پر اتر رہے ہیں کبھی اس پر۔ جب ماں نے شہر کی خوب سیر کر لی تو باپ نے بچے کو اٹھایا اور چل پڑا۔ دے کھتے ہی دے کھتے ان مفت خوروں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ پے سے دے کر سفر کرنے والوں کو بس میں جگہ ملنی مشکل ہو گئی کیونکہ بس کنڈیکٹر کو بس میں پہلے ان کو بٹھانا ہے جس کے پاس بچہ ہے۔ اور ے ہ ہی خیال کیا جاتا ہے کہ ہو سکتا ہے بچے کی ماں یا باپ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہو۔ دوسری طرف ے ہ ہوا کہ صبح شام بچے کو باہر نکالنے اور ادھر ادھر بھٹکانے سے سردی کی وجہ سے بچے نمونیا جیسی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے۔ اور علاج کے لئے حکومت کا خرچہ بڑھنے لگا۔ آخر کار حکومت کو ے ہ علم ہو گیا کہ ایشیا اور افریقہ کے لوگ اپنے چھوٹے بچوں کو ٹکٹ کے طور پر استعمال کر رہے ہیں اور بچوں کو ٹہلانے یا ڈاکٹر کے پاس اسپتال میں کسی ضروری چیک اپ کے لئے لے جانے کے بجائے خود سیر کر رہے ہیں۔ آخر ایک رات ہمارے ہوتے ہوئے حکومت کی طرف سے ٹی وی پر اعلان ہوا کہ ے ہ سہولت ختم کی جا رہی ہے، آج سے بچے کے لئے ٹکٹ تو نہیں ہو گا لیکن اس کے ساتھ سفر کرنے والے کو ٹکٹ لے نا ضروری ہے۔ سوئیڈش زبان تو ہمیں نہیں آتی کہ اس خبر کا ٹی وی یا اخبار سے ہمیں پتہ چلتا۔ دوسرے دن بسوں میں کالوں کے بچوں کی دھکم پیل نہ دیکھ کر تعجب ہوا اور پوچھنے پر پتہ چلا کہ حکومت نے نیا قانون نافذ کیا ہے جس کے تحت بچے کے والدین کو سفر کرنے کے لئے ٹکٹ خریدنا ہو گا۔ سچ پوچھیں تو اس سے مقامی لوگ تو کیا ہم بھی بہت خوش ہوئے۔ ایک تو بس میں بیٹھنے کی آرام سے جگہ

ملنے لگی اور دوسری بات ےہ کہ ہر بس اسٹاپ پر بس کار کنا ختم ہو گیا۔ ورنہ ہر بس اسٹاپ پر ایک دو عورتیں بچوں کو لے کر مفت سفر کرنے کے لئے کھڑی رہتی تھیں جن کو اٹھانے کے لئے بسوں کار کنا ضروری ہوتا تھا۔

سوئیڈش حکومت کی طرف سے اپنی عوام کی دی ہوئی سہولتوں میں سے ایک اور سہولت جس کو آج کل (خاص طور پر باہر سے آکرے ہاں بسنے والے) لوگ جس ناجائز طرے قے سے حاصل کر رہے ہیں مجھے خدشہ ہے کہ عنقریب ےہ بھی سب کے لئے بند ہو جائے گی۔ ےہ ہے طلاق کی صورت میں ملنے والا الاؤنس۔ طلاق کی صورت میں چونکہ عورت اکیلی ہو جاتی ہے۔ اس لئے اسے گھر چلانے میں مدد کی خاطر الاؤنس ملتا ہے۔ ےہ الاؤنس اس الاؤنس کے علاوہ ہے جو اسے بے روزگاری کی حالت میں ملتا ہے۔ بچے اکثر ماں کو ملتے ہیں جن کا بھی اچھا خاصا الاؤنس ہوتا ہے اور طلاق کی حالت میں بچے رکھنے کی وجہ سے اس کے گھر کا کرایہ بھی معاف ہو جاتا ہے۔

اب کیا ہو رہا ہے کہ کئی لوگ اس سہولت کو غلط استعمال کر رہے ہیں۔ سرکار سے مفت میں مزید پے سے حاصل کرنے کے لئے میاں بیوی رجسٹریشن آفس پہنچ جاتے ہیں اور اپنی شادی منسوخ کروا کر طلاق نامہ رجسٹر کراتے ہیں جس کی کاپی سوشل سیکورٹی والوں کو دے کر اسی مہینے سے طلاق کے الاؤنس لینا شروع کر دے تے ہیں۔

ہمارے علاقے میں مراکش کا ایک بس ڈرائے ور رہتا ہے جس کو پاکستان کے تقریباً وہ سارے جہاز راں جانتے ہیں جو مالمو (سوئیڈن) میں دو دو سال گزارتے آئے ہیں کیونکہ ےہ ہم ایشیائی افراد کو کرائے پر گھر سے لے کر گھر کے لئے فریج ٹی وی وغیرہ سستا دلوانے میں مدد کرتا ہے۔ ےہ اپنی پولش بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ ےہ لوگ کافی پیار محبت سے رہتے ہیں اور ہر روز محلے کے پارک میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سیر کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک دن اس نے مجھے فون کر کے اپنے گھر بلایا۔

"یار میں اپنا گھر شفٹ کر رہا ہوں اس سلسلے میں آپ کی مدد درکار ہے۔"

میں اس کے گھر پہنچا۔ میاں بیوی سامان کی پیکنگ کر رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ خوش گپیاں بھی چل رہی تھیں۔ میں بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ لیکن میں نے دے کھا کہ وہ گھر کا سارا سامان پیک کرنے کی بجائے چند چیزیں پیک کر کے ٹرک مین ڈال رہے تھے۔ مے رے اصرار پر مراکش کے ڈرائے ور نے مجھے رازدارانہ انداز میں بتایا کہ میاں بیوی کی طلاق ہو گئی ہے۔ ےہ سن کر مجھے بہت تعجب ہوا اور جس وقت اس کی بیوی ہمارے لئے چائے بنانے گئی تو میں نے اس سے پوچھا کہ آخر کس بات پر ناراضگی ہوئی۔ "کل تک تو آپ خوش خوش تھے بلکہ ابھی بھی آپ لوگوں کی کسی بات سے ناراضگی کا اظہار نہیں ہو رہا ہے۔"

مے رے بار بار پوچھنے پر وہ پریشان ہو گیا اور آخر کار باہر اکے لے سامان رکھتے وقت اس نے بتایا کہ اس کی بیوی بڑی جھگڑالو ہے۔ اس کا کردار بھی صحیح نہیں ہے اس لئے وہ دونوں ایک دوسرے سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ میاں جب ٹرک کے ساتھ سامان لے کر نئے گھر کی طرف روانہ ہوئے تو میں نے اس کی بیوی سے افسوس کا اظہار کیا۔ اس نے غم یا غصے کو ظاہر کرنے کی بجائے قہقہہ لگا کر کہا۔ "دراصل کچھ زیادہ پے سے کمانے کے چکر میں ہم ےہ کر رہے ہیں؟"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"دراصل ہم لوگوں نے طلاق کا ڈرامہ کیا ہے، الاؤنسز حاصل کرنے کے لئے۔ جھگڑا وغیرہ کچھ نہیں اور اب ہمیں گھر بھی ایک کی بجائے دو مل گئے ہیں جن کا کرایہ بھی نہیں دینا پڑے گا۔ میاں اس گھر میں رہے گا میں بچوں کے ساتھ اس گھر میں۔"

"پھر بچوں کے بغیر وہ کے سے رہ سکے گا؟" میں نے پوچھا۔

"بس نام کے دو گھر ہوں گے کچھ سامان وہاں ڈال رہے ہیں۔ دن کو کبھی کبھی وہ ادھر جا کر رہے گا باقی وقت وہ ہمارے ساتھ رہے گا۔ اس نے بتایا۔

قارئین کی معلومات کے لئے ےہ بتانا بے محل نہ ہو گا کہ سوئیڈن کا قانون طلاق شدہ جوڑے کو طلاق کے بعد بھی ایک دوسرے سے ملنے کے لئے ہمت افزائی کرتا ہے تاکہ کسی طرح صلح صفائی ہو جائے تو اچھا ہے اور فیملی میں اگر بچے ہیں تو اس صورت میں باپ کے لئے ضروری ہے کہ ہفتے میں دو تین دن بچوں کے ساتھ رہے تاکہ ان پر نفسیاتی اثر نہ پڑے۔ اب ےہ قانون حکومت نے نیک نیتی پر بنایا ہے تاکہ بچھڑے ہوئے میاں بیوی پھر مل جائیں لیکن لوگوں نے اس کو بھی پے سے کمانے کا ذریعہ بنایا ہوا ہے اور طلاق رجسٹرڈ کرنے کے بعد بھی وہ اکٹھے رہتے ہیں یعنی حکومت کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں اور اس طرح سے پیسہ حاصل کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

ے ہاں (مالمو) میں کئی مولوی صاحبان اور آئمہ مساجد نے مسلمانوں کے لئے فتویٰ صادر کر دیا ہے کہ ایسا کرنے سے مسلمانوں کی طلاق ہو جاتی ہے اور اس طرح حکومت سے رقم بٹورنا اسلامی نقطہ نگاہ سے حرام ہے۔ لیکن پھر بھی دیکھا جائے تو اس معاملے میں زیادہ ہمارے مسلمان بھائی ہی ملوث ہیں، چاہے وہ ایشیا کے عرب، ایرانی، یا پاکستانی ہوں یا افریقہ کے حبشی۔

ایک پاکستانی بڑے فخر سے بتا رہا تھا کہ وہ پڑھا لکھا نہیں ہے، نوکری بھی نہیں کرتا ہے پھر بھی گھر بیٹھے اسے ہر مہے نے کوئی ایک لاکھ روپے مل جاتے ہیں۔ ہم نے اس کے تین بچوں کا حساب لگایا پھر بھی ایک لاکھ روپے نہیں بن رہے تھے پھر اچانک ےہ راز بھی فاش ہو گیا۔ ایک دن مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں اپنے دو کمروں کا کتنا کرایہ دیتا ہوں۔

"کوئی ڈھائی ہزار کرونے۔" میں نے جواب دیا۔

"مے رے پاس ایک فلیٹ ہے آپ چاہیں تو اس میں شفٹ ہو جائیں میں کم کرائے پر دینا چاہتا ہوں۔" اس نے مجھ سے کہا۔

میں نے کہا کہ "سوئیڈن میں اب مے رے صرف چند ماہ ہی رہ گئے ہیں اس لئے میں شفٹ نہیں ہونا چاہتا۔ ہاں مے رے ساتھ کام کرنے والے سعودی عرب اور وینزویلا کے دو جہاز ران ہیں جن کی اگلے مہینے فیملی آرہی ہے جس کے بعد وہ ظاہر ہے ہاسٹل سے شفٹ ہونگے۔ آپ چاہیں تو میں ان سے بات کروں۔" میں نے اس سے پوچھا۔

"ہاں ضرور کرلو لیکن ایک بات ان سے کہنا کہ کرائے کی رسید نہیں دے سکوں گا۔" اس نے بتایا۔

"پھر تو میرا کوئی بھی جہاز ران ساتھی کرائے پر گھر نہیں لے سکے گا کیونکہ جس بین الاقوامی ادارے نے ہمیں بلوایا ہے اور جو ہمارا خرچہ برداشت کرتا ہے اسے ہمیں ہر خرچے کی رسید دینی پڑتی ہے۔"

مے رے تعجب کرنے پر کہ وہ رسید کیوں نہیں دینا چاہتا ہے اور جب اسے اپنے رہنے کے لئے ہی گھر نہیں ہے اور جس فلیٹ میں وہ رہتا ہے وہ خود ایک قسم کا خیراتی ہے یعنی ے ہاں کی سرکار نے اسے بیروزگار اور بہت سارے بچوں کا باپ ہونے کے ناطے دیا ہوا ہے اس پر ے ہ دوسرے فلیٹ کا ہونا کیا مطلب رکھتا ہے؟ اس نے بات کو گول مول کرتے ہوئے بتایا کہ ے ہ دوسرا فلیٹ اس کے دوست کا ہے جو کچھ عرصے کے لئے جرمنی چلا گیا ہے اور جسے وہ کرائے پر چڑھانا چاہتا ہے۔

لیکن اس کا ے ہ جھوٹ زیادہ دن چھپ نہیں سکا۔ سوئیڈن چھوڑتے وقت پتہ چلا کہ ے ہ دوسرا فلیٹ بھی اس کا ہی تھا جس کا کرایہ بھی سرکار اسے دیتی ہے یعنی ان کو مفت میں ملا ہے کیوں کہ انہوں نے نہ صرف طلاق کی رجسٹریشن کرائی ہے پر عدالت سے کہہ کر تین بچوں میں سے ایک بچہ خود پالنے کے لئے بھی لیا ہے جس کی وجہ سے ان کو جو گھر ملا ہے وہ بھی تقریباً مفت میں ملا ہوا ہے اور اب چونکہ ے ہ سارے لوگ ایک گھر میں رہتے ہیں (کیوں کہ اندرونی طور پر طلاق ہوئی نہیں ہے) اس لئے ے ہ دوسرا فلیٹ کرائے پر دے کر کچھ اور پے سے کمانا چاہتے ہیں۔ اس طرح ہمیں پتہ چلا کہ ہر مہنے سرکار سے اتنے پے سے بٹورنے کے لئے اس نے کیا کیا طرے قے اپنا رکھے ہیں۔

سیدھا راستہ اس کو دکھا

یورپ کے ان شمالی ملکوں ناروے، ڈنمارک، سوئیڈن اور فن لینڈ وغیرہ میں عورت اور مرد کا سماجی درجہ برابر سمجھا جاتا ہے۔ وے سے تو سچی بات ے ہ ہے کہ ے ہاں عورت کا مقام مرد سے بہت اونچا تھا (اور اب بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے) لیکن حکومت نے بذریعہ قانون اسے مرد کے برابر کر دیا ہے۔ ان ممالک میں عورت ہر قسم کی نوکری کر سکتی ہے اور اسے اس کا معاوضہ اتنا ہی ملتا ہے جتنا مرد کو۔ کئی عورتیں ٹیکسیاں، سرکاری بسیں اور ہوائی جہاز چلاتی ہیں۔ مرد حضرات ے ہ سوچ کر برتری ثابت نہیں کر سکتے کہ ہم کمانے والے اور معاشی طور پر مضبوط ہیں اور عورت معاشی طور پر کمزور ہے۔ ہر گز نہیں۔ مرد نوکری یا مزدوری کر کے گھر میں دال روٹی کا بندوبست کرتا ہے تو عورت بھی برابر کا کما لیتی ہے اور اگر عورت کا کوئی روزگار نہیں تو حکومت کی طرف سے اسے بے روزگاری الاؤنس اتنا مل جاتا ہے جو اچھی خاصی نوکری کی تنخواہ کے برابر ہوتا ہے۔ ے ہاں سوئیڈن میں میں نے دیکھا کہ ے ہاں کے مقامی سوئیڈش مرد تو کیا ہمارے ایشیائی اور افریقی بھائی جو ے ہاں کے مستقل رہائشی ہو گئے ہیں اور جن پر مقامی قانون لگتا ہے، ان کو بھی خود ہانڈی روٹی کرنی پڑتی ہے۔ اگر ے ہ کام بیوی کر رہی ہے تو میاں کا کام برتن دھونا ہے۔ بیوی ٹی وی دیکھ رہی ہے یا ٹیلیفون پر بات کر رہی ہے تو میاں کا کام ہے بچے کی آواز پر اس کو رفع حاجت کے لئے لے جانا، صفائی کرنا اور پھر نیپی باندھ کر اسے سلانا۔ اس میں مرد حضرات کو سر پیٹنے یا چیخ و پکار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ملک کا قانون ایسا ہے کہ مرد بیوی کی پٹائی تو کیا ڈانٹ ڈپٹ بھی نہیں کر سکتا یعنی ہاتھ سے تو کیا زبان سے بھی اپنے غصے کا اظہار نہیں کر سکتا کیونکہ اس صورت میں بیوی اسے ے ہ کہہ سکتی ہے کہ زیادہ شور کرنے کی ضرورت نہیں ہے "اگر

مے رے ساتھ رہنا پسند نہیں ہے تو تمہیں باہر جانے کا راستہ معلوم ہے۔ جہاں چاہے چلے جاؤ آج سے ے ہ گھر میرا ہے۔" اور دوسرے دن سے بیوی، حکومت سے، طلاق الاؤنس لینا شروع کر دیتی ہے۔

سو ان ممالک میں مرد کی عجیب و غریب مجبور زندگی ہے۔ ان کی بیوی کسی غے ر مرد یا بوائے فرینڈ کو گھر میں بلا کر اس کے ساتھ چائے پے ئے تو بھی اس کا میاں سوائے ٹھنڈی آہیں بھرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کو طلاق دے سکتے ہیں لیکن طلاق چاہے کوئی بھی دے نقصان مرد کا ہوتا ہے کیونکہ اسے، جے سے کہ اس سے پہلے لکھ چکا ہوں تین کپڑوں (بلکہ دو کپڑوں: پتلون و قمیص) میں گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی عورت بد تمیزی سے پیش آتی ہے تو بھی مرد کو خاموشی سے کام لینا پڑتا ہے۔ ڈانٹ ڈپٹ کرنے یا رعب جھاڑنے سے الٹا اسے نقصان ہو سکتا ہے۔ زیادہ سے زے ادہ وہ دل ہی دل میں قتیل شفائی کا دعائیہ بند پڑھ سکتا ہے۔

"سن! اے ربِ جلیل!

ے ہ جو میری بیوی بد گفتار ہے

جان کا آزار ہے

یا تو سیدھا راستہ اس کو دکھا

یا اسے بیوہ بنا۔"

بہر حال ے ہ حال تو ان گوروں (مقامی سوئیڈش مردوں) کا ہے۔ قارئین اس سے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اے سے حالات میں ایشیائی اور افریقی مردوں کی زندگی کس کسمپرسی اور مسکینی کی حالت میں گزرتی ہو گی جن کی بیویاں مقامی سوئیڈش، نارویجن یا ڈینش ہیں۔

سیاسی پناہ

سوئیڈن ایک خوشحال ملک ہے۔ وے سے تو اسکینڈی نیویا کے سارے ممالک مثلاً ناروے، ڈنمارک، فن لینڈ وغیرہ امیر ممالک ہیں لیکن سوئیڈن ان سب میں امیر ترین ملک ہے، دھن دولت میں بھی اور ٹیکنالوجی میں بھی۔ یاد رہے کہ امن کا نوبل انعام یعنی کروڑوں روپے کے انعامت دے نے والے مسٹر نوبل ے ہیں کے تھے۔ دنیا کی مہنگی گاڑیاں والوو (VOLVO) اور SAAB کمپنی کی کاریں اور ہوائی جہاز ے ہاں بنتے ہیں۔ اریکسن الیکٹرونکس FACIT ٹیراپیک اور IKEA فرنیچر جیسی مشہور اورامیر کمپنیاں ے ہاں کی ہیں۔ بوفورس توپیں اور بلند معیار سب میرین بنانے کے شپ یارڈ KOKUM ے ہیں پر ہیں۔ مطلب ے ہ کہ عرصہ دراز سے سوئیڈن خوشحالی اور کم آبادی کی علامت رہا ہے۔ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ ے ہاں سوئیڈن میں اتنے بے شمار کارخانے اور نوکریاں تھیں کہ دوسرے ممالک سے لوگوں کو بلوایا جاتا تھا اور ہمیشہ کے لئے ے ہاں رہنے کی خواہش ظاہر کرنے پر انہیں بغیر کسی تکلیف کے سوئیڈن کا پاسپورٹ اور قومیت مل جاتی تھی۔ آج کل جو پاکستانی ے ہاں نظر آتے ہیں ان کی ایک بڑی تعداد انہی دنوں ے ہاں آئی تھی۔

سوئیڈن میں آج کل فالتو ملازمتیں نہ ہونے کی وجہ سے انہیں غیر ملکیوں کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ان کے اپنے ہی کئی لوگ بیروزگار بیٹھے ہیں۔ ایسی صورت میں سوئیڈش حضرات ہر گز نہیں چاہتے کہ ملازمت کی تلاش میں دوسرے ملکوں کے لوگ ان کے ملک میں آکر ان کی حکومت پر بوجھ بنیں۔ لیکن اس کے باوجود گزشتہ بیس پچیس برس میں ایران، لبنان، ویتنام، صومالیہ، سوڈان، عراق اور دوسرے ممالک کے لوگوں نے اپنی حکومت کے مظالم اور نا انصافیوں سے تنگ آکر ے ہاں پر سیاسی پناہ حاصل کی ہے، ان میں پاکستان کے کئی قادیانی بھی ہیں۔ چونکہ نوکری کرنے کے لئے ویزا ملنا تو بند ہو گیا تھا اس لئے سوئیڈن (یا دوسرے اسکنڈی نیوین ملکوں) میں رہنے کا طریقہ سیاسی پناہ رہ گیا تھا یا مقامی باشندے سے شادی کرنا۔

دے کھتے ہی دے کھتے سچے یا من گھڑت قصے اور ظا موں کی داستان سنا کر سیاسی پناہ حاصل کرنے والوں کی تعداد اتنی بڑھتی گئی کہ ے ہاں کہ لوگو نے ہمدردی کرنی چھوڑ دی اور اب اقوام متحدہ کے بنائے ہوئے فارمولے پر پورے اترنے والے کو ہی بڑی مشکل سے سیاسی پناہ دی جاتی ہے اور اسے بھی عام شہری کی طرح کھلا چھوڑنے کی بجائے دور دراز کے دے ہات اور جزیروں پر بنائے ہوئے کیمپوں میں رکھتے ہیں اور ان کو ایک دم سوئیڈن یا ناروے کا پاسپورٹ دے نے کے بجائے کچھ سال انتظار کراتے ہیں تا کہ ان کے ملک کی حالت بہتر ہو جائے اور انہیں واپس بھیجا جا سکے۔

"اقوام متحدہ کا کیا فارمولا ہے جس کے تحت ایک غیر ملکی دوسرے ملک میں سیاسی پناہ کے لئے قابل قبول قرار پاتا ہے؟" میں نے ایک مقامی سوئیڈ سے پوچھا۔

"سیاسی پناہ کے قابل صرف وہ ہے جس کو خطرہ ہو کہ اگر اسے اپنے ملک بھیجا گیا تو حکومت اسے مذہبی، لسانی یا سیاسی دشمنی کی بناء پر زندہ نہیں چھوڑے گی۔"

شاید یہ سبب ہے کہ سوئیڈن کی حکومت آج کل کسی کو سیاسی پناہ دینے سے کتراتی ہے۔ جو غیر ملکی سیاسی پناہ کا بہانہ بنا کر آتا ہے اسے دوسرے پرواز سے اس کے وطن روانہ کر دیا جاتا ہے یا چند دن کیمپ میں رکھ کر عدالت میں مقدمہ چلا کر اسے واپس کر دیا جاتا ہے۔ ان ملکوں کا موسم ایسا ہے جو گھروں میں اپنے بال بچوں کے ساتھ ٹھہرے ہوئے لوگ بھی بے پناہ ٹھنڈ اور لمبی اندھیری راتوں کی وجہ سے زندگی سے تنگ اور خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ ایسے حالات میں اگر کسی غیر ملکی کو کسی ویران جزیرے پر اکیلا رکھا جائے تو اس کا کیا حال ہو گا۔ ایسی صورت حال میں سیاسی پناہ حاصل کرنے کے کئی خواہشمند عدالتی فیصلے کے انتظار سے پہلے مقامی حکومت یا اپنے سفارتخانے کی منتیں کرتے ہیں کہ انہیں واپس اپنے وطن بھیجا جائے۔

سوئیڈن کی قومیت حاصل کرنے والے ایک غیر ملکی باشندے نے بتایا کہ سوئیڈن میں مقامی عورتوں کے آگے بڑھنے کی وجہ سے تمام ملازمتیں ختم ہو گئیں ہیں ورنہ اس ملک کی آبادی اتنی کم ہے کہ ہے ہاں آج بھی کئی ممالک کے لوگوں کو کام مل سکتا ہے۔

"وہ کیسے؟" میں نے معلوم کرنا چاہا۔

"عورتوں کی تحریکوں نے ہے ہاں کی عورت میں تعلیم اور آزادی حاصل کرنے کے لئے شوق و جذبہ پیدا کیا ورنہ اس طرف کے ملکوں کی عورت اسکرٹ کے اوپر پنجابی اسٹائل کا لنگوٹ باندھ کر سارا دن گائے بھینسوں کو چارا ڈالتی اور دودھ نکالتی رہتی تھیں۔ بعد میں دوسری جنگ عظیم کے دوران ہے ہاں کی عورتوں نے اسکول میں بچوں کو پڑھانے اور کلرکوں جیسی نوکریاں شروع کی اور اب تو جناب ہے ہاں کی عورتیں ٹرک بھی چلاتی ہیں تو ہوائی جہاز بھی۔ لیتھ مشین بھی چلاتی ہیں تو دکان بھی۔ اس کا نتیجہ ہے یہ نکلا ہے کہ مقامی لوگ بھی بیروزگار ہو گئے ہیں۔ بہر حال بہترین ٹیکس سسٹم ہونے کی وجہ سے ملک کے پاس کافی دولت ہے اور بیروزگار اور بوڑھے لوگوں کو حکومت کی طرف سے ہر مہینے اتنا الاؤنس مل جاتا ہے کہ ان کا گزارہ ہو جاتا ہے ورنہ ہے یہ وہ ممالک ہیں جہاں شدید ٹھنڈ کی وجہ سے نہ آلو ہوتے ہیں نہ گاجر، گندم اور باجرا بھی مرغی کے بھاؤ ملتا ہے اور اسے سے ملکوں میں ایک ایک دن گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

سوئیڈن میں رہنے والے غیر ملکیوں میں سے ایک سے میں نے پوچھا۔ "سوئیڈن میں مراکش، الجیریا اور تیونس والے کس طرح ٹھہرے ہوئے ہیں؟" میرا مطلب تھا کہ ان کو سوئیڈن میں رہنے کے لئے سیاسی پناہ کیسے مل گئی جب کہ ان کے ملکوں میں ظلم کی کوئی بھی واردات نہیں ہوئی۔

"ان لوگوں نے خود کو عراقی ظاہر کر کے ےہاں رہائش اختیار کی ہے۔ عرب ممالک کے سارے لوگ عربی زبان سے واقف ہوتے ہیں۔ عراقیوں کو سوئیڈن میں سیاسی پناہ ملنے کی خبر سن کر کئی عرب ملکوں کے لوگ چوری چھپی ےہاں پہنچ گئے اور ےہاں پہنچتے ہی اپنا پاسپورٹ پھاڑ کر عراقی کہلوانے لگے اور عراقی صدر صدام حسین سے ظلم کو منسوب کر کے سیاسی پناہ حاصل کر لی۔ نیز ےہاں کی حکومت کو بعد میں ان کی چال بازیوں کا پتہ چل گیا اور بعد میں بہت سختی کی جانے لگی اور اب تو صورتحال ےہ ہے کہ جو واقعی مظلوم ہوتا ہے اس کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔"

یورپ میں کتا پالنا

یورپ کے لوگ، خصوصاً سوئیڈش خواتین کتے ضرور پالتی ہیں لیکن ان ملکوں میں کتا پالنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ےہاں پر ہر ایک قوانین پر سختی سے عملدرآمد ہوتا ہے۔ کتا پالنے والے کو کتا خریدنے کے بعد میونسپل آفس میں فیس دے کر اپنے کتے کو رجسٹر کرا کے موٹر سائیکل یا کار کی طرح نمبر لینا پڑتا ہے۔ پھر وقفے وقفے سے ڈاکٹروں سے کتے کا معائنہ کرا کے سرٹیفکیٹ لینا پڑتا ہے کہ اس کتے کو کوئی بیماری لاحق نہیں۔ اس کے علاوہ جے سے ہر بچے کو عمر کے حساب سے پولیو، کالی کھانسی، چیچک وغیرہ جے سے امراض سے بچنے کے لئے مختلف ادویات کے قطرے یا ٹے کے لگوانے پڑتے ہیں، اس طرح ہر ایک کو اپنے کتے کو صحتمند رکھنے کے لئے مختلف ادویات کے ساتھ ساتھ اسے ٹیکوں کا کورس بھی کرانا پڑتا ہے۔ گاڑی کے کاغذات کی طرح ان ادویات کی رسیدیں اور سرٹیفکیٹ ہر وقت اپنے ساتھ رکھنے پڑتے ہیں تا کہ محکمہ صحت کے انسپکٹر کے اچانک چھاپے پر دکھائے جا سکیں۔

کتے کو صاف ستھرا رکھنے کے لئے اسے ہر وقت خاص قسم کے جراثیم کش صابنوں اور جلد کو ملائم رکھنے والے شیمپوؤں سے نہلانا پڑتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اے سے بہترین اور مہنگے صابن اور شیمپو ہماری دس فلمی اداکاراؤں میں سے بمشکل ایک یا دو استعمال کرتی ہوں گی۔ گم ہونے کے ڈر سے کتوں کی گردن میں چمڑے کا نرم اور چوڑا پٹہ ضرور ڈالا جاتا ہے جس پر اس کا رجسٹریشن نمبر بھی لکھا ہوتا ہے تا کہ کسی کو نقصان پہنچانے کی صورت میں یا شہر کی سڑک یا پارک خراب کرنے پر اس کتے کا چالان کیا جائے۔

کتا پالنے والے کو اس کی خوراک پر بھی کافی خرچہ کرنا پڑتا ہے۔ کتوں کو صحت مند رکھنے اور جانوروں کو ظلم سے بچانے والی سوسائٹی کے کارندوں کی چیکنگ سے بچنے کے لئے کتوں کو جو غذائیت سے بھرپور بسکٹ، کیک اور دوسری اشیاء کھلائی جاتی ہیں وہ کئی ممالک کے لوگوں کو خاص مواقع پر بھی نصیب نہیں ہوتی۔

اے سے ممالک میں کتے پالنے والوں کے لئے سب سے بڑا مسئلہ ان کو ٹوائلٹ کرانے کا ہے جس کے لئے کتے کا مالک ایک وقت اور جگہ مقرر کرتا ہے۔ مے رے کمرے کے بائیں طرف کی کھڑکی سے مرکزی سڑک جبکہ دائیں طرف کی کھڑکی سے بچوں کا اسکول اور کھیل کا میدان واضح نظر آتا ہے۔ گراؤنڈ کے کونے پر ایک بیس میٹر لمبا اور تقریباً پانچ میٹر چوڑا درختوں سے بھرا پارک ہے جس کے درمیان میں سیمنٹ کی ایک بینچ بھی ہے۔ صبح صبح جبکہ ابھی اندھیرا ہوتا ہے محلے کی خواتین اور مرد حضرات اپنے کتوں کو لے آنا شروع کرتے ہیں۔ سخت سردی کی وجہ سے گرم کپڑوں میں ملبوس ہوتے ہیں اور دستانے بھی پہن رکھے ہوتے ہیں۔ سردی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ میری کھڑکی کے بیرونے حصے پر دن کے وقت جو بارش کا پانی جمع ہو جاتا ہے وہ رات کی ٹھنڈ میں برف کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کمرے کے اندر تو گرمائش پہنچانے کا نظام ہوتا ہے لیکن کھڑکی کا شیشہ اتنا ٹھنڈا ہوتا ہے کہ ہاتھ لگانے کو دل نہیں چاہتا۔ ے ہ مرد اور خواتین اپنے کتے کو پارک مین چھوڑ کر خود بینچ پر بیٹھ جاتے ہیں یا پتوں سے خالی درختوں کے نے چے انتظار کرتے ہیں۔ جس جس کا کتا فارغ ہوتا جاتا ہے اس کی چھٹی ہو جاتی ہے اور وہ اپنے کتے کو لے کر گھر کو روانہ ہو جاتے ہیں اور کھلے میدان میں سردی سے مزید ٹھٹھرنے سے بچ جاتے ہیں۔ قبض میں مبتلا کتوں کے مالکان کی حالت خراب ہوتی ہے وہ سخت پریشان ہوتے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ خود اٹھ کر اپنے کتے کو ٹہلاتے ہیں یا ان کو کچھ کھلاتے ہیں جو ضرور کوئی قبض کشا چاکلیٹ ہو گی یا کوئی اور دوا کیونکہ ان ٹھنڈے ملکوں میں پانی کم پینے کے وجہ سے انسانوں کو بھی قبض ہو جاتا ہے ے ہ تو کتے ٹھہرے۔

کتا پالنے والا چاہے کتنی دیر سے سوئے لیکن کتے کی خاطر اسے صبح صبح مقررہ وقت پر اٹھنا پڑتا ہے، جس کے لئے کئی لوگ تو الارم لگا دے تے ہیں ورنہ ان کے کتے بھونک بھونک کر ان کو جگاتے ہیں تا کہ ان کو اے سے پارکوں میں لے جا سکیں جو ے ہاں کی حکومت نے کتوں کے لئے جگہ جگہ بنا رکھے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ے ہاں کی حکومت کتے پالنے والے سے سالانہ ٹیکس وصول کرتی ہے تو ان کے لئے (یعنی کتوں کے لئے) کچھ تو سہولت مہیا کرے گی۔

ان پارکوں کے علاوہ جگہ جگہ سڑک کے کنارے آپ کو کچرے کے ڈبے نظر آئیں گے۔ ایک کاغذ، کچرا، شربت کا خالی ڈبہ یا بوتل پھینکنے کے لئے جبکہ دوسرا کتوں کے لئے ہوتا ہے۔ ہر کتا ٹہلانے والا اپنی جیب میں پلاسٹک کی تھیلی (شاپنگ بیگ) لے چلتا ہے۔ کہیں کسی کے کتے کو اچانک رفع حاجت پیش آ جائے تو وہ وہیں پر فارغ ہو سکتا ہے لیکن اس کے مالک کو صفائی قائم رکھنے کے لئے (جیب سے تھیلی نکال کر ہاتھ پر چڑھا کر) اپنے کتے کی غلاظت اٹھا کر کچرے کے اس ڈبے میں پھینکنا ہوتا ہے جس پر کتے کی شکل بنی ہوتی ہے یا سوئیڈش زبان میں لفظ کتا لکھا ہوتا ہے۔ ے ہاں کر مرد اور بوڑھی خواتین تو کیا نوجوان اور فلمی ایکٹریسوں جیسی لڑکیاں بھی ے ہ کام بڑی خوشی سے کرتی ہیں کیونکہ نہ کرنے کی صورت میں یا کسی کی شکایت کرنے پر انہیں بڑے جرمانے کی ادائیگی کرنی پڑتی ہے۔

بہر حال ے ہاں کے کتے بھی عجیب مصیبت ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ کتا انسان کا دوست ہوتا ہے۔ ہوتا ہو گا لیکن سوئیڈن کے لوگوں کے لئے تو کتا ایک بڑا رئیس ہے جس کی انہیں پورا دن خدمت کرنی پڑتی ہے اور ان کتوں سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ کم از کم ہم غیر ملکی کالوں کو دیکھ کر تھوڑا سا بھونک لیں۔ آخر ایک کتے کی سب سے بڑی خوبی ے ہی تو ہے کہ وہ ایک اچھا چوکیدار ہوتا ہے۔

سوئیڈن کے لوگ اپنی رقوم زیادہ تر بینکوں میں رکھواتے ہیں اور ے ہاں کی خواتین زیورات کا استعمال کبھی کبھار کرتی ہیں۔ ے ہاں کا معاشرہ سیکس فری معاشرہ کہلاتا ہے لہٰذا ے ہاں عصمت دری کے واقعات سننے کو بھی نہیں ملتے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ے ہ کس چیز کی حفاظت کرتے ہیں اور ے ہ کس مرض کی دوا ہیں۔

اس قسم کے سوالات اگر کیپٹن سلیم سے کئے جائیں تو ان کے پاس ان چیزوں کا ایک ہی پرانا جواب ہوتا ہے کہ شوق از اے شوق۔

ایک اور ہمارا جہاز ران پاکستانی دوست راحت عزیز ے ہاں رہتا ہے جو میری طرح بحری جہاز کا چیف انجینئر ہے۔ مذاق مذاق میں ایک دن اس سے بھی میں نے پوچھ لیا کہ ے ہاں کے لوگ کتے کیوں پالتے ہیں؟ اس وقت ایک خاتون گود میں کتا اٹھائے سڑک عبور کر رہی تھی۔

"آپ کا مطلب ہے ے ہاں کی خواتین کتے پالتی ہیں لیکن بچوں سے کیوں بھاگتی ہیں؟" اس نے کہا۔ "چلو یونہی سہی۔" میں نے جواب دیا کیونکہ بات تقریباً ایک ہی تھی۔

"ظاہر ہے کتا پالنے میں وہ تکلیف نہیں ہے جو بچہ پیدا کرنے اور پالنے میں ہے۔" راحت عزیز نے سمجھانے کی کوشش کی۔ "کتا تو بازار سے پے سے دے نے پر اسی وقت مل سکتا ہے بچے کو تو نو مہے نے پیٹ میں سنبھالنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد زچگی کی تکلیف پھر پالنے کے لئے نیندیں حرام کرنا۔ عورت کی خوبصورتی ختم ہو جاتی ہے۔ ے ہاں کی خواتین کبھی بھی نہیں چاہتیں کہ ان کے معمولات متاثر ہوں اور بچے کی خاطر زیادہ وقت گھر میں گزارنا پڑے۔ ے ہاں کی خواتین ہالی ووڈ کی ہیروئنوں کی طرح دبلی پتلی، خوبصورت اور بنی ٹھنی رہنا چاہتی ہیں۔ ے ہ ہر گز نہیں چاہتیں کہ بچے کی خاطر نو مہے نے ڈھول جیسا پیٹ لے کر چلیں اور بغیر برا کے سڈول جسم لیکر پھرنے والی یہ حسینائیں بعد میں لڑھکتی ہوئی چھاتیوں کے ساتھ دعوتوں میں جائیں۔

سوئیڈن کے لوگ

سوئیڈن کے رہنے والے مقامی افراد پر کسی نے بڑا دلچسپ تجزیہ کیا ہے کہ سوئیڈ (سوئیڈن کے مقامی لوگ جن کو سوئیڈش بھی کہتے ہیں) بڑے عجیب لوگ ہیں! وہ طویل القامت ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھیں نیلی اور بال راکھ کی طرح (جو Blonde کہلاتے ہیں) اور سر پر اکثر گرم ہیٹ رکھ کر چلتے ہیں۔

عام طرح سوئیڈ طبیعتاً شرمیلا، سنجیدہ اور تن تنہا چلنے والا شخص ہے۔ وہ بہت محنتی، سخت جان اور اپنے کام سے کام رکھنے والا ہے۔ ہنسی مذاق جیسی چیز سے تو بالکل ہی ناواقف ہے۔ وہ عادت کا غلام ہے یعنی ہر بات کی عادت ڈال دیتا ہے۔ دفتر شروع ہونے کا وقت آٹھ ہو گا لیکن یہ روزانہ صبح کو ساڑھے پانچ بجے ہی اٹھ کھڑا ہو گا تا کہ اخبار پڑھنے کے لئے اسے کافی وقت مل جائے۔ (اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سوئیڈ اخبار پڑھنے میں سست ہیں)

خود کے علاوہ اسے کچھ اور چیزیں بھی پسند ہیں .... دولت، ملازمت، مکان، ہاکی اسٹک اور اپنا گھر بار (اسی ترتیب میں)۔ اسے جانوروں سے بھی پیار ہے، خاص طور پر کتوں سے۔ وہ گھنٹوں شہر میں سائیکل چلاتا نظر آئے گا اور پیچھے پیچھے رسی سے اپنے بھیڑیا نما کتے کو بھی کھینچتا رہے گا۔

سوئیڈ (سوئیڈن کا باشندہ) اکثر ایماندار، بھروسے والا اور صاف ستھرا ہوتا ہے۔ اس کے منہ میں اصلی دانت ہوتے ہیں اور قانون کا دل سے احترام کرتا ہے جس کی مثال آپ کو سڑکوں پر نظر آئے گی۔ دور دور تک کوئی گاڑی نظر نہیں آئے گی سوئیڈ بارش میں بھیگتا رہے گا لیکن سڑک تب تک پار نہیں کرے گا جب تک پیدل چلنے والوں کے لئے ہری بتی روشن ہو۔ کار چلاتے وقت ہمیشہ سیٹ بیلٹ باندھے گا چاہے اسے اپنی گاڑی ایک درخت کے نیچے سے ہٹا کر دوسرے درخت کے نیچے پارک کرنی پڑی اور شراب پی کر کبھی بھی ڈرائیونگ نہیں کرے گا۔ اگر ٹی وی خریدے گا تو اس کا لائسنس بھی ضرور بنوائے گا اور انکم ٹیکس وقت پر ادا کرے گا۔

سوئیڈ آدمی کتے کو ساتھ لے چلنے سے پہلے پلاسٹک کی تھیلی جیب میں ڈالتا ہے، کیا پتہ اس کا کتا کہیں سڑک خراب کر دے جسے صاف رکھنا وہ اپنا فرض سمجھتا ہے۔ رات کو دس بجے کے بعد وہ کبھی نہیں نہاتا۔ (ہے ہاں کے قانون کے مطابق فلیٹوں میں رہنے والوں کو اپنے پڑوسیوں کا زیادہ خیال کرنا پڑتا ہے۔ دس بجے کے بعد زور سے بات کرنا، ٹی وی یا ریڈیو کی آواز اونچی کرنا اور نہانا منع ہے کیونکہ اس سے پڑوسی کی نیند میں خلل پیدا ہو سکتا ہے)۔

سوئیڈ آدمی ہر کام ہوشیاری سے کرتا ہے۔ کئی لوگ بات کر کے پھر سوچتے ہیں۔ بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ ہر بات سوچ کر کرنی چاہیے۔ سوئیڈ سوچنے کے بعد بھی کوئی بات کرنے کی بجائے اپنی زبان کو بند رکھنا بہتر سمجھتا ہے۔

سوئیڈ کوئی بھی کام جلد بازی اور بغیر سوچ کے نہیں کرتا، سوائے چھینک مارنے کے۔ اس کے لئے ہر بات کا فیصلہ زندگی کا فیصلہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مکھن یا پنیر جیسی چیز کی خریداری مین بھی سوئیڈ جلدی نہیں کرے گا۔ وہ دس دکانوں پر جا کر اس کی دس اقسام دے کھ کر پھر کوئی آدھ پاؤ مکن لے گا۔ اس کی نس نس میں رچی شاید ے ہ خبردار رہنے کی عادت ہے جس کی وجہ سے وہ شادی جے سے کام میں بھی جلدی نہیں کرتا۔ کسی لڑکی کو دیکھ کر ایک دم لٹو ہو جانا اور چٹ منگنی پٹ شادی کرنے کی بجائے پہلے وہ اس سے بات چیت کرتا ہے پھر ایک دو سال اس کے ساتھ گھومتا پھرتا اور ایک ہی فلیٹ میں رہتا ہے اس کے بعد جب ایک دو بچے ہو جاتے ہیں اور اس کو بات پسند آتی ہے تو پھر وہ ہونے والی بیوی سے رائے پوچھتا ہے کہ سرکاری طور پر شادی کی رجسٹریشن کرائی جائے یا ہر ایک خود کو آزاد سمجھے۔

شادی کی بات نکلی ہے تو ے ہ بھی بتاتا چلوں کہ سوئیڈ مرد باقی یورپی مردوں سے نرالا ہے۔ وہ ہر وہ کام بہتر طرے قہ سے سرانجام دے سکتا ہے جو عورت ذات کر سکتی ہے۔ چولہے ہانڈے سے لے کر قمیص میں کاج بنانا! سچ تو ے ہ ہے کہ سوئیڈ مرد کو بیوی کے ہر کام میں ہاتھ بٹانا لازمی ہوتا ہے سوائے بچے کو دودھ پلانے کے کیونکہ ے ہی ایک ایسا کام ہے جو صرف ماں ہی کر سکتی ہے۔

ے ہاں سوئیڈن میں بچوں کو اسکول لے جانے کی ڈیوٹی ایک ہفتہ بیوی کرتی ہے تو ایک ہفتہ شوہر۔ بچوں کو کھانا کھلانا، ٹوائلٹ کے لئے لے جانا، پیمپر تبدیل کرنا، ہاتھوں سے یا مشین سے کپڑے دھونا عورت کے ساتھ مرد کا بھی کام ہے کیونکہ سوئیڈن جے سے ملکوں میں عورت اور مرد کا سماجی درجہ اور رتبہ برابر ہے۔

سوئیڈ خود کو حالات حاضرہ سے مکمل طور پر باخبر رکھنا چاہتا ہے اور ہر وقت مختلف معلومات حاصل کرنے کی کھوج میں لگا رہتا ہے۔ مثلاً ایٹمی ہتھیاروں کے اعداد و شمار جمع کرنا، تیسری دنیا کے مالی وسائل کو فروغ دے نے کے لئے ترکیب سوچنا، اس کرہ ٔ ارض کے سمندر اور ہوا کو بڑھتی ہوئی آلودگی سے پاک رکھنا، جنوبی افریقہ کی نسلی امتیاز کی کشمکش کو دور کرنا، سو ٔ پیری اور کھنکھ بورے جے سے کے ڑے مکوڑوں اور جانوروں کی جنسی زندگی بہتر بنانے کے طرے قے ڈھونڈنا وغیرہ۔ لیکن اس کے ساتھ وہ غیر اہم چیزوں کی طرف دھیان کم دیتا ہے اس لئے اسے کبھی بھی ے ہ خیال نہیں آتا کہ اس کا پڑوسی کون ہے، شراب پے نے سے نقصانات ہیں یا فوائد، بچوں کے سالانہ امتحانات ہو چکے ہیں یا ہونے والے ہیں وغیرہ۔ زیادہ تر سوئیڈ لوگ خود کو تندرست رکھنے کے لئے دیوانگی کی حد تک سرگرداں رہتے ہیں اور ان چکروں میں وہ چھٹی کا دن سڑکوں پر دوڑتے یعنی جاگنگ کرتے یا عمارت کے نے چے تہہ خانے میں زمین میں گڑھی سائیکل چلاتے برباد کر دے تے ہیں۔ تندرست رہنے کی فکر میں انہوں نے کئی چیزوں کا استعمال بند کر دیا ہے، مثلاً سگریٹ نوشی، کافی پینا، صبح کو دیر تک سونا اور اجنبی لوگوں کے سلام کا جواب دینا وغیرہ وغیرہ۔

سوئیڈ لوگوں کی سب سے بڑی اچھائی برابری کا احساس ہے۔ ہر سوئیڈ اپنے ہم وطن سوئیڈ کو برابر کا انسان سمجھتا ہے شاید اس لئے سارے سوئیڈ چند ذاتوں میں بٹے ہوئے ہیں جے سے کہ نِلسن، جانسن، سوین سن، پرسن وغیرہ۔ انکم ٹیکس دےنے کے بعد امیر اور غریب کی جیب میں برابر کا پیسہ بچتا ہے۔ فرنیچر خریدنے کے معاملے میں سارے سوئیڈ لوگوں کی ایک ہی پسند ہے۔ سب ایک جے سے کپڑے پہنتے ہیں۔ ےہ دوسری بات ہے کہ امیر لوگ پہلے اور غریب فیشن ختم ہونے اور سستا ہونے کے بعد پہنتے ہیں۔ سارے سوئیڈ ایک جیسا سوچتے ہیں۔ والوو (VOLVO) کار چلاتے ہیں اور بچے ہوئے "پیسے" اور "چھٹی کے دن" کھپانے کے لئے ہسپانوی جزےرے می یورکا (Majorca) کی طرف رخ اختیار کرتے ہیں۔

سوئیڈ آدمی ےہ ماننے سے ہمیشہ انکار کرے گا کہ اسے غیر ملکیوں کے ساتھ نفرت یا حسد ہے۔ اس کے لئے اس کے ملک میں آکر بسنے والے لوگ اےسے ہیں جے سے اس کے اپنے ہم وطن۔ اس کی کوکسی ترک، عرب، پاکستانی، ایرانی یا یونانی، سرب، اطالوی، پولش وغیرہ سے دوستی نہیں ہے لیکن اسے یقین ہے کہ اس میں اور غیر ملکیوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے سوائے اس کے کہ غیر ملکی افراد جنہوں نے اس کے خوبصورت ملک سوئیڈن میں سیاسی پناہ لے رکھی ہے، کے نام نرالے ہیں، رسم ورواج عجیب ہیں، جس انداز سے وہ بیڈ روم میں بیوی بچوں اور گھر کے ہر سامان کو ڈمپ کرتے ہیں وہ بیہودہ طرےقہ ہے اور سوئیڈ لوگ اس بات کو بھی ناپسند کرتے ہیں کہ ےہ غیر ملکی جو اپنی ملکوں میں ہونے والے مظالم سے بھاگ کر ےہاں آئے ہیں ہر وقت اپنے ساتھ چھرے اور پستول لے کر چلتے ہیں اور بات بات میں جھگڑے اور مار کٹائی کے لئے تیار ہو جاتے ہیں.... ان کے ملک کے بینکوں کو لوٹتے پھرتے ہیں، ملک کی سوشل سیکورٹی سے لی گئی خیرات پر گزارہ کرتے ہیں، خرگوشوں کی طرح اپنی نسل بڑھانے پر زور دےتے ہیں اور دےکھتے ہی دےکھتے دو سے چار اور چار سے سولہ بنتے جارہے ہیں۔ مقامی لوگوں کی ملازمتوں اور دھندوں پر ڈاکہ مارتے ہیں اپنی بیویوں کو جوتے مارتے ہیں اور منہ ٹیڑھا کرکے سوئیڈش زبان اےسے بولتے ہیں جے سے ان کے منہ میں اخروٹ پھنس گیا ہو۔

آخر میں ےہ بھی لکھتا چلوں کہ سوئیڈ کو سورج سے پیار ہے، قطار میں کھڑے ہونے سے نفرت ہے، سب سے پہلے بس میں چڑھنے پر خوشی ہوتی ہے، سردی کے موسم سے گھبراتا ہے، سیکس سے دلچسپی ہے۔ یوگوسلاویہ اور رومانیہ کے علاقوں سے آئی ہوئی جپسی عورتوں سے چڑ ہے، جو ڈاکٹر اسے بتاتا ہے اس پر یقین کرتا ہے، خدا کو نہیں مانتا، برف پر پھسلنے والے کھلاڑی اسٹین مارک انگمار کی پوجا کرتا ہے۔ اسے تھوڑا پےنے سے ہی نشہ چڑھ جاتا ہے۔ وہ اپنے ملک سے وفادار ہے (سوئیڈن کے پرچم سے اپنے لئے انڈر ویئر بناتا ہے) طلاق یافتہ بیوی اور بچوں سے قانون کے مطابق ہفتے میں دو مرتبہ ملنے جاتا ہے لیکن سال میں صرف ایک دفعہ یعنی کرسمس کی چھٹیوں میں اپنے والدین (اگر وہ زندہ ہوں

توان) کی خیریت پوچھنے جاتا ہے۔ انگریزی سے کھنے کے لئے شام کی کلاسز اٹینڈ کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے مضامین پڑھنے میں وہ اپنی ہتک محسوس کرتا ہے۔

تم مسلمان کے سے ہوئے؟

سوئیڈن کا سب سے بڑا شہر اور دار لحکومت اسٹاک ہوم ہے۔ دوسرے نمبر پر بڑا شہر گوتابرگ ہے۔ مالمو جہاں ہمیں دو سال رہنے کا موقع ملا اور جہاں (بندر گاہ ہونے کی وجہ سے) ہمارے بحری جہاز بھی آیا جایا کرتے تھے تے سرے نمبر پر ہے۔ آج سے تیس سال قبل کوئی 1971 میں جب بحری جہازوں کی ملازمت کے دوران میری ان علاقوں میں

آنے کی ابتداء ہوئی تو ان ملکوں یعنی ناروے، سوئیڈن، فن لینڈ وغیرہ میں مسجدیں تو کجا مسلمان بھی اکا دکا نظر آتا تھا۔ اگر نظر بھی آتا تھا تو وہ سیاحتی یا تجارتی وے زے پر آیا ہوتا۔ ان دنوں میں حالانکہ غیر ملکیوں کو ے ہاں ہمیشہ کے لئے رہائش بہت آسانی سے مل جاتی تھی لیکن ان سرد اور اندھے رے ممالک مین رہنا کوئی بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ ہر کوئی انگلینڈ، امریکہ میں رہنا پسند کرتا تھا۔ البتہ ڈنمارک کے شہر کوپن ہیگن میں کافی پاکستانی نظر آتے تھے جن میں زیادہ تر ٹیکسی ڈرائے ور تھے۔ آج بھی اسکینڈی نیویا کے ممالک میں سب سے زیادہ پاکستانی ڈنمارک میں ہیں اور کوپن ہیگن کے کئی ٹیکسی ڈرائیور آج بھی پاکستانی ہیں۔

اس وقت سوئیڈن میں سب سے زیادہ مسلمان مالمو میں رہتے ہیں جن میں ایشیا، افریقہ اور عرب ممالک کے علاوہ کئی یورپی ممالک کے مسلمان شامل ہیں۔ مثلاً ترکی اور آزار بائیجان، البانیہ، یوگوسلاویہ، بلغاریہ کے ہیں۔ کئی مسلمان تو جرمنی، بیلجیم، ہالینڈ، ڈنمارک اور اس ملک سوئیڈن کے گورے حضرات ہیں جو حال ہی میں یا ماضی قریب میں مسلمان ہوئے ہیں۔

مالمو شہر کے وسط میں دو تین چھوٹی چھوٹی مساجد ہیں جن میں ان علاقوں کے مسلمان باجماعت نماز ادا کرتے ہیں، جے سے کہ سوڈروان کے علاقے میں اہل تشیع افراد کی مسجد ہے۔ روزن گارڈ کے قریب عرب لوگوں کی بنائی ہوئی مسجد مشہور ہے۔ لے کن شہر سے باہر والی مسجد سب سے بڑی ہے جس میں شہر کے سارے مسلمان جمعہ یا عید کی نماز کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ اس مسجد کے پیش امام ترکی النسل ہیں۔ ہمارے مالمو چھوڑنے سے دو تین ماہ پیشتر مسجد کمیٹی نے بچوں کو مسجد میں قرآن مجید حفظ اور ناظرہ پڑھانے کے لئے ایک مولوی رکھا جس کا تعلق پاکستان کے صوبہ سرحد سے ہے۔ اس کے علاوہ دو تین پاکستانی عرب مولوی جن کے پاس سوئیڈن کے پاسپورٹ ہیں بچوں کو گھروں میں بھی قرآن مجید پڑھاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک مولوی ہمارے پڑوس میں رہنے والے ایک پاکستانی وزیر علی سومرو کے گھر میں اس کے بیٹوں یوسف اور یونس اور اس کی سوئیڈ بیوی کو قرآن پڑھانے آتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ے ہ مولوی صاحبان تعلیم یافتہ ہیں اور ان کا تلفظ بھی عرب لوگوں کی طرح ہے۔

سوئیڈن کا ے ہ جنوبی شہر اور بندر گاہ مالمو جغرافیائی طور پر ایسی جگہ پر ہے جہاں سال بھر کئی سیاح آتے رہتے ہیں۔ سوئیڈن کے باقی شمالی شہروں کی نسبت ے ہاں کا موسم بھی بہتر ہے اور ے ورپ کے ایک بہت مصروف اور کاروباری شہر اور بندر گاہ کوپن ہیگن سے اتنا قریب ہے جتنا مورو دادو سے یا جامشورو حیدر آباد سے بلکہ مالمو اور کوپن ہیگن کے لئے بہترین مثال توکیماڑی اور منوڑہ کی ہو گی کیونکہ کوپن ہیگن منوڑہ کی طرح جزیرہ ہے اور مالمو کیماڑی کی طرح ایک بڑے ملک کے آخری حصے پر ہے اور درمیان میں بالٹک کا سمندر ہے۔ جو بھی کوپن ہیگن آتا ہے وہ آدھے گھنٹے کا کشتی کا سفر کر کے مالمو بھی ضرور آتا ہے۔ جب کبھی علمائے کرام کوپن ہیگن آتے ہیں تو وہ بھی مالمو تشریف

لاتے ہیں یا ان کو مالمو آنے کے لئے مدعو کیا جاتا ہے اور مالمو کی مسجد میں ان کے وعظ کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ یہ کام مالمو کی مسجد کی انتظامیہ کمیٹی سرانجام دیتی ہے اور ملو میں رہنے والے مسلمانوں کو بذریعہ فون اطلاع دیتی ہے یا مختلف جگہوں پر نوٹس چسپاں کرتی ہے تاکہ اگر کوئی غیر مسلم بھی چاہے تو وعظ سن سکے اور ان علماء کے وعظ نہ صرف ہم جے سے لوگ دلچسپی سے سنتے ہیں بلکہ کئی غیر مسلم مقامی لوگ بھی آجاتے ہیں۔ ان مفتی حضرات علماء کرام میں بعض پاکستان، جنوبی افریقہ اور امریکہ کے بھی ہوتے ہیں۔ ان میں بعض نو مسلم بھی شامل ہیں جو تبلیغ اسلام سے متاثر ہو کر دائرہ اسلام میں آئے۔ اب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انہوں نے دین کے بارے میں اس قدر علم حاصل کر لیا ہے کہ وہ دنیا کے دیگر ممالک میں تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

اسے سے ہی ایک وعظ کے دوران اپنے قریب بیٹھے ایک غیر مسلم مقامی گورے (یورپی) سے میں نے دریافت کیا کہ وہ کس خیال سے وعظ سننے آتا ہے۔

"مجھے سکون سا محسوس ہوتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"سب کچھ ہوتے ہوئے بھی میں جانے کس چیز کی کمی محسوس کرتا ہوں۔" اس نے بتایا "میں ہر وقت ذہنی طور پر پریشان اور مایوسی کا شکار رہتا ہوں۔ اس قسم کے وعظ اور اسلامی باتیں سن کر مجھے سکون سا محسوس ہوتا ہے۔"

ان کے ایک مقامی دوست جو ماضی قریب میں ہی مسلمان ہوئے ہیں انہوں نے اسے اس قسم کے وعظ سننے اور اسلام کو سمجھنے کی تلقین کی ہے۔

مالمو (سوئیڈن) میں ہمارے علاقے کے بس اسٹاپ پر عبدالحلیم نامی بیس سالہ افریقی نوجوان سے میری اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ اس نے ہاں کی مقامی مسجد میں تقریباً دو سال قبل ہی اسلام قبول کیا تھا۔

"آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟" میں نے اسے سے پوچھا۔

"میں قومیت کے حساب سے سوئیڈش ہوں کیونکہ میں اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہوں جو سوئیڈش ہے مے رے والد امریکی نیگرو ہیں جن کے والد یعنی میرے دادا تقریباً نصف صدی قبل اپنا وطن گھانا (افریقہ) چھوڑ کر امریکہ جا بسے تھے جہاں مے رے والد پیدا ہوئے۔" عبدالحلیم نے بتایا۔

عبدالحلیم کی ماں جو کہ سوئیڈش ہے کچھ عرصے کے لئے امریکہ میں رہی تھی جہاں اس کی شادی عبدالحلیم کے والد سے ہوئی۔ اس کے بعد طلاق ہو گئی اور عبدالحلیم چھوٹا ہی تھا تو اسے اپنے وطن سوئیڈن لے آئی۔ اٹھارہ سال تک وہ اپنی ماں کے ساتھ رہا اس کے بعد ے ہاں کے دستور کے مطابق اب اپنے فلیٹ میں اکیلا رہتا ہے۔ نوکری نہ ہونے کی وجہ سے اسے حکومت کی طرف سے اتنا بے روزگاری الاؤنس مل جاتا ہے جس سے اس کا گذارہ ہو جاتا ہے۔ وہ اور

اس کے کچھ ہم عمر دوست کبھی کبھی تبلیغ کے لئے سوئیڈن کے دیہاتوں میں جاتے رہتے ہیں۔ ایک دن عبدالحلیم مجھے اپنے فلیٹ میں لے گیا۔ زمین پر جانماز بچھی ہوئی تھی دیوار پر کچھ آیات کی پینٹنگ تھیں۔ ٹیبل پر کئی کیسٹیں اور مذہبی کتابیں موجود تھیں۔

"آپ مسلمان کے سے ہوئے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"مے ری دوستی کچھ امریکی حبشیوں سے ہے جو مجھ سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے وہ مجھے ے ہاں کی جامع مسجد میں لے جایا کرتے تھے جہاں ہم باہر سے آئے ہوئے علماء کرام کے وعظ سنتے تھے۔ ان میں ایک امریکی حبشی مسٹر آدم بھی آتا تھا اور اب بھی آتا ہے۔ اس کی باتیں بے حد متاثر کرتی تھیں اور انہی کے کہنے پر میں مسلمان ہوا اور آج اللہ کا شکر ہے میں بہت خوش ہوں۔"

ے ہاں رہنے والے مقامی اور غیر ملکی لوگ آدم فلپ کا اکثر ذکر کرتے ہیں۔ وہ ایک سیاح تھا اور گھومنے کی خاطر ان ملکوں ناروے، سوئیڈن، ڈنمارک وغیرہ میں جب آیا تو کوپن ہیگن (ڈنمارک) میں اس کی ملاقات وہاں کی مقامی تبلیغی جماعت والوں سے ہوئی جن کی تبلیغ سے وہ مسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے دین اسلام کا بڑا مطالعہ کیا۔ آج وہ جہاں بھی جاتا ہے تو اسلام کے مختلف پہلوؤں پر لیکچر دیتا ہے۔ سوئیڈن بھی آتا ہے تو ے ہاں کی مقامی مسجد میں لوگوں کو اسلام کی باتیں بتاتا ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ میں اس کا ایک بھی لیکچر نہ سن سکا۔ لوگ بتاتے ہیں کہ اس کی آواز میں بہت ہی زیادہ سوز اور کشش ہے اور سننے والوں کے دلوں پر بہت گہرا اثر چھوڑتا ہے۔

عبدالحلیم نے کچھ کتابچے اور پمفلٹ دکھائے جو مسٹر آدم امریکہ سے بھیجتا رہتا ہے۔

مقامی گورے لوگ جو مسلمان ہوئے ہیں ان میں جو مرد حضرات ہیں ان کا پتہ مسجد میں ہی چلتا ہے اور خواتین حجاب (رومال یا روسری) سے ڈھانپ کر چلتی ہیں اس لئے پتہ چل جاتا ہے کہ ے ہ خواتین نو مسلم ہیں۔ ایک مقامی گورا جس کا واسطہ سائنس کے شعبے سے ہے اور کچھ عرصہ امریکہ میں ناسا جے سے کسی ادارے میں کام کر چکا ہے اس سے بھی میں نے ایک دن پوچھا کہ اس نے کے سے اسلام قبول کیا۔

"کیوں بھئی میں انسان نہیں ہوں؟" نجانے اس نے مے رے سوال یا مے رے تعجب کرنے سے کیا مطلب اخذ کیا۔

"نہیں مے رے بھائی میرا مطلب ے ہ نہیں تھا۔ ہمارے ملک میں کئی لوگوں کا ے ہ کہنا ہے کہ سائنس نہیں پڑھنی چاہے ے۔ ان کا خیال ہے کہ سائنس انسان کو مذہب سے دور کر دے تی ہے اور سائنسدان خدا کو نہیں مانتے۔ ے ہ سوچ کر میرا تعجب کرنا غلطی نہیں کہ ایک سائنسدان ہو کر آپ کو مذہب کا کے سے خیال ہوا کہ اس کائنات کو چلانے والا ایک رب جلیل ہے۔"

"ےہ سراسر غلط ہے کہ سائنس انسان کو مذہب سے دور کرتی ہے۔" اس نے مجھے سمجھایا۔"سائنس صحیح معلومات کا نام ہے اورےہ معلومات انسان کو صحیح راستہ دکھاتی ہے۔"

"وہ کےسے؟" میں نے دریافت کیا۔

"دےکھو ایک بچے کو ہوائی جہاز میں بیٹھ کر کیا پتہ کہ اس ہوائی جہاز کو اڑانا اور بنانا کتنا مشکل ہے اسے تو پرواز کرتے ہوئے جہاز میں بیٹھ کر بھی احساس نہیں ہوتا کہ جہاز محوپرواز ہے یاساکت ہے اور اگر محوپرواز ہے تو کتنی بلندی پر ہے اور اس کی کتنی رفتار ہے۔ لیکن ایک بڑے کو علم ہے کہ ےہ ہوائی جہاز اڑ رہا ہے بہت بلندی پر اور بہت تیز رفتاری سے لےکن ساتھ ہی اس کو ےہ بھی پتا ہے کہ اس جہاز کو اڑانے والا بھی کوئی ہے۔ اور اگر اس کو تھوڑا بہت ' کنکس، ایروڈانامکس اور Aviation یعنی فضائی سائنس کا علم ہے تو اسے اور بھی احساس ہو گا کہ ےہ مشین کتنی پیچیدہ ہے اور اس کو ایساویسا نہیں بلکہ قابل آدمی (پائلٹ) ہی چلا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک عام آدمی کو اتنا احساس نہیں ہوتا جتنا سائنس کا علم جاننے والے کو کہ زمین ےونہی ایک جگہ ساکت نہیں ہے بلکہ اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹے کے حساب سے گھوم رہی ہے۔ اور نہ صرف اپنے محور پر گھوم رہی ہے بلکہ اسے سے بھی تیز رفتاری سے 66 ہزار میل فی گھنٹے کے حساب سے سورج کے گرد بھی گھوم رہی ہے۔ ہوناتو ےہ چاہیے کہ اس تیز رفتاری میں ہم ایک سیکنڈ بھی نہ رک سکیں لیکن ےہ زمین کی کشش اور ہوا کے دباؤ کی وجہ سے ہم کچھ بھی محسوس نہیں کرتے۔ اس طرح کائنات مین اربوں کھربوں سیارے اور ستارے مختلف رفتاروں سے چل رہے ہیں لیکن مکمل حساب کتاب کے ساتھ۔ کیا ےہ سب کچھ جان کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ حرکت تو ہے پر محرک نہیں؟ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے کہ اتنی بڑی کائنات جس کی کوئی انتہا نہیں کا نظام اتنے مربوط طرےقے سے چل رہا ہے، بغیر کسی مالک کے چل سکے .... اور ےہی چیزیں ہیں جن کا سوچ سوچ کر مجھے یقین ہوا کہ ایک ایسی عظیم ہستی ضرور ہے جس نے ہمیں پیدا کیا ہے جو اس پیچیدہ نظام کو بڑی خیر خوبی سے چلا رہی ہے اور اس سلسلے میں پیدا ہونے والے سارے سوالوں کے جواب میں نے اسلام میں پائے جس کے بعد میں نے اسلام قبول کیا۔"

نماز نیند سے بہتر ہے

ڈنمارک کے بڑے شہر کوپن ہیگن میں کئی چھوٹی بڑی مساجد ہیں جن میں عالم دین وعظ کرتے ہیں۔ افغانستان کے سابق صدر مولانا مجدد الف یار بھی کسی زمانے میں کوپن ہیگن کی ایک مسجد کے پیش امام تھے۔ مالمو (سوئیڈن) میں رہنے والے ہمارے پاکستانی دوست مسعود ضیغم کی بیگم صاحبہ جو سوئیڈش ہیں مولانا مجدد الف یار کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے کی سعادت حاصل کی اور مسعود سے شادی کی۔

ایک دفعہ کوپن ہیگن کے مرکزی رے لوے اسٹیشن پر دو نوجوان خواتین نظر آئین جنہوں نے عربی لباس پہن رکھا تھا لیکن اپنے لمبے قد و شکل اور رنگ سے اسکینڈی نیوین (شمالی یورپ) کی لگ رہی تھیں یعنی رنگ دودھ کی طرح سفید تھا جبکہ آنکھیں ہرے رنگ کی تھیں۔ بالوں کے رنگ کا پتہ نہیں چل رہا تھا کیونکہ انہوں نے اپنا سر عربی اور ایرانی مسلمان عورتوں کی طرح ایک چوکور رومال (حجاب، روسری) سے مکمل طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ دونوں کا سوائے چہرے کے پاؤں تک باقی جسم برقعے نما کوٹ سے ڈھکا ہوا تھا جسے عربی میں عبایاہ کہتے ہیں۔

"کیا آپ مسلمان ہیں؟" میں نے ان سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" انہوں نے صاف انگریزی میں جواب دیا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کا تعلق کس ملک سے ہے۔"

"میں سوئیڈش ہوں۔ بحیرہ بالٹک کے اس پار مالمو میں رہتی ہوں میرا نام زینب ہے اور یہ میری سہلی مریم ہے جو ہے ہاں (کوپن ہیگن) کی ہے۔" ان میں سے ایک نے بتایا۔

"مالمو میں تو میں بھی رہتا ہوں آپ کہاں رہتی ہیں؟" میں نے زینب سے پوچھا۔

"روزن گراڈ کے علاقے میں اپنی بہن کے ساتھ رہتی ہوں۔"

"آپ کی بہن بھی مسلمان ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" زینب نے بتایا۔

"یہ کیوں؟"

"بس اس کا شاید اس طرف دھیان نہیں ہے۔ میری سہیلی مریم کی کئی عرب سہیلیاں ہیں جن کی دوستی اور اخلاق سے متاثر ہو کر ہم مسلمان ہوئی ہیں۔"

ہم سب کو ایک ہی ٹرین میں سرحد عبور کر کے پڑوسی ملک جرمنی کے شہر فلے زنبرگ جانا تھا۔ لہٰذا ٹرین کے آنے تک میں ان سے مذہب کے حوالے سے باتیں کرتا رہا۔ دونوں کوپن ہیگن کے کسی نرسری اسکول میں ٹیچر تھیں۔

"ان یورپی ممالک میں جہاں منی اسکرٹ پہن کر چلنا عام ہے۔ وہاں آپ اپنے جسم کو اس طرح ڈھانپ کر چلنے میں کیسا محسوس کرتی ہیں؟" میں نے ان سے پوچھا جس پر مریم نے کہا "میں ایسا کرنے میں بڑا فخر محسوس کرتی ہوں۔"

"آپ نماز پڑھتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ بالکل"

"کتنے وقت کی؟"

"کوشش تو ہم پانچ وقت پڑھنے کی کرتی ہیں" انہوں نے جواب دیا۔

"دے کھئے نا، ہم مسلمان کے گھر میں پیدا نہیں ہوئے لیکن اسلام کی ایک ایک بات اچھی طرح معلوم کر کے کافی سوچ سمجھ کر مسلمان ہوئے ہیں۔" زینب نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اگر آپ اجازت دیں تو ایک بات پوچھوں؟" میں نے کہا۔

"جی ہاں پلیز۔" مریم نے کہا۔

"نماز پڑھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ آپ کو کیسا محسوس ہوتا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"بالکل صحیح کہتے ہیں آپ" مالمو (سوئیڈن) میں رہنے والی زینب نے جواب دیا۔ "لیکن ایک مسلمان کے لئے نماز فرض ہے۔ کوئی ایسا ہے جسے نماز سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہو۔"

"میرا گھر مسجد کے قریب ہے۔" کوپن ہیگن میں رہنے والی نو مسلم مریم نے بتایا۔ "نماز فجر کی اذان میں جب الصلوٰۃ خیر من النوم (نماز بہتر ہے نیند سے) سنتی ہوں تو بے چین ہو جاتی ہوں اور چاہے کتنی کیوں نہ تھکی ہوئی ہوں یا سستی محسوس کر رہی ہوں لیکن یہ سن کر نماز کے لئے تیار ہو جاتی ہوں۔ بے شک نماز نیند سے بہتر ہے۔"

صرف دل کا دروازہ کھلا رکھ

اسٹاک ہوم میں ایک عرب دکاندار سے ملاقات ہوئی جس نے کئی برس سے سے ہاں رہائش اختیار کر رکھی ہے۔ ان کی بیوی سے ہاں کی مقامی سوئیڈش ہے جو مسلمان ہونے اور شادی سے پیشتر، بقول اس کے میاں کے، بہت ہی ماڈرن تھی۔ اسے ناچ گانے کا بھی بہت شوق تھا اور امیر ماں باپ کی بیٹی ہونے کی وجہ سے اس کا ہر پل پر تعیش گزرتا تھا۔ اور اب وہ اسلامی طرز کے لباس (عبایا) میں ہمارے سامنے کھڑی تھی۔ بالوں کو چھپانے کے لئے اس نے سر پر رومال (حجاب) باندھا ہوا تھا۔ اس نے لاطینی ادب میں گریجویشن کی ہے اور کچھ عرصہ کسی سرکاری ادارے میں مینجر کی سطح کی ملازمت بھی کر چکی ہے۔ شادی کے بعد اپنے عرب شوہر کے ساتھ مل کر دکان چلاتی ہے۔

"ایک سوال پوچھوں؟" میں نے کہا۔

"ضرور۔" اس نے جواب دیا۔

"تمہاری اتنی ماڈرن اور تیز زندگی میں سے وہ تبدیلی کے سے رونما ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

"جس زندگی کی آپ بات کر رہے ہیں اور جو لوگ محسوس کرتے تھے وہ میری ظاہری زندگی کی کیفیت تھی لیکن مے رے اندر کی کیفیت میں بے چینی اور بے سکونی تھی۔" اس نے کہا۔ "زندگی میں سب کچھ حاصل ہونے کے باوجود میں ہمیشہ ےہ محسوس کرتی تھی کہ سب کچھ پانے کے بعد بھی میں نے کچھ بھی نہیں پایا ہے، یعنی میں ہر وقت کسی چیز کی تلاش میں رہا کرتی تھی۔ ہمیشہ اس جستجو میں رہتی تھی کہ کوئی ایسا علاج ڈھونڈ نکالوں جو میری مایوسی اور پریشانی کو دور کر دے اور وہ صرف اسلام کے دائرے میں داخل ہو کر ہی حاصل کر سکی ہوں۔ اسلام وہ مذہب ہے جس میں میں نے اپنی تمام پریشانیوں کے حل پائے ہیں۔ اسلام مکمل نظام حیات ہے۔ آج میں اپنی زندگی میں سکون محسوس کر رہی ہوں۔ ظاہری طور پر تو میں ایک سادہ زندگی گزار رہی ہوں لیکن میں اس سے بہت خوش ہوں۔ ظاہر ہے دین کی راہ پر چلنے کے لئے انسان کو دوسرے راستے تو چھوڑنے ہی پڑتے ہیں تب جا کر اسے حقیقت کا علم حاصل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کی موجودگی کا یقین ہوتا ہے۔"

کچھ دیر رک کر اس نے ایک قصہ سنایا۔

"ایک بادشاہ کو خبر ملی کہ اس کے شہر میں ایک بہت ہی پہنچے ہوئے بزرگ آئے ہیں۔ بادشاہ نے اس سے ملنے کی کوشش کی لیکن اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ شہر کے کئی دروازے تھے بادشاہ کبھی کسی دروازے کے پاس تو کبھی کسی دروازے کے پاس اس بزرگ کا انتظار کرتا تھا۔ لیکن دوسرے دن پتہ چلتا تھا کہ وہ کسی اور دروازے سے چلے گئے۔ آخر کار بادشاہ نے ےہ کیا کہ شہر کے سارے دروازے بند کروا کے صرف ایک دروازہ کھلا رکھ کر ان کا انتظار کرنے لگا۔ جب ایک ہی دروازہ کھلا رہ گیا تو فقیر کا وہیں سے گزر ہوا۔ فقیر سے جب بادشاہ سلامت کی ملاقات ہوئی تو بادشاہ نے فقیر سے کہا۔ "آپ سے اب جا کر ملاقات ہوئی ہے جب میں نے شہر کے سارے دروازے بند کروا دے ئے۔" فقیر نے جواب دیا۔ "انسان کو رب کی راہ بھی اس وقت نصیب ہوتی ہے جب وہ سارے دروازے بند کر کے صرف ایک دل کا دروازہ کھلا رکھتا ہے۔"

وہیں پر ایک اور نو مسلم خاتون ملی جس نے بتایا کہ اس کا شوہر اسلام آباد میں کسی کثیر القومی فرم میں کام کرتا ہے اور وہ بھی اسلام آباد اکثر جاتی رہتی ہے جہاں اس نے اردو لکھنا پڑھنا سیکھا ہے۔ اس نے کہا کہ "عربی کے بعد اردو وہ زبان ہے جس میں بہت سی مذہبی کتابیں ہیں۔" وہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی لکھی ہوئی تفسیر "تفہیم القرآن" کی بہت تعریف کر رہی تھی جو ایک نو مسلم کو آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔

حضرت علیؓ تو مصافحہ کرتے تھے

سوئیڈن کے شہر مالمو میں جہاں ہم رہتے ہیں وہاں ایک دفعہ جنوبی افریقہ سے ایک عالم دین وعظ کرنے آئے۔ ان کے آباؤ اجداد کا تعلق پنجاب کے کسی دور دراز علاقے سے تھا اور وہ انگریزوں کے دور میں جنوبی افریقہ نقل مکانی کر گئے تھے اور اب وہیں کے شہری کہلاتے ہیں۔ مذکورہ عالم دین تبلیغ کے سلسلے میں پاکستان کے مختلف شہروں سے ہوتے ہوئے ے ہاں آئے تھے۔ انہوں نے اپنے وعظ میں ہمیں توحید اور شرک سے متعلق باتیں بتائیں۔ دوران وعظ انہوں نے اس بات کی نشاندہی کی کہ پاکستان میں زیادہ تر لوگوں کا ایمان اتنا کمزور ہے کہ وہ اپنی مرادیں اپنے رب سے مانگنے کی بجائے پیروں، فقیروں، قبروں اور تعویذوں سے مانگتے ہیں، جو شرک کی بدترین قسم ہے، جس میں جاہلیت اور کم علمی کی وجہ سے ہمارے مسلمان بھائی مبتلا ہوتے جارہے ہیں۔

"کفار مکہ اور ہم میں پھر کیا فرق رہ جاتا ہے؟" عالم صاحب نے اپنے وعظ میں ہمیں خبردار کیا کہ "صرف مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے سے ایک انسان مسلمان تو نہیں ہو جاتا! ہمیں پیروں کی مزاروں، قبروں، درگاہوں پر جاتے ہوئے دے کھ کر عرب ممالک کے مسلمان اور مغرب کے نو مسلم تعجب کرتے ہیں کہ ہم کس قسم کے مسلمان ہیں کہ شرک کرتے ہیں۔ شرک بہت بڑا گناہ ہے جو رب العزت کبھی معاف نہیں کرتا۔"

ہمارا ایک یورپی دوست ہے جو نو مسلم ہے اس سے پہلے وہ عیسائی تھا یا شاید یہودی بہر حال اسے پاکستان دے کھنے کا بہت شوق ہوا۔ ظاہر ہے پاکستان وہ ملک ہے جو اسلام کے نام پر بنا۔ مسلمانوں نے بڑی بڑی قربانیاں دے کر اس ملک کو حاصل کیا۔ پاکستان کے مسلمان ایک ہندوستان میں بھی رہ سکتے تھے لیکن وہ الگ ملک اس لئے چاہتے تھے کہ جہاں وہ آزادی سے اسلامی تعلیمات پر عملدر آمد کر سکیں۔ اسی لئے ہمارا ملک دنیا کے مسلمانوں کے لئے، خصوصاً نو مسلم کے لئے ایک مثالی ملک ہے۔ یا کم از کم وہ ے ہی سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسلام کے عین مطابق ہے۔ کئی لوگ اس کا مشاہدہ کرنے کے لئے پاکستان گھومنے آتے ہیں۔

بہر حال ہمارے نو مسلم یورپی دوست آخر کار سال کی چھٹیاں گزارنے پاکستان گیا۔ واپسی پر ایک دن اسے میں نے مالمو سے کوپن ہیگن جانے والی فیری میں پکڑ لیا۔

"یار اور سناؤ۔ کیا ہو آئے پاکستان سے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ہاں کوئی ایک ہفتہ ہوا ہے۔ میں خود بھی سوچ رہا تھا آپ سے ملنے کی لئے مگر مصروفیت کی وجہ سے وقت نہیں مل رہا تھا۔"

"چلوے ہ بتاؤ کی کیسا لگا ہمارا ملک؟" فیری کی ریستوران میں بیٹھتے ہی میں نے اس سے سوال کیا۔

وہ کچھ لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا۔ لگ رہا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ وہ جو میری سامنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، وہاں سے اٹھا اور ٹیبل کے پاس سے گھوم کر میرے قریب والی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

"یار بات تو سنو!" اس نے اپنائیت کا احساس دلاتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "اسلام قبول کرنے سے پہلے میں عیسائی تھا میرے تین خدا (مقدس باپ، بیٹا اور روح اقدس) تھے۔ اب ایک اللہ ہے لیکن آپ کے سے مسلمان ہیں جن کے تو صرف شہر کراچی میں سترہ خدا ہیں .... جن میں سے آٹھ تو ساحل سمندر پر ہیں۔ نہ جانے کن کن کو آپ لوگوں نے داتا بنا کر بٹھایا ہوا ہے کہ ے ہی دینے والے ہیں۔ لوگ ہیں کہ مسجدیں اور نمازیں چھوڑ کر ان کے آستانوں پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کو حاجت روا، فریاد سننے والا اور مشکل کشا سمجھ رہے ہیں۔"

اس دن جنوبی افریقہ سے آئے ہوئے عالم دین کی باتیں سن کر مجھے اس نو مسلم یورپی دوست کی باتیں یاد آ گئی تھیں۔

عالم دین صاحب جو پاکستان سے یہاں سوئیڈن پہنچے تھے انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ "آج کل پاکستان میں لوگوں کا ذہن اے ک اے سے آدمی کی طرف ہے جس کو "دھنا کے والا بابا" کہتے ہیں۔ بڑے بڑے آدمی اس کے معتقد اور مرید ہیں۔ وہاں ہیلی پیڈ بھی بنایا گیا ہے۔ اس سے پہلے سابقہ حکومت نے تین کروڑ روپے خرچ کر کے سڑک بھی تعمیر کرائی تھی۔ وہ کسی سے ہاتھ بھی نہیں ملاتا ہے صرف ڈنڈا آگے کر دیتا ہے۔ پاکستان کے لوگ یعنی وہ لوگ جو اس کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں یا ے ہ کہا جائے کہ جنہوں نے ڈرامے کر کے جاہل لوگوں کی نظروں میں اس عام آدمی کو دیوتا بنایا ہوا ہے، کا کہنا ہے کہ "پیر سائیں جس کو جتنے ڈنڈے مارتا ہے وہ اتنے سال ملک کا وزیر اعظم بنتا ہے۔" توبہ نعوذ باللہ! پھر ہمارا سارا کام گمانوں پر چلتا ہے .... اللہ بھی رسی ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے۔ دو ڈنڈے کھانے کے بعد جب اس کی ترقی دو سال بعد ہوتی ہے تو وہ سارا کرشمہ "دھنا کا والے بابا" کا سمجھتا ہے اور وہ اصل میں دے نے والے رب سے زیادہ "دھنا کے والے بابا" کی پوجا کرتا ہے۔

ایک صحیح قسم کا نوجوان مسلمان اس پیر کے پاس پہنچا تو پیر نے اس کے آگے اپنا ڈنڈا بڑھا دیا۔

نوجوان نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔ جناب اسلام علیکم۔ پیر بابا سمجھ گیا کہ ے ہ مختلف قسم کا آدمی ہے اور ے ہ سر پھرا میری پیری مریدی کے دھوکے میں نہیں آئے گا۔ اب تک تو اے سے ہی ایمان کے کچے لوگ آتے رہے۔ بہر حال اس نے دستور کے مطابق اپنے ڈنڈے کو آگے بڑھایا تا کہ ڈنڈا کھانے کے لئے نوجوان جھک جائے لیکن نوجوان نے اپنی ہی جگہ پر کھڑے ہو کر کہا:

'جناب عالی میں سلام کر رہا ہوں۔ السلام علیکم۔'

اس پر پیر بابا کے جو چیلے چمچے بیٹھے ہوئے تھے، وہ نوجوان کو سمجھانے لگے کہ 'بیٹے پیر بابا سے اے سے سوال جواب نہیں کرتے۔ دھنا کا بابا کے پاس علیؓ کا ڈنڈا ہے۔'

'ارے بھائی حضرت علیؓ تو بڑی شخصیت ہو کر لوگوں سے مصافحہ کرتے تھے اور مسلمانوں کے سلام کا جواب دیا کرتے تھے انہوں نے اسے ڈنڈا کیوں دے دیا ہے؟'

اس پر پیر کے پاس بیٹھے ہوئے چمچوں نے نوجوان کو ڈانٹتے ہوئے کہا: 'ابے او وہابی! پیر بابا تمہیں نابود کر دے گا، جا بھاگ جا یہاں سے۔'

اور اسے بھگا دیا۔

"مے رے دوستو! کفار مکہ بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے۔" جنوبی افریقہ سے آئے ہوئے اس علام دین نے اپنا وعظ جاری رکھتے ہوئے بتایا۔ "اور ہم لوگ انسانوں اور ان کی قبروں کو دیوتا بنا کر ان سے اولاد، صحت، نوکری، دولت، ترقی، کامیابی مانگتے ہیں اور ان کی پوجا کرتے ہیں۔ توبہ نعوذ باللہ! اے سے پیر، فقیر، ٹھگ درویش جو نہ روزہ رکھیں سڑک یا پارک گندا ہونے پر ایک ہزار ڈالر (چالیس ہزار روپے) جرمانہ ہے۔ سوئیڈن میں اخلاقی طور پر ہر سوئیڈش پر صرف ےہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ جب اپنے کتے کو سیر کرانے کے لئے نکلے تو اپنے ساتھ جیب میں پلاسٹک کی تھیلی ضرور لے چلے تاکہ اس کا کتا بغیر شیڈول کے ٹوائلٹ کرے تو وہ (یعنی مالک) تھیلی کو ہاتھ پر چڑھا کر اپنے کتے کے فضلے کو ایک دم اٹھالے اور کسی گلی کے نکڑ پر اس مقصد کے لئے رکھے ہوئے ڈبے میں ڈال دے۔

سوئیڈن میں مردوں سے زیادہ عورتیں کتا پالتی ہیں۔ بوڑھی عورتیں چھوٹے قد اور جسامت کے کتے پالتی ہیں جن سے وہ کھیلتی اور باتیں کرتی رہتی ہیں شاید احساس تنہائی مٹانے کے لئے۔ نوجوان عورتیں اور ٹین ایج لڑکیاں.... خاص طور وہ لڑکیاں جو کم آبادی والے علاقوں میں اکیلی رہتی ہیں بہت بڑے اور خوفناک شکل کے کتے پالتی ہیں۔ شاید اپنے بچاؤ کے لئے۔ لیکن ان کتے پالنے والی لڑکیوں اور بوڑھیوں میں ایک بات ضرور مشترکہ ہے کہ وہ اپنے کتے کو سیر کراتے وقت اپنے ساتھ پلاسٹک کی تھیلیاں لے چلتی ہیں اور بوقت ضرور وہ اپنے کتے کا فضلہ اٹھا کر سڑک کو صاف رکھنے میں نہ تو اپنی بے عزتی محسوس کرتی ہیں نہ اسے عیب سمجھتی ہیں۔

جس طرح پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہیں۔ اس طرح سوئیڈن کے سارے لوگ بھی ایک جے سے نہیں ہیں۔ کبھی کبھی اے سے لوگ بھی نظر آجاتے ہیں جو اپنے کتے کی گندگی نہیں اٹھاتے۔ ان میں سے ہولما کے بس اسٹاپ کی قریبی عمارت میں رہنے والی ایک موٹی عورت ہے۔ اس کے پاس دو کتے ہیں جن کو وہ روزانہ شام کو ایک بس اسٹاپ کے عقبی پارک میں سیر کے لئے لاتی ہے۔ اس عورت کو ہم نے کبھی بھی صفائی کا کام کرتے نہیں دے کھا۔ کبھی کبھی تو اس کے کتے بس اسٹاپ کے اس حصے کو بھی خراب کر دیتے ہیں جہاں ہم (ہولما کے علاقے کے لوگ) بس کا انتظار کرتے ہیں۔

"ے ہ عورت ے ہاں کی رہنے والی نہیں ہے۔یعنی سوئیڈش نہیں ہے۔" مے رے سوئیڈش پڑوسی نے مجھے ایک دن بتایا اور اس کے سر کے لال بالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔"ے ہ پولش ہے۔ تقریباً دس بارہ سال قبل پولینڈ چھوڑ کر ے ہاں آ بسی تھی۔ اب اس کے پاس سوئیڈن کی قومیت اور پاسپورٹ ضرور ہے لیکن افسوس کہ اس کی ذہنیت ابھی تک وہی ہے۔" اور پھر کچھ دیر سوچ کر کہنے لگا۔"اسی لئے تو ہم باہر سے آئے ہوئے لوگوں سے خائف ہیں۔ وہ ہمارے ملک سوئیڈن میں رہ کر ہمارے ملک کے فائدے اور سہولتیں تو حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن ے ہاں کے نظم و ضبط اور اصولوں کی پابندی نہیں کرنا چاہتے۔ اور اس طرح ہمارے خوبصورت ملک سوئیڈن کی پرانی قدروں کو مٹا رہے ہیں۔ مختلف ممالک سے آئے ہوئے ے ہ لوگ سوئیڈن کے لوگوں کو دیکھ کر ہر چیز کی چاہ تو کرتے ہیں مگر ذمہ داری اور فرائض سے بھاگتے ہیں، ملک کے قاعدے قانون کا احترام نہیں کرتے، اپنے پڑوسیوں اور شہر کے رہنے والوں کا خیال نہیں رکھتے۔"

بس کا ٹکٹ اور طلاق

سوئیڈن میں میاں بیوی کی علیحدگی کی صورت میں بچوں پر ماں کا حق ہوتا ہے، مرد کو ہر مہینے بچوں کی ماں کو عدالت کی معرفت اپنی تنخواہ کا مقرر کردہ حصہ دینا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ طلاق شدہ عورت کو حکومت کی طرف سے مزید الاؤنس بھی ملتا ہے جو اس کے علاوہ ہے جو ہر بچے کے لئے اسے دیا جاتا ہے۔ عورت کی اگر کوئی نوکری نہیں ہے تو اسے بیروزگاری الاؤنس بھی ملتا ہے۔ بچہ ہونے پر وے سے ہی گھر کا کرایہ کم ہو جاتا ہے لیکن طلاق کے بعد ے ہ کرایہ مزید کم ہو کر تقریباً نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو ے ہاں کے قانون کے مطابق طلاق کی صورت میں عورت کو ہر قسم کا فائدہ ملتا ہے۔ طلاق کے بعد میاں کو تین کپڑوں مین گھر چھوڑنا پڑتا ہے اور ایک سال تک شادی نہیں کر سکتا۔ بچے عورت کو ملتے ہیں اور اسے بچے ملنے کی خوشی ہو یا نہ ہو لیکن بچوں کے لئے حکومت سے اٹھارہ سال تک ہر مہ ہنے جو پے سے ملتے ہیں وہ اچھی خاصی رقم ہوتی ہے اور اس کے مقابلے میں ذمہ داری کچھ بھی نہیں کیونکہ حکومت نے تعلیم اور صحت کی مفت سہولتیں دے رکھی ہیں۔ بچوں کو حاصل کرنے کے لئے باپ بھی پورا زور لگاتا ہے لیکن بچے باپ کو صرف اس صورت میں ملتے ہیں جب وہ ثابت کر دے کہ بچوں کی ماں نشے کی عادی ہے اس لئے وہ ان کا خیال نہیں رکھ سکے گی یا ے ہ معلوم ہو جائے کہ بچوں کی ماں بدمزاج قسم کی عورت ہے اور بچوں کو مارتی پیٹتی رہتی ہے۔

غرض ےہ کہ بچوں کی تقریباً ساری ذمہ داری ےہاں کی حکومت پر ہے۔ جس کے جتنے زیادہ بچے ہیں اسے اتنے ہی زیادہ پے سے سوشل سیکورٹی کی طرف سے ملتے ہیں۔ ےہ الگ بات ہے کہ سوئیڈن کے لوگ بچے کم، اور کتے زیادہ پالتے ہیں۔ ہر سوئیڈش خاندان میں ایک ہی بچہ ہو گا بہت زیادہ ہوا تو دو ورنہ کئی اے سے خاندان بھی ملیں گے جن میں ایک بچہ بھی نہیں ہے۔ لیکن گزشتہ پندرہ بیس سال میں ایشیا اور افریقہ کے لوگ جو سیاسی پناہ لے کر ےہاں رہنے لگے ہیں، لگتا ہے کہ ان کا پسندیدہ مشغلہ بچے پیدا کرنا ہے۔ ان میں زیادہ تر لوگ کسی نوکری یا مزدوری کی تلاش تو نہیں کرتے لیکن زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ ایک عراقی عرب نے شرمندہ ہونے کی بجائے ہنس کر بتایا۔

”نوکری یا محنت مزدوری کے لئے کوشش کیوں کروں جب مجھے حکومت کی طرف سے گھر بیٹھے تین چار ہزار کرونے بے روزگاری الاؤنس مل جاتا ہے۔ نوکری میں مجھ جے سے ان پڑھ آدمی کو زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار کرونے ملیں گے یعنی ایک ڈیڑھ ہزار کرونوں کی خاطر اپنا آرام کیوں خراب کروں۔ چار بچے پیدا کر دے ئے ہیں جن کا الاؤنس مل جاتا ہے جس میں سے کچھ ہر مہینے اپنے ملک بھیجتا ہوں، خوب عیش بھی کرتا ہوں پھر بھی بچ جاتا ہے۔“

اس کے علاوہ اس شخص نے بتایا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ سال میں دو تین مرتبہ پولینڈ، ہنگری اور ترکی کے چکر لگاتا ہے جہاں سے وہ چوری چھپے وہ چیزیں ےہاں اسمگل کر کے لے آتا ہے جو ےہاں مہنگی ہیں جن کو بیچنے سے اس کی آمدنی اور بڑھ جاتی ہے۔ باہر کے ملکوں سے آکر ےہاں سوئیڈن میں رہنے والے اے سے کئی لوگ ملیں گے جن کو ےہاں آنے پر کسی دفتر میں نوکری یا کارخانے، فیکٹری میں مزدوری مل گئی ہوتی ہے لیکن اب وہ اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ وہ کسی طرح طبی طور پر ناموزوں قرار دے دے ئے جائیں تاکہ ان کو محنت مزدوری کرنے کی بجائے گھر بیٹھے تنخواہ ملتی رہے۔ کئی لوگ اس میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں اور ےہاں کے قانون کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دراصل ےہ چیزیں ایسی ہیں جن کو مقامی سوئیڈش لوگ پسند نہیں کرتے اور ہمارے غلط کاموں کی وجہ سے ان لوگوں کو ہم سے نفرت کرنا ایک فطری عمل ہو گیا ہے۔ ہماری ان ناجائز طرے قوں سے حکومت سے سہولتیں حاصل کرنے پر اب کئی چیزیں سب کے لئے بند ہو رہی ہیں جس پر مقامی لوگ غصہ کرتے ہیں کہ باہر کے لوگوں کے آنے سے ان کو نقصان ہو رہا ہے۔

ایک چیز جو غلط استعمال کی وجہ سے ہمارے سامنے بند ہوئی وہ بس یا گاڑی میں مفت سفر کرنے کی سہولت ہے۔ ےہاں کے قانون کے مطابق چار یا پانچ سال تک بچہ اپنی ماں یا باپ کے ساتھ ےہاں کی بس میں مفت سفر کر سکتا تھا۔ مے رے خیال میں سوئیڈن دنیا کا وہ واحد ملک ہے جہاں بس کا ٹکٹ سب سے مہنگا ہے۔ ےہ سمجھیں کہ صدر سے ٹاور تک ڈیڑھ سو روپیہ ہے جس میں چاہے آپ ایک کونے سے دوسرے کونے تک یعنی صدر سے ٹاور تک سفر کر لیں

یا صرف ایک یا دو اسٹاپ تک۔ فرض کریں آپ کو صدر سے ٹاور تک سعید منزل، جامع کلاتھ مارکیٹ، لائٹ ہاؤس اور بولٹن مارکیٹ میں بھی کام ہے تو ہر اسٹاپ پر اترنے کے بعد دوبارہ بس میں چڑھ کر آگے جانے کے لئے نیا ٹکٹ خریدنا ہوتا ہے۔یعنی اس حساب سے آپ کو پانچ دفعہ ٹکٹ لینا پڑے گا یعنی 750 روپے خرچ کرنا پڑیں گے جو دے کھا جائے تو کافی بڑا خرچہ ہے۔اب اس خرچے کو بچانے کے لئے ہمارے ایشیائی اور افریقی بھائیوں نے چھوٹے بچے کا سہارا لینا شروع کر دیا۔نوکری تو ہے نہیں بیروزگاری الاؤنس مل رہا ہے، وقت پاس کرنے کے لئے اور شہر میں یار دوستوں سے ملنے کے لئے بچے کی گاڑی (پرام) میں ہاتھ ڈالا اور چل پڑے۔ کبھی اس اسٹاپ پر اتر رہے ہیں کبھی اس پر۔ جب ماں نے شہر کی خوب سیر کر لی تو باپ نے بچے کو اٹھایا اور چل پڑا۔ دے کھتے ہی دے کھتے ان مفت خوروں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ پے سے دے کر سفر کرنے والوں کو بس میں جگہ ملنی مشکل ہو گئی کیونکہ بس کنڈیکٹر کو بس میں پہلے ان کو بٹھانا ہے جس کے پاس بچہ ہے۔اور یہ ہی خیال کیا جاتا ہے کہ ہو سکتا ہے بچے کی ماں یا باپ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہو۔دوسری طرف یہ ہوا کہ صبح شام بچے کو باہر نکالنے اور ادھر ادھر بھٹکانے سے سردی کی وجہ سے بچے نمونیا جیسی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے۔ اور علاج کے لئے حکومت کا خرچہ بڑھنے لگا۔ آخر کار حکومت کو یہ علم ہو گیا کہ ایشیا اور افریقہ کے لوگ اپنے چھوٹے بچوں کو ٹکٹ کے طور پر استعمال کر رہے ہیں اور بچوں کو ٹہلانے یا ڈاکٹر کے پاس اسپتال میں کسی ضروری چیک اپ کے لئے لے جانے کے بجائے خود سیر کر رہے ہیں۔ آخر ایک رات ہمارے ہوتے ہوئے حکومت کی طرف سے ٹی وی پر اعلان ہوا کہ یہ سہولت ختم کی جا رہی ہے، آج سے بچے کے لئے ٹکٹ تو نہیں ہو گا لیکن اس کے ساتھ سفر کرنے والے کو ٹکٹ لے نا ضروری ہے۔ سوئیڈش زبان تو ہمیں نہیں آتی کہ اس خبر کا ٹی وی یا اخبار سے ہمیں پتہ چلتا۔ دوسرے دن بسوں میں کالوں کے بچوں کی دھکم پیل نہ دیکھ کر تعجب ہوا اور پوچھنے پر پتہ چلا کہ حکومت نے نیا قانون نافذ کیا ہے جس کے تحت بچے کے والدین کو سفر کرنے کے لئے ٹکٹ خریدنا ہو گا۔ سچ پوچھیں تو اس سے مقامی لوگ تو کیا ہم بھی بہت خوش ہوئے۔ ایک تو بس میں بیٹھنے کی آرام سے جگہ ملنے لگی اور دوسری بات یہ کہ ہر بس اسٹاپ پر بس کا رکنا ختم ہو گیا۔ ورنہ ہر بس اسٹاپ پر ایک دو عورتیں بچوں کو لے کر مفت سفر کرنے کے لئے کھڑی رہتی تھیں جن کو اٹھانے کے لئے بسوں کا رکنا ضروری ہوتا تھا۔

سوئیڈش حکومت کی طرف سے اپنی عوام کی دی ہوئی سہولتوں میں سے ایک اور سہولت جس کو آج کل (خاص طور پر باہر سے آکر یہاں بسنے والے) لوگ جس ناجائز طریقے سے حاصل کر رہے ہیں مجھے خدشہ ہے کہ عنقریب یہ بھی سب کے لئے بند ہو جائے گی۔ یہ ہے طلاق کی صورت میں ملنے والا الاؤنس۔ طلاق کی صورت میں چونکہ عورت اکیلی ہو جاتی ہے۔ اس لئے اسے گھر چلانے میں مدد کی خاطر الاؤنس ملتا ہے۔ یہ الاؤنس اس الاؤنس کے

علاوہ ہے جو اسے بے روزگاری کی حالت میں ملتا ہے۔ بچے اکثر ماں کو ملتے ہیں جن کا بھی اچھا خاصا الاؤنس ہوتا ہے اور طلاق کی حالت میں بچے رکھنے کی وجہ سے اس کے گھر کا کرایہ بھی معاف ہو جاتا ہے۔

اب کیا ہو رہا ہے کہ کئی لوگ اس سہولت کو غلط استعمال کر رہے ہیں۔ سرکار سے مفت میں مزید پیسے حاصل کرنے کے لئے میاں بیوی رجسٹریشن آفس پہنچ جاتے ہیں اور اپنی شادی منسوخ کروا کر طلاق نامہ رجسٹر کراتے ہیں جس کی کاپی سوشل سیکورٹی والوں کو دے کر اسی مہینے سے طلاق کے الاؤنس لینا شروع کر دیتے ہیں۔

ہمارے علاقے میں مراکش کا ایک بس ڈرائیور رہتا ہے جس کو پاکستان کے تقریباً وہ سارے جہاز راں جانتے ہیں جو مالمو (سوئیڈن) میں دو دو سال گزارتے آئے ہیں کیونکہ یہ وہ ہم ایشیائی افراد کو کرائے پر گھر سے لے کر گھر کے لئے فریج ٹی وی وغیرہ سستا دلوانے میں مدد کرتا ہے۔ یہ وہ اپنی پولش بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ یہ لوگ کافی پیار محبت سے رہتے ہیں اور ہر روز محلے کے پارک میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سیر کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک دن اس نے مجھے فون کر کے اپنے گھر بلایا۔

"یار میں اپنا گھر شفٹ کر رہا ہوں اس سلسلے میں آپ کی مدد درکار ہے۔"

میں اس کے گھر پہنچا۔ میاں بیوی سامان کی پیکنگ کر رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ خوش گپیاں بھی چل رہی تھیں۔ میں بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہ گھر کا سارا سامان پیک کرنے کی بجائے چند چیزیں پیک کر کے ٹرک مین ڈال رہے تھے۔ میرے اصرار پر مراکش کے ڈرائیور نے مجھے رازدارانہ انداز میں بتایا کہ میاں بیوی کی طلاق ہو گئی ہے۔ یہ سن کر مجھے بہت تعجب ہوا اور جس وقت اس کی بیوی ہمارے لئے چائے بنانے گئی تو میں نے اس سے پوچھا کہ آخر کس بات پر ناراضگی ہوئی۔ "کل تک تو آپ خوش خوش تھے بلکہ ابھی بھی آپ لوگوں کی کسی بات سے ناراضگی کا اظہار نہیں ہو رہا ہے۔"

میرے بار بار پوچھنے پر وہ پریشان ہو گیا اور آخر کار باہر اکے لے سامان رکھتے وقت اس نے بتایا کہ اس کی بیوی بڑی جھگڑالو ہے۔ اس کا کردار بھی صحیح نہیں ہے اس لئے وہ دونوں ایک دوسرے سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ میاں جب ٹرک کے ساتھ سامان لے کر نئے گھر کی طرف روانہ ہوئے تو میں نے اس کی بیوی سے افسوس کا اظہار کیا۔ اس نے غم یا غصے کو ظاہر کرنے کی بجائے قہقہہ لگا کر کہا۔ "دراصل کچھ زیادہ پیسے کمانے کے چکر میں ہم یہ کر رہے ہیں؟"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"دراصل ہم لوگوں نے طلاق کا ڈرامہ کیا ہے، الاؤنسز حاصل کرنے کے لئے۔ جھگڑا وغیرہ کچھ نہیں اور اب ہمیں گھر بھی ایک کی بجائے دو مل گئے ہیں جن کا کرایہ بھی نہیں دینا پڑے گا۔ میاں اس گھر میں رہے گا میں بچوں کے ساتھ اس گھر میں۔"

"پھر بچوں کے بغیر وہ کے سے رہ سکے گا؟" میں نے پوچھا۔

"بس نام کے دو گھر ہوں گے کچھ سامان وہاں ڈال رہے ہیں۔ دن کو کبھی کبھی وہ ادھر جا کر رہے گا باقی وقت وہ ہمارے ساتھ رہے گا۔ اس نے بتایا۔

قارئین کی معلومات کے لئے یہ بتانا بے محل نہ ہو گا کہ سوئیڈن کا قانون طلاق شدہ جوڑے کو طلاق کے بعد بھی ایک دوسرے سے ملنے کے لئے ہمت افزائی کرتا ہے تاکہ کسی طرح صلح صفائی ہو جائے تو اچھا ہے اور فیملی میں اگر بچے ہیں تو اس صورت میں باپ کے لئے ضروری ہے کہ ہفتے میں دو تین دن بچوں کے ساتھ رہے تاکہ ان پر نفسیاتی اثر نہ پڑے۔ اب یہ قانون حکومت نے نیک نیتی پر بنایا ہے تاکہ بچھڑے ہوئے میاں بیوی پھر مل جائیں لیکن لوگوں نے اس کو بھی پیسے کمانے کا ذریعہ بنایا ہوا ہے اور طلاق رجسٹرڈ کرنے کے بعد بھی وہ اکٹھے رہتے ہیں یعنی حکومت کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں اور اس طرح سے پیسہ حاصل کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

ہے ہاں (مالمو) میں کئی مولوی صاحبان اور آئمہ مساجد نے مسلمانوں کے لئے فتویٰ صادر کر دیا ہے کہ ایسا کرنے سے مسلمانوں کی طلاق ہو جاتی ہے اور اس طرح حکومت سے رقم بٹورنا اسلامی نقطہ نگاہ سے حرام ہے۔ لیکن پھر بھی دیکھا جائے تو اس معاملے میں زیادہ ہمارے مسلمان بھائی ہی ملوث ہیں، چاہے وہ ایشیا کے عرب، ایرانی، یا پاکستانی ہوں یا افریقہ کے حبشی۔

ایک پاکستانی بڑے فخر سے بتا رہا تھا کہ وہ پڑھا لکھا نہیں ہے، نوکری بھی نہیں کرتا ہے پھر بھی گھر بیٹھے اسے ہر مہینے کوئی ایک لاکھ روپے مل جاتے ہیں۔ ہم نے اس کے تین بچوں کا حساب لگایا پھر بھی ایک لاکھ روپے نہیں بن رہے تھے پھر اچانک یہ راز بھی فاش ہو گیا۔ ایک دن مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں اپنے دو کمروں کا کتنا کرایہ دیتا ہوں۔

"کوئی ڈھائی ہزار کرونے۔" میں نے جواب دیا۔

"مے رے پاس ایک فلیٹ ہے آپ چاہیں تو اس میں شفٹ ہو جائیں میں کم کرائے پر دینا چاہتا ہوں۔" اس نے مجھ سے کہا۔

میں نے کہا کہ "سوئیڈن میں اب مے رے صرف چند ماہ ہی رہ گئے ہیں اس لئے میں شفٹ نہیں ہونا چاہتا۔ ہاں مے رے ساتھ کام کرنے والے سعودی عرب اور وینزویلا کے دو جہاز ران ہیں جن کی اگلے مہینے فیملی آ رہی ہے جس کے بعد وہ ظاہر ہے ہاسٹل سے شفٹ ہونگے۔ آپ چاہیں تو میں ان سے بات کروں۔" میں نے اس سے پوچھا۔

"ہاں ضرور کرلو لیکن ایک بات ان سے کہنا کہ کرائے کی رسید نہیں دے سکوں گا۔" اس نے بتایا۔
"پھر تو میرا کوئی بھی جہاز ران ساتھی کرائے پر گھر نہیں لے سکے گا کیونکہ جس بین الاقوامی ادارے نے ہمیں بلوایا ہے اور جو ہمارا خرچہ برداشت کرتا ہے اسے ہمیں ہر خرچے کی رسید دینی پڑتی ہے۔"
مے رے تعجب کرنے پر کہ وہ رسید کیوں نہیں دینا چاہتا ہے اور جب اسے اپنے رہنے کے لئے ہی گھر نہیں ہے اور جس فلیٹ میں وہ رہتا ہے وہ خود ایک قسم کا خیراتی ہے یعنی ے ہاں کی سرکار نے اسے بیروزگار اور بہت سارے بچوں کا باپ ہونے کے ناطے دیا ہوا ہے اس پر ے ہ دوسرے فلیٹ کا ہونا کیا مطلب رکھتا ہے؟ اس نے بات کو گول مول کرتے ہوئے بتایا کہ ے ہ دوسرا فلیٹ اس کے دوست کا ہے جو کچھ عرصے کے لئے جرمنی چلا گیا ہے اور جسے وہ کرائے پر چڑھانا چاہتا ہے۔
لیکن اس کا ے ہ جھوٹ زیادہ دن چھپ نہیں سکا۔ سوئیڈن چھوڑتے وقت پتہ چلا کہ ے ہ دوسرا فلیٹ بھی اس کا ہی تھا جس کا کرایہ بھی سرکار اسے دیتی ہے یعنی ان کو مفت میں ملا ہے کیوں کہ انہوں نے نہ صرف طلاق کی رجسٹریشن کرائی ہے پر عدالت سے کہہ کر تین بچوں میں سے ایک بچہ خود پالنے کے لئے بھی لیا ہے جس کی وجہ سے ان کو جو گھر ملا ہے وہ بھی تقریباً مفت میں ملا ہوا ہے اور اب چونکہ ے ہ سارے لوگ ایک گھر میں رہتے ہیں (کیوں کہ اندرونی طور پر طلاق ہوئی نہیں ہے) اس لئے ے ہ دوسرا فلیٹ کرائے پر دے کر کچھ اور پے سے کمانا چاہتے ہیں۔ اس طرح ہمیں پتہ چلا کہ ہر مہنے سرکار سے اتنے پے سے بٹورنے کے لئے اس نے کیا کیا طرے قے اپنا رکھے ہیں۔

نہ پڑھیں نماز، ان کے مرید اور مجاور ان کے نام نہاد پاکیزگی اور بزرگی کے قصے سادہ لوح عوام کو سنا کر انہیں اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔
"مے رے بھائیو پاکستان میں رہنے والے اس شخص کی کیا خوبی ہے؟ کیا وہ جماعت کے ساتھ پانچ وقت نماز پڑھتا ہے؟ کیا وہ راتیں جاگ کر رب العزت کی عبادت کرتا ہے؟ یا اس میں کوئی اور خوبی ہے؟ اس کے کسی خلیفہ نے جواب دیا کہ پیر کھاتا پیتا کچھ نہیں، میں نے کہا اچھا! اور....؟ کہنے لگے ساری ساری رات کھڑے کھڑے گزارتا ہے۔"
"میرے بھائیو بھوک نہ لگنا یا بلا مقصد کے ساری ساری رات جاگنا پاگلوں کی حرکتیں ہیں۔ ے ہ ذہنی بیماریاں ہیں۔ پاگلوں کو نہ نیند آتی ہے نہ ان بیچاروں کو بھوک لگتی ہے اور جو پاگل کھانے والے ہوتے ہیں وہ اتنا کھاتے ہیں کہ تعجب

ہوتا ہے۔ اور کس نے اسے لکڑی کی طرح کھڑے ہونے کو کہا ہے! ہمارے پیارے نبی کریم نے نماز کے لئے تو کہا ہے لیکن اس طرح کھڑے رہنے کے لئے تو نہیں کہا۔

"تومے رے دوستوے ہ کیا ہے! اے ہ سارے ڈرامے ہیں جن کے ذرے عے غریب اور سادہ لوح عوام کو لوٹا جاتا ہے .... اس جہاں کی دولت سے بھی تو دوسرے جہاں کی جنت سے بھی۔ ان کو قرآن اور سنت کی صحیح باتیں بتا کر سچا اور بے خوف مسلمان بنانے کی بجائے غلط راہیں اور شرک کے راستے دکھائے جاتے ہیں۔ پھر اللہ کا عذاب کیوں نہ نازل ہو۔ مے رے مسلمان بھائیو کچھ سوچو۔" مالمو (سوئیڈن) میں آئے ہوئے عالم دین ہم برصغیر سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں سے مخاطب تھے۔ "صرف مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے سے کوئی سچا مسلمان نہیں بن جاتا ہم لوگ اپنے آپ کو اسلام کا پیروکار کہتے ہیں لیکن ہمارے کام کتنے غلط ہیں ے ہی سبب ہے کہ جب ایک غیر مسلم حلقہ اسلام میں داخل ہوتا ہے تو اس کے اور ہمارے اعمال میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ے ہاں کے غیر مسلم یورپی، مسلمان ہونے کے بعد اسلام کی تو قدر کرتے ہیں لیکن ہمارے جے سے شرک کرنے والوں اور پیدائشی ٹھگ مسلمانوں سے دور رہتے ہیں۔"

اپنا اونٹ مضبوطی سے باندھو

ڈنمارک کے شہر آئس برگ میں تقریباً40 ممالک کے جہاز راں ربر کی کشتیاں(Life Raft) بنانے والی ایک فیکٹری میں ہفتہ بھر کے لئے مہمان تھے۔

مذکورہ فیکٹری میں سمندر میں طوفان آنے یا جہاز میں آتشزگی کے نتیجے میں انسانی جانوں کے بچانے کے لئے استعمال کی جانے والی اشیاء یعنی لائف جیکٹ، لائف ریفٹ وغیرہ بنتی ہیں۔ لائف ریفٹ ربر کے غبارے کی طرح ہوتا ہے جس میں ضرورت کے وقت ہوا بھری جاتی ہے۔ ہوا کے لئے اس کے ساتھ کاربن ڈائی آکسائیڈ کا سلنڈر ہوتا ہے جس کے سرے پر بندھی رسی کھینچنے سے بوتل کا منہ کھل جاتا ہے اور گیس لائف ریفٹ میں داخل ہو کر اس کو پھلا دیتی ہے جس میں تقریباً آٹھ دس آدمی بیٹھ کر سمندر میں اپنے ڈوبتے یا جلتے ہوئے جہاز کو چھوڑ کر اپنی جان بچا سکتے ہیں۔ مذکورہ فیکٹری کے مالکان نے جو کئی برس سے اس قسم کی چیزیں بنا رہے ہیں اپنے اس نئے قسم کا ریفٹ دکھانے اور اسے دنیا بھر میں متعارف کرانے کے لئے ہمیں بلایا تھا تاکہ ہم لوگ اس کی کارکردگی کو دیکھ سکیں اور اپنے ملک کے جہاز رانوں کو اس کی ترکیب استعمال بتا سکیں جو ساخت میں بقول اس فیکٹری والوں کے، بہت مضبوط، وزن میں ہلکا اور قیمت میں سستا ہے۔

دو تین دن اس ریفٹ کی کلاس روم میں تھیوری اور فیکٹری میں کنسٹرکشن دے کھنے کے بعد آج پریکٹس کے لئے سمندر پر جانا تھا۔ ہمیں لائف ریفٹ لے کر کسی جہاز میں بیچ سمندر(Baltic Sea) میں جانا تھا۔ وہاں پر ہر گروپ کو اپنا لائف ریفٹ اتارنا تھا۔ ہر گروپ میں آٹھ آٹھ لوگ تھے۔ ہمارے گروپ میں ایشیا کے سات ممالک بنگلہ دیش، یمن، پاکستان، اردن، مصر وغیرہ کے تھے۔ ایک فرانس کا مقامی گورا تھا جسے میں اپنے اس گروپ میں کھینچ لایا تھا کیونکہ اس کا کافی عرصے سے ان چیزوں سے واسطہ رہا ہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ہمیں کنارہ چھوڑنا تھا لیکن جہاز کے آنے میں ابھی دو تین گھنٹے تھے اس لئے ہمیں وقت ضائع کرنے کی بجائے ایک دفعہ پھر لائف ریفٹ کو دے کھنے کے لئے کہا گیا۔ یہ ہم نے دیکھا کہ مے رے گروپ کے لوگ موقع سے فائدہ اٹھا کر لائف ریفٹ کی مختلف چیزیں اور ان کے استعمال کا طریقہ ایک بار اور دے کھنے اور سے کھنے کے لئے قطعی تیار نہیں تھے۔ خصوصاً یمن کا انجینئر محمد مبارک تو لگتا تھا کہ اپنا ملک چھوڑ کر ے ہاں ے وہ چیزیں سے کھنے کی بجائے صرف اور صرف بئیر پینے کے لئے آیا ہو۔ جیسے ہی اسے پتہ چلا کہ جہاز کے آنے میں دو تین گھنٹے دیر ہے تو اس نے دو تین ڈبے بئیر کے منگوا لئے جن کو دیکھ کر بنگلہ دیش کے کیپٹن حبیب نے مجھے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا: "مارے گئے، موسم خراب ہے، سمندر خراب ہوتا جا رہا ہے، سخت سردی ہے اور اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے، ان حالات میں اپنی جان تو بچانا ہے ہی، اس موٹے یمنی کو بھی کندھوں پر اٹھانا پڑے گا جس نے ابھی سے لڑکھڑانا شروع کر دیا ہے۔"

اتنے میں فرانس کا گورا جہاز راں ایک لائف ریفٹ کو کھینچ کر لایا تا کہ اس کو کھول کر ایک ایک چیز کو چیک کریں اور سمندر میں افراتفری کی حالت میں پریشانی نہ ہو لیکن کوئی بھی اس کی بات سننے کے لئے تیار نہ تھا، نہ یمنی نہ مصری بلکہ سب آنکھوں آنکھوں میں مجھے ڈانٹنے لگے کہ اس غیر کو اپنے گروپ میں کیوں لے کر آیا۔ یعنی ہم ایشیائی تو ٹھہرے ایک ہی محلے کے ےہ فرانس کا گورا جس کا تعلق یورپ سے تھا ایک غیر ٹھہرا، اور کام کی بات تو ہم ایشیائی لوگ کسی بھی صورت میں سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ فرانسیسی گورے نے ایک دفعہ پھر سمندر اور موسم کے حالات سے خبر دار کر کے ہمیں جان بچانے والے ریفٹ پر کام کرنے کے لئے مشورہ دیا۔ "دیکھیں ہمیں جان بچانے کے لئے اس ریفٹ کو کھولنے، اس میں اندر ترتیب سے بیٹھنے، سمندر میں اتارنے اور جہاز سے دور لے جانے کے لئے طرے قے کار سے کھنے کی مشق کرنی چاہیے۔"

اس کے زور دے نے پر ہم نے وہی بہانے بازی شروع کر دی جو اکثر ہم مسلمان قسمت اور مذہب کی آڑ میں کرتے ہیں۔

"چھوڑیں جی! جب جہاز کو ڈوبنا ہو گا تو دیکھا جائے گا۔" ہم میں سے ایک نے کہا۔

"جہاز ڈوبے یا نہ ڈوبے۔ ےہ لوگ (فیکٹری والے) ہمیں سمندر میں ضرور نے چے اتاریں گے۔" اس یورپی نے ہمیں خبر دار کرتے ہوئے کہا۔ "اور پھر رات کے اندھے رے اور افراتفری میں لائف ریفٹ صحیح طرح نہ کھول سکے تو....؟"

اس پر ہم نے مزید مکالمے سنا کر اسے اس کی ضد سے ہٹانے کی کوشش کی۔ "ہم مسلمان ہیں اور ہمارا عقیدہ ےہ ہے کہ ہر ایک کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے لہٰذا جب ہماری موت آئے گی تو اسے کوئی روک نہیں سکے گا۔"

فرانسیسی گورے نے طنزیہ مسکراہٹ اپنے لبوں پر لا کر ہم سے کہا: "مجھے پتہ ہے کہ آپ لوگ مسلمان ہیں جو چیز آپ نہیں جانتے وہ ےہ کہ میں بھی مسلمان ہوں۔ میرا مذہب بھی اسلام ہے۔ فرق صرف ےہ ہے کہ میں اسلام کا مطالعہ کر کے مسلمان بنا ہوں جو آپ لوگوں نے شاید اتنا نہیں کیا ہے۔" فرانسیسی گورے کے منہ سے ےہ باتیں سن کر ہم حیرت کے مجسمے بن گئے۔ ےہ تو ہمیں معلوم تھا کہ آج کل یورپ کے کئی گورے مسلمان ہو گئے ہیں۔ خصوصاً فرانس کے لوگ جو ہر جگہ مسجد میں بھی نظر آتے ہیں لیکن ےہ معلوم نہیں تھا کہ ہمارے ساتھ جو فرانسیسی جہاز راں ہے وہ بھی مسلمان ہے۔ مبارک جو بئیر کے بڑے بڑے گھونٹ بھر رہا تھا اس نے بیئر کے باقی ڈبے صوفے کے نے چے چھپا لئے۔ وہ سمجھ گیا کہ جو نیا مسلمان بنتا ہے وہ شراب جیسی چیز سے خود تو دور رہتا ہی ہے بلکہ کسی اور مسلمان کو بھی اس قسم کی غلط حرکتیں کرتے نہیں دے کھ سکتا۔

"میرا بھی اس پر یقین کامل ہے کہ ہر انسان کی موت کا وقت معین ہے۔" اس فرانسیسی گورے نے کہا۔ "لیکن ہمیں اپنی جان کی حفاظت بھی تو کرنی چاہیے۔ ہر کام صحیح طرح انجام دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے بعد نتائج کے لئے اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد ضرور سنا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ پر یقین کرو اور ساتھ ساتھ اپنے اونٹ کو بھی مضبوطی سے باندھ کر رکھو۔"

یہ سن کر ہمیں بہت شرمندگی ہوئی لیکن دے کھا جائے تو ہماری اس قسم کی سوچ ہماری شفاعت بن چکی ہے۔ کسی بچے کو پڑھنے کے لئے کہو تو جواب دے گا قسمت میں پاس ہونا ہو گا تو ہو جاؤں گا۔ یعنی محنت نہیں کرنی۔ بچے تو کیا بڑے بھی ہاتھ پاؤں مارنے کی بجائے قسمت اور نصیب پر تکیہ کئے بیٹھے رہیں گے۔ کئی ایسے ملیں گے جن کو نماز روزے کے لئے کہو تو جواب دینگے اگر قسمت میں جنت لکھی ہو گی تو مل جائے گی۔ اچھی کھیتی باڑی کے لئے کسی کسان یا زمیندار سے بات کرو تو یہی کہے گا۔ "جو نصیب میں ہو گا مل جائے گا۔" صحیح ہے لیکن اسے سے ہوتا تو شاہ لطیف کبھی بھی یہ نہیں کہتے کہ "سلطانی سہاگ (کامیابی) نیند سے حاصل نہیں ہوتی یا "محنت کرو چاہے گرمی ہو یا سردی۔ نہیں ہے وقت آرام کا۔"

غریب کہاں جائیں

سوئیڈن کی ورلڈ میری ٹائم یونیورسٹی کے معاشیات کے پروفیسر کیپٹن الڈرٹن نے ایک دن لیکچر کے دوران بتایا کہ جہازوں کی سلامتی اور سمندروں کو صاف ستھرا رکھنے کے لئے جہازوں کو دو تلے (Double Bottoms) تو پہلے ہی تھے اب جہازوں کے بیرونی ڈھانچے (Hull) بھی دوہوا کریں گے۔

شروع کے بحری جہازوں کو صرف ایک تلاّ (Bottom) ہوتا تھا اور جہاز کو نیچے سے کوئی چیز لگنے سے یا جہاز سمندر میں موجود کسی پہاڑی پر چڑھ جانے سے اس کا تلاّ جے سے ہی پھٹتا تھا تو جہاز میں موجود ڈامر جیسا لاکھوں ٹن تیل یا دوسرے کیمیکل جہاز سے نکل کر سمندر اور اس کے ساحل کو خراب اور زہریلا بنادےتے تھے، اس کے علاوہ سمندر کا پانی جہاز میں بھر جانے سے جہاز ڈوب جاتا تھا۔

پچھلی صدی کے آخر میں اماکو کیڈیز اور ایکسون جے سے جہازوں کے تلوں کی بجائے ان کے بیرونی ڈھانچے (Hulls) پھٹ گئے اور ان میں موجود لاکھوں ٹن تیل سمندر کو خراب کرتا ہوا کناروں تک پہنچ گیا جس کے باعث ان علاقوں کی ساری مچھلیاں اور دوسری سمندری مخلوق مر گئی یا کھانے کے قابل نہ رہی۔ اس پے شے سے وابستہ اس علاقے کے مچھیرے بے روزگار ہو گئے اور ان کو روزگار کی خاطر دربدر ہونا پڑا، سمندری کنارے خراب ہونے کی وجہ سے لوگوں کا تفریح کے لئے آنا بند ہو گیا اور ملک کی سیاحت کی وجہ سے جو کمائی ہوتی تھی وہ بھی بند ہو گئی۔ اے سے حادثوں کو دھیان میں رکھ کر سمندروں اور جہازوں سے واسطہ رکھنے والا عالمی ادارہ (جس کا ہیڈ کوارٹر لندن میں ہے) ےہ قانون نافذ کیا ہے کہ آئندہ جہازوں کے مالکوں کو نئے جہاز دوہرے تلوں (Double Bottoms) اور دوہرے ڈھانچوں (Double Hull) والے بنانے پڑیں گے۔

اس نئے قانون پر کئی ممالک نے، خصوصاً ایشیا اور افریقہ کے غریب ملکوں نے کافی اعتراض کیا کہ لوہا اور مزدوری بہت مہنگی ہے۔ عام جہاز بنوانے پروے سے ہی بڑے اخراجات آتے ہیں اور اب ہر جہاز کا ڈبل باٹم بنانے کے ساتھ ڈبل ہل (Hull) بنانا غریب ممالک کے لئے مزید پریشانی کا باعث بنے گا۔ بہر حال یورپ، امریکہ، جاپان اور آسٹریلیا جے سے امیر ممالک نے نہ صرف اس قانون پر رضامندی کا اظہار کیا ہے کہ وہ اپنے جہاز نئے قانون کے مطابق بنائیں گے بلکہ ےہ اعلان بھی کیا ہے کہ وہ اپنی بندرگاہوں پر صرف ان جہازوں کو آنے کی اجازت دیں گے جو Double Bottom اور Double Hull والے ہوں گے۔

"No Oh!.!" برطانوی پروفیسر کی بات سن کر یمن کے پورٹ انجینئر محمد مبارک نے ٹھنڈی آہ بھری اور پروفیسر صاحب سے کہا "ےہ کس قدر ناانصافی ہے غریب ممالک کے ساتھ! ابھی تو ہمارے غریب ممالک جا کر سنبھلے ہیں

اور قرضے لے کر جہاز خریدے اور ہمیں بڑی مشکل سے جہاز رانی کی تربیت دی تو اب ایک ایسا قانون بنا دیا گیا جس پر عملدرآمد ان کے لئے تقریباً ناممکن ہے دوسرے لفظوں میں ہمیں اپنے قدم جمانے کا موقع دے نے کی بجائے ہمارا جینا دو بھر کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے جن لوگوں نے بھاری قرضے لے کر جہاز خرے دے اب انہیں مزید قرضے لے کر اپنے جہاز نئے قانون کے مطابق بنانے پڑیں گے اور اس کے لئے انہیں باربرداری کے کرایوں میں بھی اضافہ کرنا پڑے گا جس کا تمام تر بوجھ عوام پر پڑے گا۔" پروفیسر الڈرٹن نے مبارک کی ےہ غصے سے بھری تقریر سنی اور اس کی تائید کی کہ وہ واقعی ےہ قانون ترقی پذیر ممالک کے لئے ناانصافی ہے اور اس اقدام سے غریب ممالک کے لئے جہاز رانی تقریباً ناممکن ہو کر رہ جائے گی۔

"کالا دھواں نہیں نکلنا چاہے ے۔ انسانی فضلہ سمندر میں خارج کرنے کی بجائے تین دن Plant سے Sewage گزارنا چاہے ے تاکہ اسی میں پائے جانے والے جراثیم کا خاتمہ کیا جا سکے۔ جہاز کے اسٹور روم اور گودام اے سے صاف ہونے چاہئیں کہ ایک بھی کیڑا نظر نہ آئے۔ کیپٹن اور چیف انجینئر سے لے کر ہر خلاصی کو آگ بجھانے، سمندر میں اپنی جان بچانے اور جہاز ڈوبتے وقت کشتیاں نے چے اتارنے وغیرہ کے مختلف کورس کرنے چاہئیں۔ جہازوں کے مالکان کو اپنے جہاز چلوانے کے لئے حاتم طائی والے سات ناممکن سوالات پورے کرنے پڑتے ہیں پھر بھی جیت یورپ اور امریکہ کی ہی ہوتی ہے۔" مبارک نے جذباتی ہو کر کہا۔

"جہاز رانی کے کاروبار کے قوانین یورپ نے وضع کئے ہیں۔" پروفیسر نے ہمارے غم اور غصے کو بجا قرار دے تے ہوئے کہا۔ "اور انہوں نے کچھ ایسے قوانین بھی بنائے ہیں جن پر صرف یورپ کے امیر جہاز مالکان ہی اپنے جہاز چلا سکتے ہیں اور کچھ قوانین تو اے سے ہیں جو سمجھ سے بالاتر ہیں اور شفاف نہ ہونے کی وجہ سے غیر یورپی، یعنی غریب ایشیائی یا افریقی لوگ بازی جیت ہی نہیں سکتے۔"

جھگڑا روٹی کا ہے

سوئیڈن کی ورلڈ میری ٹائم یونیورسٹی میں ایک معمر بھارتی پروفیسر کیپٹن وانچد یسور بھی ہیں۔ ایک مرتبہ جہازوں پر کارگو بحفاظت چڑھانے کے سلسلے میں لیکچر دیتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ جاپان مختلف ممالک سے کیکڑے درآمد کرتا ہے جو سارے ممالک سے ڈبوں میں بند ہو کر جاتے ہیں سوائے بھارت کے۔ بھارت والے جن ڈبوں میں کیکڑے بند کرتے ہیں وہ بغیر ڈھکن کے ہوتے ہیں۔

ان سے جب اس کا سبب پوچھا گیا تو بھارتی درآمد کنندہ نے بتایا کہ ڈبوں کے ڈھکن بند کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بھارتی کیکڑا اور آدمی اپنے ہم ذات کو کبھی اوپر چڑھنے نہیں دیتا۔ کوئی اوپر چڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو نیچے کے حصے میں موجود کیکڑے اوپر والے کی ٹانگ کھینچ لیتے ہیں جس کے باعث وہ دھڑام سے نیچے آگرتا ہے۔

یہ بات سننے کے بعد بنگلہ دیش سے آئے ہوئے کیپٹن حبیب نے کہا "ہمارے ملک کے لوگوں کا بھی یہی حال ہے"

"ایشیا اور افریقہ کے تقریباً سارے ممالک کا یہی حال ہے۔" مصر سے آئے ہوئے کیپٹن حنفی نے کہا۔ "یورپ میں ایسی کھینچا تانی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" یمن کے پورٹ انجینئر مبارک نے اس فارمولے کو ماننے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔ "یورپ والوں کی ایک تو آبادی کم ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ ان کے پاس کھانے پینے اور آسائش کے لئے اتنا ہے کہ ہر ایک کو اپنا حال اور مستقبل اچھا گزرتا نظر آتا ہے اس لئے وہ دوسرے کی پلیٹ میں نظر نہیں ڈالتے۔ یہ سارا چکر معاشیات

کا ہے یورپ والوں کے پاس اتنا کچھ ہے کہ ہر ایک کو ضرورت سے زیادہ مل جاتا ہے اگر ان کی حالت بھی ہمارے ممالک کے لوگوں کی طرح ہو جائے تو ے ہاں بھی ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔"

جرم و سزا

سعودی عرب میں مجرموں کو اسلامی نقطہ نظر کے مطابق سزائیں دی جاتی ہیں۔ اس حوالے سے مغربی میڈیا کبھی کبھی اے سے غلط انداز میں بیان کرتا ہے جیسے دنیا کی تمام برائیاں سعودی عرب میں ہی ہوں اور وہاں کی حکومت ظالم اور وحشی قسم کی ہو۔ کسی چور کا ہاتھ کاٹنے یا کسی مجرم کو سر عام کوڑے لگنے کی خبر اخبار میں چھپنے پر کئی یورپی جہاز ران دوست ہمارے ساتھ رہنے والے سعودی باشندوں کو ٹوکتے رہتے ہیں۔ سعودی عرب سے آئے ہوئے نیوی اور مرچنٹ نیوی کے سارے افسر ایک تو بہت شرمیلے ہیں اور دوسری بات ے ہ کہ ان کی انگریزی بہت کمزور ہے اس لئے کسی کے طعنے دینے یا بحث کرنے کے جواب میں وہ ہمیشہ خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ البتہ یمن کی بندر گاہ کا انجینئر محمد مبارک جو ہر بات میں خدائی فوجدار بنا پھرتا ہے سعودیوں کی خاطر اپنے یورپی دوستوں کو جواب دیتا رہتا ہے کہ اس قسم کی سخت سزاؤں سے معاشرے میں جرائم کم ہو جاتے ہیں۔ مبارک کی اس بات پر سنگاپور کا ایک کیپٹن ہمیشہ اس کی حمایت کرتا ہے۔

ایک دن مبارک نے مجھ سے پوچھا۔ "یار اپنا سنگاپوری کیپٹن جو چینی نسل کا ہے اور مسلمان بھی نہیں ہے مگر ہمیشہ اپنی طرف داری کرتا ہے! معلوم نہیں کیوں"

"اس لئے کہ اس کے ملک سنگاپور میں بھی ہر جرم کی سخت سزا ہے۔" میں نے اسے بتایا۔ منشیات رکھنے، بے چنے، خریدنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے پر سزائے موت تو دی ہی جاتی ہے لیکن معمولی گندی عادت پر بھی بھاری جرمانے اور کوڑوں کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ راستے میں چلتے ہوئے یا ٹرین یا بس میں تھوکنے یا کاغذ پھینکنے پر بھی 500 ڈالر جرمانہ دینا پڑتا ہے۔ بالائی منزل سے کچرا نے چے پھینکنے پر پہلی مرتبہ جرمانہ دینا پڑتا ہے جبکہ دوسری مرتبہ فلیٹ سے ہی ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ سخت سزاؤں کی وجہ سے سنگاپور کے عوام سیدھے ہو گئے ہیں ورنہ سنگاپور جیسا جزیرہ جہاں تامل، ملے ئی، یورپی اور چینیوں جیسی ٹیڑھی قومیں رہتی ہیں ان کو سیدھا رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ سخت سزاؤں کے خوف سے حالت ے ہ ہے کہ آپ کا بٹوہ سڑک پر گر جائے تو مجال ہے کہ کوئی اسے اٹھالے۔ واپس آکر آپ وہاں سے اٹھا سکتے ہیں یا گمشدہ اشیاء سے متعلق قائم محکمے سے حاصل کر سکتے ہیں۔ جے سے سعودی عرب میں لوگ نماز کے وقت دکانیں کھلی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں لیکن مجال ہے کسی کو چوری کی ہمت ہو۔

سنگاپور میں کافی عرصے سے مجرموں کو بید مارے جاتے ہیں اور اس سزا سے جرائم میں کافی کمی آئی ہے۔ یہ سزا برطانوی پینل کوڈ کا ایک حصہ ہے جو سنگاپور میں 120 سال سے لاگو ہے لیکن اس پر عمل چند برس سے شروع کیا گیا ہے۔ پچھلی مرتبہ میں سنگاپور میں تھا تو ایک دن سات لڑکوں کو بید مارے گئے۔ انہوں نے دیواروں اور گاڑیوں پر چاکنگ کی تھی۔ سزا پانے والوں میں تین امریکی، دو ملائیشین، ایک فرانس کا اور ایک ہانگ کانگ کا باشندہ شامل تھا۔ ان کی عمریں سولہ سے انیس سال کے درمیان ہوں گی۔ امریکی سفیر نے کافی شور مچایا لیکن سنگاپور کی حکومت نے سب کو بید لگائے اور دو دو ہزار ڈالر جرمانہ کیا اور جرمانہ نہ دے سکنے والوں کو جیل میں جانا پڑا۔

سنگاپور میں جس چھڑی سے مارا جاتا ہے وہ بیل ٹائپ پام کے درخت کی ہوتی ہے جس کو ملائی زبان میں Rotan اور انگریزی میں Rattan کہتے ہیں یہ بید کے فرنیچر میں بھی استعمال ہوتا ہے جس کا سائز عدالت کی جانب سے مقرر کردہ ہوتا ہے۔ وہ پانچ فٹ لمبی اور آدھ انچ موٹی ہوتی ہے یہ چھڑی لچک دار اور مضبوط ہوتی ہے۔ اس کے سرے بانس کی چھڑی کی طرح پھٹتے نہیں۔ استعمال کرنے سے ایک دن قبل اسے پانی میں اچھی طرح بھگویا جاتا ہے۔ بید مارنے والا جیل افسر اس کام میں ماہر ہوتا ہے اور اس کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ ایک ہی جگہ پر دوسرا کوڑا نہ لگے کیونکہ اس چھڑی کی چوٹ اتنی شدید ہوتی ہے کہ جسم پر جہاں جہاں لگتی ہے وہاں کھال پھٹ کر گوشت نکل آتا ہے۔ بید مارنے سے پہلے مجرموں کی کمر پر جہاں گردے ہوتے ہیں چھوٹے سے تکیے باندھے جاتے ہیں تاکہ غلطی سے جسم کے نازک حصوں کو نقصان نہ پہنچے۔ مجرم کے بے ہوش ہونے پر بید مارنے بند کر دیئے جاتے ہیں لیکن ڈاکٹر جے سے ہی مجرم کو ہوش میں لاتا ہے پھر شروع کئے جاتے ہیں۔

سنگاپور کے ایک ڈاکٹر نے بتایا کہ بید کی مار کا درد بعد میں بہت زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ اس سزا کے بعد مجرم سیدھا سو نہیں سکتا۔ کوئی ہفتہ بھر اسے الٹا لیٹنا پڑتا ہے۔ جیل کے ایک اعلیٰ افسر نے بتایا کہ یہ سزا اس قدر سخت ہے کہ بڑے بڑے خاندانی مجرم بھی جرائم سے توبہ کر لیتے ہیں۔ سنگاپور میں بید مارنے کی سزا دیواروں پر لکھنے کے علاوہ چوری، لڑکیوں کو چھیڑنے، مار پٹائی اور زنا جے سے جرائم پر بھی ہے۔ زیادہ سے زیادہ سزا 24 بید ہے اور یہ اس قدر سخت سزا ہے کہ انسان کئی ہفتوں تک زندہ لاش بن جاتا ہے۔

سنگاپور کی ان سزاؤں کو بھی مغربی میڈیا ظالمانہ اور وحشیانہ قرار دیتا ہے لیکن سنگاپور کے سابق وزیر اعظم لی کئان یو جنہوں نے ان سزاؤں پر عملدرآمد کی ابتداء کی اب موجودہ حکومت بھی انہیں برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ یہ ہی سبب ہے کہ چینیوں کو جن کو جرم کی دنیا کا ماہر جانا جاتا ہے ٹھیک کرنے میں جہاں ماؤ زے تنگ کو بیس سال لگ گئے وہاں لی کئان یو نے بیس مہینوں میں ٹھیک کر دیا۔ بقول ہمارے سنگاپوری کیپٹن دوست کے "آج کل جرائم پیشہ لوگوں کو سخت سزاؤں سے ہی ٹھیک رکھا جا سکتا ہے اور اس سلسلے میں سعودی عرب اور سنگاپور میں بالکل صحیح ہو رہا ہے۔"

کولمبیا کی آئیناروزا

جنوبی امریکہ کے ملک کولمبیا سے ورلڈ میری ٹائم یونیورسٹی سوئیڈن میں آئی ہوئی آئیناروزا(جو وہاں کے کسی بندر گاہ کی پورٹ کنٹرولنگ اتھارٹی افسر ہیں) کا مختصر ذکر اس سے پہلے بھی کر چکا ہوں۔ کولمبیا اور جنوبی امریکہ کے دوسرے ملکوں میں ہسپانوی زبان بولی جاتی ہے کیونکہ امریکہ کو ڈھونڈنے والا کولمبس اسپین کا تھا اور شروع کے کئی برس صرف اسپین کے لوگ ہی امریکہ کی طرف جاتے رہے اور اس کے بعد پرتگالی اور دوسرے پہلوان لوٹ کھسوٹ کے لئے وہاں پہنچے۔ بہر حال پورے جنوبی اور وسطی امریکہ میں ہسپانوی اور پرتگالی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ شمالی امریکہ جسے اب ہم صرف امریکہ کہتے ہیں اس کی ہوسٹن، نیو اورلینس اور دیگر ریاستوں میں بھی انگریزی کم اور ہسپانوی زیادہ بولی جاتی ہے۔

کولمبیا کی آئیناروزا اور جنوبی اور وسطی امریکہ کے دوسرے ممالک کے جہاز راں اور بندر گاہوں سے وابستہ افسران سوئیڈن کی اس یونیورسٹی میں ہم سے چار پانچ مہینے قبل آئے تا کہ اس دوران وہ انگریزی سیکھ سکیں۔ سوئیڈن کے تمام اسکولوں اور کالجوں وغیرہ میں ان کی اپنی زبان یعنی سوئیڈش ہی رائج ہے لیکن اقوام متحدہ کی طرف سے اس بین الاقوامی یونیورسٹی میں ہر چیز انگریزی زبان میں ہوتی ہے۔ اس لئے جنوبی امریکہ کے علاوہ افریقہ اور عرب ممالک کے کئی لوگ جو انگریزی سے نابلد ہیں وہ ے ہاں آکر پہلے انگریزی سے کھنے کے لئے کورسز کرتے ہیں۔ اس کے بعد مزید دو سال رہ کر جہازوں یا بندر گاہوں سے متعلق مضامین میں سے ایک میں ایم ایس سی کرتے ہیں۔ آئیناروزا پورٹس اینڈ شپنگ ایڈمنسٹریشن میں ایم ایس سی کر رہی تھی جو مے رے مضمون سے مختلف تھا لیکن ہاسٹل میں وہ مے رے فلور یعنی تیسری منزل پر رہتی تھی۔ اس کا کمرہ مے رے کمرے سے تیسرا تھا۔ اس لئے آتے جاتے اس سے علیک سلیک ہوتی رہتی تھی۔ وے سے بھی سارے لوگوں کی ے ہ رائے تھی کہ جنوبی امریکہ سے آئے ہوئے سارے جہازوں اور بندر گاہوں کے نمائندوں میں آئیناروزا سب سے زیادہ خوش اخلاق اور خوش مزاج ہے۔ وہ ہر ایک سے خوش اخلاقی سے پیش آتی تھی۔ یونیورسٹی سے واپس آکر شام کے وقت جب افریقہ اور ایشیا کی باقی طالبات ڈھے لے ڈھالے گاؤن اور میکسیاں پہن کر، اداس چہرے لئے ہوسٹل کے کوریڈور میں واک کرتی اور اپنے وطن

چھوڑ آئے ہوئے اپنے بچوں اور شوہروں کو یاد کرتیں تو وہ آئینا روز اہم مرد جہاز رانوں کی طرح سفید نیکر پہن کر ہم لوگوں کے ساتھ فٹ بال کھلنے نکل پڑتی تھی۔ (ایرانی اعتراض کرتے رہتے تھے مگر باقی لوگ آئینا کی اس فراخدلی سے بہت خوش تھے)

بھارت کا پورٹ مینجر وجے کمار جس کی آئینا سے ہر وقت ناراضگی چلتی رہتی تھی ہمیں خبردار کرتا تھا۔ "وہ عورت بڑی تیز ہے تم لوگ اسے نہیں سمجھتے۔ میں اس کا کورس میٹ ہوں اس لئے جانتا ہوں کہ وہ اول نمبر کی خود غرض عورت ہے۔"

"یار وجے! ہمارا پاکستانی ساتھی میرین انجینئر راحت عزیز اسے دلیل پیش کرتا تھا۔" وے سے تو ہم سب کنگلے ہیں۔ وہ بیچاری زیادہ سے زیادہ کھانا پکاتے وقت ہم سے آلو پیاز ہی ادھار لے سکتی ہے اس کے علاوہ ہم اسے کیا دے سکتے ہیں۔"

"وہ بات نہیں ہے" وجے نے ہمیں سمجھانے کی کوشش کی۔ "آئینا کی انگریزی اچھی نہیں ہے جسے درست کرنے کے لئے وہ ہم سے زبردستی بات کرتی رہتی ہے۔"

قریب کھڑے ہوئے گھانا کے کیپٹن پیٹر نے کہا، بلکہ انکشاف کیا "جنوبی امریکہ میں عورت کی قدر جھاڑو کے برابر بھی نہیں ہے۔ اسے اپنے براعظم کے لوگ تو پوچھتے ہی نہیں اسی لئے وہ دوسرے ممالک کے لوگوں سے زبردستی دوستی کرتی رہتی ہے۔"

"کیپٹن پیٹر تم انگریزی بولنے والے ملک گھانا کے ہو اس لئے آئینا کو ریڈور میں تم سے راز و نیاز کرتی رہتی ہے۔" وجے نے پیٹر کو آئینا کی دوستی کا اپنی دانست میں اصل سبب بتاتے ہوئے کہا۔ "ورنہ جے سے تم پڑوسی اور کورس میٹ ہو وے سے علی جمہ با اور البرٹو ہیں لیکن علی جمہ بانائیجر کا ہے جہاں فرانسیسی بولی جاتی ہے اور البرٹو موزمبیق کا ہے جہاں پرتگالی بولی جاتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ علی جمہ باسے بات کرنے سے انگریزی ٹھیک تو نہیں ہوگی خراب ضرور ہوگی کیونکہ علی جمہ با ان کاہل انسانوں میں سے ہے جسے آٹھ مہینے ہوگئے ہیں لیکن ابھی تک وہ پتہ نہیں چلا ہے کہ مرد کے لئے انگریزی لفظ He استعمال کرنا چاہیے یا She۔"

بہرحال آئینا روز اکے کورس میٹ بھارتی پورٹ مینجر وجے کی وہ دلی خواہش تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگ آئینا سے روٹھے رہیں تو اچھا ہے کیونکہ بقول وجے کے آئینا حقیقت میں ایک بدمزاج اور مغرور افسر ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ایک دفعہ کھانے کے وقت بھری میس میں آئینا نے وجے کو دھمکی دی تھی کہ اگر تمہاری کمپنی کا کوئی جہاز میری بندرگاہ کی طرف آیا تو میں اسے پکڑوا دونگی۔

"ہمارے ہاسٹل میں صرف تم لوگوں کے ساتھ ہے وہ عورت کبھی کبھی اچھی طرح بات کرتی ہے ورنہ یونیورسٹی میں ہر ایک کو پاگل کتے کی طرح کاٹنے کو دوڑتی ہے۔" وجے نے ایک دفعہ پھر ہمیں یاد دلایا۔ بہر حال ہے وہ تو ہم سمجھتے تھے کہ کولمبیا کی ہے وہ محترمہ آئینا روزا جو آتے جاتے دانت نکال کر ہماری خیر عافیت معلوم کرتی تھی اس جیسی جھگڑالو پوری یونیورسٹی میں نہیں تھی۔ لوگوں سے کرید کرید کر جھگڑے کرنے میں مشہور تھی اور جھگڑا بھی قسطوں میں کرتی تھی۔ کبھی کبھی اس کا جھگڑا آٹھ آٹھ پہر بھی چلتا تھا۔ کوئی دن ایسا نہیں جب وہ جھگڑا نہ کرتی ہوں۔ جھگڑے میں ناغہ صرف تب کرتی تھی جب اس کا شوہر نامدار سال میں تین مہ ہے نے کی چھٹی پر اس کے پاس آتا تھا۔ سال کے وہ تین مہ ہے نے ہے وہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے ہسپانوی زبان میں اپنے میاں سے لڑ کر گزارتی تھی اور ہم اس کی سلام دعا، دو مے ٹھے بول یا ڈانٹ ڈپٹ سننے سے محروم رہ جاتے تھے۔ جے سے ہی اس کا میاں رسی تڑوا کر جنوبی امریکہ کا رخ اختیار کرتا تھا آئینا روزا کے حملے کا نشانہ ہم تیسری منزل پر رہنے والے ہوتے تھے اور یونیورسٹی میں وجے وغیرہ۔ میں اس سے کنارہ کشی کرنے کی بہت کوشش کرتا تھا لیکن جب آدمی ایک گلی میں رہتا ہو، ایک ہی میس میں کھانا کھاتا ہو، ایک ہی بس میں یونیورسٹی آتا جاتا ہو تو ایسے میں ملاقات تو لازمی ہے۔

ے ہاں سے نکلنے والے انگریزی جرے دے "آؤٹ لک" میں اکثر مے رے کالم اور مضامین چھپتے تھے۔ ایک مضمون اس یونیورسٹی پر بھی میں نے لکھا تھا کہ ے وہ یونیورسٹی ایک چھوٹی سی دنیا ہے جس میں دنیا کے مختلف ممالک کے سینئر جہاز راں جہازوں اور سمندروں سے متعلق کسی مضمون میں مہارت حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بعد جہاں ایشیا، افریقہ اور بعض عرب ممالک کے بے حد دلچسپ لوگوں کا ذکر کیا تھا وہاں جنوبی اور وسطی امریکہ کے ممالک یعنی چلی، وینزویلا، ایکواڈور، کوسٹاریکا، گوئٹے مالا وغیرہ سے آئے ہوئے مرد اور خواتین نمائندوں کا بھی ذکر کیا تھا۔ ہماری اس پڑوسن آئینا کا ذکر خیر بھی کیا تھا.... کچھ پڑوسی کا حق ادا کرنے اور کچھ وے سے ہی خوش کرنے کی خاطر۔ ظاہر ہے جھگڑالو مرد سے ہی لوگ ڈرتے ہیں ے وہ تو عورت ٹھہری جس سے بڑے بڑے پہلوان چھپتے پھرتے تھے۔

مضمون کی اشاعت کے بعد میں اپنی طرف سے بہت مطمئن اور خوش تھا کہ جے سے ہی آئینا اسے پڑھے گی تو میرا احسان مانے گی اور میری تعریف کے پل باندھے گی۔ تعریف کس کو پسند نہیں ہے وہ بھی کولمبیا کی ایک حسین عورت کے منہ سے جو اپنے حسن کے بل بوتے پر چلتے ہوئے لوگ تو شاید نہ روک سکے لیکن اپنی سرکاری حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ملک کی بندرگاہ میں کھڑے جہاز کو حراست میں لے سکتی ہے۔ تے سرے یا چوتھے دن میں میس سے نکل رہا تھا کہ ترکی کا چیف انجینئر حسن بقال مل گیا۔

"ارے یار کہاں ہو تم۔" وہ مجھے دیکھ کر چلایا۔ "وہ اپنی آئینا تمہیں کب سے ڈھونڈ رہی ہے۔"

آئینا نے سوئیڈن میں موجود سارے جہاز رانوں کو اتنا قرب دے رکھا تھا کہ ہر ایک کے دماغ میں وہ "اپنی" بن گئی تھی۔

"ضرور ڈھونڈ رہی ہو گی۔" میں قدرے فخر سے بولا۔

"تمہارا آرٹیکل پڑھا ہے اس نے۔" حسن بقال نے کہا۔

"اپنا نام پڑھ کر بہت خوش ہوئی ہو گی۔ راحت محسوس کر رہی ہو گی۔" میں نے اعتماد سے کہا۔

"راحت تو نہیں البتہ جل گئی ہے اور بگڑی ہوئی ہے۔" حسن بقال نے مسکراتے اور مجھے متنبہ کرتے ہوئے کہا۔ جے سے بیچ سمندر پر کسی آنے والے طوفان کا انتباہی سنگل مل گیا ہے۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ ترکی کا ےہ انجینئر سارا دن ہنسی مذاق کرتا رہتا ہے۔ اس لئے مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آیا اور اس کی بات کو میں نے ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا۔ شام کو میں جے سے ہی کمرے سے نکلا تو سامنے آئینا اپنے کمرے کے دروازے کے پاس نظر آئی۔ اس نے جن قاتلانہ نگاہوں سے مجھے گھور کر دے کھا مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ جس آنے والے طوفان کی صبح صبح حسن بقال پیش گوئی کر رہا تھا اس کے (بقول جہاز رانوں کی زبان میں) "EYE" میں پھنس گیا ہوں۔

"الطاف صاحب! ےہ کیا شرافت ہے؟" آئینا روزانے غمزدہ اور غصے لے لہجے میں مجھ سے شکایت کی۔

"کیوں بھئی خیریت تو ہے؟" ظاہر ہے مجھے حیرت ہوئی۔

"میں تمہارے پڑوس میں رہتی ہوں۔ صبح و شام تمہارا گزر مے رے کمرے کے آگے سے ہوتا ہے تمہیں ےہ تک پتہ نہیں کہ میرا کس ملک سے تعلق ہے؟" اس نے چیخ چیخ کر کہا۔

"کیوں بھئی؟" میں نے اس طوفان کا سبب معلوم کرنا چاہا۔

"ےہ دیکھو۔" اس نے اپنے کمرے کے دروازے پر چسپاں اپنے ملک کے پرچم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو اس نے پہلے ہی دن سے وہاں چسپاں کر رکھا تھا۔ "میں کولمبیا کی رہنے والی ہوں کولمبیا کی، جو پیرو اور وینزویلا کے درمیان واقع ہے۔"

"تو میں نے کیا لکھا ہے؟" باوجود کوشش کے مجھے یاد نہیں آرہا تھا۔

"آپ نے پورٹوریکو کی آئینا لکھا ہے۔" اس نے بتایا اور اس وقت مجھے بھی احساس ہوا کہ واقعی ےہ غلطی ہو گئی اور وے سے بھی سوئیڈن میں آئے ےہ ہمارے ابتدائی دن تھے۔ وہاں موجود 120 ممالک کے 200 کے لگ بھگ جہاز رانوں کے نام اور ان کے ممالک کو یاد رکھنا اتنا آسان کام نہیں تھا لیکن اس جنفی آئینا کی ےہ بات درست ہے کہ ایک پڑوسی کے ملک کا نام تو مجھے پہلے دن سے ہی یاد رکھنا چاہے اور وہ بھی آئینا جیسی جو پہلے دن سے ہم مردوں کے ساتھ فٹ بال کھیل رہی ہے۔ خیر مرد حضرات سے مل جل کر کھیلنا اتنا خطرناک نہیں ہے لیکن ہم جیسے جہاز رانوں

سے اتنے مراسم بڑھانا دل گردے کی بات ہے۔ آئینا کو ٹھنڈا کرنے کے لئے میں نے جلدی جلدی اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

"آئینا معاف کرنا ہو سکتا ہے مضمون جلدی میں لکھنے کی وجہ سے دو تین اور ساتھیوں کے ممالک کے نام بھی غلط لکھ گیا ہوں۔"

"وہ تو صحیح ہے۔ انسان سے غلطی ہو جاتی ہے لیکن کم از کم مجھے پورٹوریکو جیسے ذلیل ملک سے تو منسوب نہ کرتے اس سے تو کوئی بڑی سی گالی دے دیتے تو وہ بہتر تھا میں ہرگز مائنڈ نہ کرتی۔" آئینا اپنے اصلی دکھ کی طرف میرا دھیان مبذول کرا کے چلی گئی اور میں سوچتا ہی رہ گیا کہ یہ کوئی ایسی بڑی بات بھی نہیں تھی۔ ملک سے دور کوئی غیر ملکی مجھے ہالہ کا کہنے کے بجائے شہداد پور، کوٹری یا ٹنڈو آدم کا کہے کیا فرق پڑتا ہے۔ کونسا ایک شہر پیرس، لندن ہے۔ سارے کے سارے شہر ایک جیسے ہیں جہاں سارا سال بجلی کی لوڈ شیڈنگ ہوتی ہے، پینے کو صاف پانی نہیں ملتا، مکھیوں، مچھروں اور کتوں کی بہتات ہے۔ جنوبی اور وسطی امریکہ کے بھی تقریباً سارے ممالک کا ایک ہی جیسا حال ہے۔ بے روزگاری، رشوت خوری، ناانصافی، غیر جمہوری ادارے، قتل و غارت، منشیات، آدھے سے زیادہ ملکوں کی معیشت تباہ ہو چکی ہے یہاں تک کہ ٹوائلٹ میں کاغذ نہیں ہوتا تو لوگ صفائی کا کام نوٹوں سے لیتے ہیں۔ لیکن اس دن کولمبیا کی آئینا کی یہ بات سن کر گویا مجھے علم ہوا کہ گو جنوبی امریکہ کے تمام ممالک میں ویرانی چھائی ہوئی ہے لیکن ان میں سے بعض ملکوں کا درجہ باگڑی بھیلوں والا ہے تو بعض کا سیدوں پیروں والا۔

کچھ عرصے کے بعد انگریزی میگزین آؤٹ لک میں میرا ایک ایسا مضمون شائع ہوا جس میں میں نے دنیا کے کئی ممالک اور ان میں بسنے والی قوموں کا ذکر کیا تھا۔ عربوں ایرانیوں سے لے کر چینی جاپانیوں کا۔ میں نے جنوبی امریکہ کے کسی بھی ملک کا ذکر جان بوجھ کر نہیں کیا۔ یہ سوچ کر کہ جنوبی امریکہ کے جہاز راں نمائندے جو ہمارے ساتھ رہتے ہیں بہت حساس ثابت ہوئے ہیں اگر کوئی کمی بیشی رہ جائے گی تو خواہ مخواہ برا منائیں گے۔

مضمون شائع ہونے کے بعد باقی سب خاموش تھے لیکن آئینا لڑنے کے لئے ہمیشہ کی طرح تیار نظر آئی۔ ہسپانوی لہجے میں انگریزی میں بولی کہ "تم نے مضمون میں جنوبی امریکہ کا ذکر کیوں نہیں کیا۔"

"بس آئینا بھول ہو گئی۔ دوسری دفعہ ضرورت نہیں ہو گی تب بھی تمہارے ملک اور براعظم کا نام لکھ دوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے جان چھڑانے کی کوشش کی جو بالکل کامیاب ثابت ہوئی اور آئینا اپنے کمرے میں اندر جاتے وقت تک "بہت بہت شکریہ" کی تسبیح پڑھتی گئی۔ ویسے بھی مہربانی، شکریہ، معاف کرنا، مبارک ہو جیسے الفاظ کی ادائیگی میں آئینا بڑی سخاوت سے کام لیتی تھی۔ اسی لئے تو ہم کہتے تھے کہ آئینا بڑی خوش اخلاق ہے لیکن اس کے کورس میٹ وجے کا یہی کہنا تھا کہ وہ اخلاق کا مظاہرہ نہیں بلکہ اپنی انگریزی درست کرنے کی مشق کرتی ہے۔

آئینا سے اس کے علاوہ ایک دفعہ اور بھی جھڑپ ہوئی سالانہ کانووکیشن میں مجھے تقریر کرنی پڑی۔ میں نے اس تقریر میں دنیا کی اس واحد یونیورسٹی (ورلڈ میری ٹائم یونیورسٹی) کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ے ہاں دنیا کے ہر ملک کے جہاز راں آتے ہیں اور اس سال تو امریکہ سے بھی آئے ہیں۔ میری مراد یو ایس اے تھا لیکن ہم لوگوں کے لئے یو ایس اے کے معنی امریکہ اور امریکہ کے معنی یو ایس اے ہیں۔ اس بات پر سب کو اعتراض ہوا لیکن لڑنے کے لئے آئینا کو بھیجا۔ اس وقت ہم تینوں پاکستانی موجود تھے۔ آئینا آدھی انگریزی آدھی ہسپانوی میں شور کر کے چلی گئی۔ اس وقت تو ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ے ہ کس بات پر لڑ رہی ہے۔ کچھ دیر بعد اندازہ ہوا کہ آئینا کو اس بات پر غصہ ہے کہ ہم صرف یو ایس اے کو کیوں اہمیت دے تے ہیں اور باقی امریکہ جس میں کئی ممالک آجاتے ہیں ان کو کیوں بھول جاتے ہیں۔

کیپٹن عاشق نے کہا۔ "یارے ہ آئینا بھی عجیب چیز ہے جس کی عادت بات بات پر جھگڑا کرنا ہے۔ سال کے بارہ مہ ہنے لڑتی ہی رہتی ہے۔ ایسی بیوی تو شوہر کے لئے بھی عذاب ہوتی ہو گی۔"

ے ہ سن کر ہمارا تیسرا ساتھی کیپٹن سلیم قاسم کوئی لطیفہ یاد کر کے ہنسا پھر وہ لطیفہ ہمیں بھی سنایا۔

"ایک آدمی اپنی بیوی سے سخت بیزار تھا۔ اس کے مرنے پر وہ بہت خوش ہوا کہ اس سے جان چھوٹ گئی۔ غسل و کفن کے بعد کندھے دے کر اسے دفن کے لئے لے جا رہے تھے تو راستے میں جنازے کا تابوت بجلی کے ایک کھمبے سے جا ٹکرایا۔ کھمبے سے ٹکراتے ہی ے ہ مری ہوئی عورت ایک دم زندہ ہو کر اٹھ بیٹھی۔ سب نے ے ہی کہا کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ بلکہ کئی لوگ دفن کے بعد بھی زندہ ہو کر قبروں سے نکل آتے ہیں۔ مری ہوئی بیوی کے زندہ ہونے پر یار دوست شوہر کو مبارک باد دے نے لگے لیکن ے ہ یار دل ہی دل میں کڑھتا رہا کہ ے ہ کیا اور کیوں ہوا۔ بہر حال دل کا دودھ سے نے میں چھپائے گھر کو لوٹے۔

"اور پھر کچھ سال زندہ رہنے کے بعد اس کی بیوی کو جب دوبارہ موت آئی اور اس کے جنازے کو قبرستان لے جا رہے تھے تو راستے میں درود یا کلمہ پڑھنے کی تلقین کرنے کی بجائے ے ہ غریب شوہر جنازہ اٹھانے والوں کو یہی کہتا رہا۔ "بھائی ذرا کھمبے سے بچا کر، بھائی ذرا کھمبے سے بچا کر۔"

تو ے ہ آئینا بھی اس قسم کی عورت لگتی ہے جسے دفنانے کے وقت کھمبے سے بچا کر چلنا پڑے گا۔

سوئیڈن میں عرب دوستوں کے ہمراہ

سوئیڈن میں عمر سلامہ نامی ایک فلسطینی عرب سے میری اچھی سلام دعا ہو گئی تھی۔ عمر نے آج سے پندرہ بیس سال قبل سوئیڈن میں سیاسی پناہ لی تھی اور پھر ے ہاں کی شہریت حاصل کر لی۔ کافی پڑھا لکھا ہے انگریزی، عربی اور مقامی زبان سوئیڈ سے اچھی طرح واقف ہونے کی وجہ سے ے ہاں کے ایک نجی فرم میں مترجم کے فرائض انجام دیتا ہے۔ وہ پورا دن کام میں مشغول نظر آتا تھا۔ ہماری ملاقات اکثر صبح کے وقت پارکنگ لاٹ سے گاڑی نکالتے وقت ہوتی تھی۔ شام کو واپس آنے کے اوقات مختلف ہونے کی وجہ سے ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ ہمارے جے سے نئے آنے والوں کو کرائے کے مکان سے لے کر گھر کے فرنیچر تک سستے داموں میں دلوانا اس کی عادت میں شامل تھا۔ اے سے کاموں کے لئے اس سے فون پر ہی رابطہ رکھتے تھے۔ صبح کے وقت پارکنگ لاٹ میں، جمع کو جامع مسجد میں یا فون پر جب بات ہوتی تھی تو وہ اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھانے یا چائے پینے کی دعوت ضرور دیتا تھا۔ "یار کسی دن بیٹھ کر کھانا کھائیں اور باتیں کریں۔" وہ کہتا تھا لیکن ادھر ہم مصروف اور ہم سے زیادہ وہ خود مصروف۔ ایک دن صبح کے وقت گاڑی نکالتے وقت کہنے لگا۔ "یار آج کچھ بھی ہو جائے ملنا چاہے ے۔"

"بالکل ملنا چاہے ے پروگرام بناتے بناتے ایک سال تو ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"بس آج ہر صورت میں ملنا چاہے ے، اکٹھے بیٹھ کر چائے پئیں گے یا ادھر ادھر چکر لگانے چلیں گے۔" عرم سلامہ نے کہا۔

"کس وقت ملیں؟" میں نے وقت تعین کرنا چاہا۔

گاڑی کو مین روڈ پر لاتے اور خدا حافظ کرنے سے پہلے عمر نے کہا۔ "بس آج شام کو ملیں گے۔ انتظار کرنا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کنفرم کرتے ہوئے عمر کو ہاتھ کے اشارے سے گڈ بائے کیا۔

یونیورسٹی پہنچ کر مجھے دھیان میں آیا کہ ہم لوگوں نے ملنے کا وقت مقرر کرنے میں بڑی غلطی کی۔ پاکستان، عرب ممالک یا ممباسا بنکاک میں تو ے ہ کہہ سکتے ہیں کہ شام کو ملیں گے لیکن ے ہاں سوئیڈن، ناروے جے سے ممالک میں تو ہر چیز گھڑی کے کانٹوں کی زبان میں ہی ہو سکتی ہے۔

پاکستان میں شام کا مطلب جس وقت سورج کی تپش کم ہو جائے یعنی پانچ، چھ یا زیادہ سے زیادہ سورج غروب ہونے کا وقت .... یعنی تقریباً ساڑھے چھ یا سات بجے۔ لیکن ے ہاں سوئیڈن میں شام کہاں سے کہاں تک سمجھی جائے اور وہ بھی سردیوں کے موسم (نومبر دسمبر) میں؟ ان دنوں میں تو سورج صبح سے نظر نہیں آتا! کوئی بہت ہی اچھا دن ہوتا ہے جس میں سورج گھنٹے دو گھنٹے کے لئے دیدار کراتا ہے جس سے کپکپی میں تھوڑی سی کمی آجاتی ہے، ہر چیز اچھی لگنے لگتی ہے اور گھومنے پھرنے کو دل کرتا ہے۔ اے سے میں یورپ کے کسی اور شہر سے دوست کا فون آجائے تو پہلے اسے ے ہ خوشخبری دے تے ہیں کہ We are having a sunny day ان ٹھنڈے اور برفانی ملکوں میں Sunny

Day کے معنی سہانا دن۔ ے ہاں کے لوگ اپنے بچوں کو بھی پیار سے Sunny کہتے ہیں۔ ضرور کہیں۔ ان ممالک میں سورج یعنی دھوپ کی بڑی اہمیت ہے ے ہاں کی ہلکی ہلکی دھوپ میں دل چاہتا ہے کہ باہر بیٹھے رہیں۔ ایک ہمارے ملک میں Sunny day ہوتا ہے جو جہنم لگتا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے ملک میں لوگ اپنے بچوں کو Sunny کہہ کر کیوں پکارتے ہیں۔ ہمارے لئے تو ے ہ نام اتنا پیارا نہیں ہونا چاہے ے۔ ہمارے لئے تو بادل، شبنم، بارش اور برف جے سے ناموں سے دل کو ٹھنڈک پہنچتی ہے اور ے ہ چیزیں یورپ کے ان سرد ملکوں کے لوگوں کے لئے گالی ہیں۔

بہر حال ہم سوئیڈن کی شام کی بات کر رہے تھے۔ ایک تو ے ہاں سورج ضرور طلوع ہوتا ہے لیکن گہرے بادل، بارش اور برف باری کی وجہ سے نہ سورج نظر آتا ہے نہ دھوپ، ہمارے ملک میں بادل اتنے ہلکے ہوتے ہیں کہ ان کے پے چھے چھپا ہوا چاند بھی نظر آتا ہے۔ ے ہاں سوئیڈن میں سورج کس وقت طلوع اور کس وقت غروب ہوتا ہے، ے ہ تو ہم کلینڈر اور جنتریوں کو دے کھ کر اندازہ لگاتے ہیں کہ اس مہنے کے فلاں دن سورج اس وقت طلوع ہو گا اور اس وقت غروب! یہ الگ بات ہے کہ کبھی کبھی سورج کی جھلک نظر آتی ہے ورنہ بادلوں اور بارش کی وجہ سے دن بھی رات کی ہی طرح اندھے رے لگتے ہیں۔ آج کل سورج صبح نو بج طلوع ہوتا ہے اور دو پہر تین بجے غروب ہوتا ہے۔ نماز عشاء تقریباً ساڑھے چار بجے اور دفتر سے چھٹی پانچ بجے ہوتی ہے۔

میرا فلسطینی دوست رات کو نو بجے مے رے پاس آیا اور کہا کہ چلو دو تین عرب دوستوں سے ملنے چلیں۔

"یارے ے ہ وقت گھومنے پھرنے کا تو نہیں ہے۔ رات ہو گئی ہے۔ ہم نے تو شام کو چلنے کا پرو گرام بنایا تھا۔" میں نے عمر سے کہا۔

"بھائی میرے ے ہ شام ہی ہے وے سے تو تین بجے سورج غروب ہونے کے بعد اندھیرا ہو جاتا ہے تو کیا اس روشنی والی شام میں چلنے کے لئے آفس چھوڑ کر دو بجے آجاؤں؟"

میں جلدی جلدی جوتے اور گرم کوٹ پہن کر تیار ہو گیا۔ "کہاں کہاں چلنا ہے؟" میں نے عمر سے پوچھا۔

"پہلے کروکس بیک کے علاقے میں شیخ سعید کے گھر چلتے ہیں، اس کے بعد روزن گورڈ" عمر نے بتایا۔ مالمو شہر کے ان علاقوں کے قریب مے رے جہاز ران ساتھی یمن کے مبارک کا گھر بھی تھا جس کو واپس کرنے کے لئے میں نے اس کی کتابیں اٹھائیں۔ پہلے شیخ سعید کے گھر آئے۔ راستے میں عمر نے بتایا کہ سعید صاحب مالمو کی بڑی مسجد کا امام رہ چکے ہیں۔ وہ کچھ عرصہ افغانستان میں رہے اور افغانیوں کے ساتھ روسیوں سے لڑتے رہے۔ سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد وہ ے ہاں سوئیڈن چلے آئے۔ عمر کی طرح ان کا اصل وطن بھی فلسطین تھا۔

شیخ سعید نے بہت گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ وہ تیس پینتیس سال کے ہونگے، کالی داڑھی اور لمبے بال تھے۔ سعید بھی ہمارے ساتھ چلنا چاہتے تھے۔ جلدی جلدی کوکا کولا کے دو گلاس ہمارے سامنے رکھ کر خود سوئیٹر اور گرم کوٹ پہننے میں مصروف ہو گئے۔ ہم نے کوکا کولا کے گلاسوں کو ہاتھ لگا کر وہیں چھوڑ دیے۔ ایسی سردی میں کوکا کولا کون پی سکتا ہے۔ صرف چھونا بھی بڑی بات تھی۔ "ابھی جلدی میں ہیں دوسرے دوست کے گھر چائے پی لیں گے۔" عمر نے مجھے خوشخبری سنائی۔ ہم تینوں آکر عمر کی گاڑی میں بیٹھے اور چل پڑے۔ راستے میں یمن کے عرب محمد مبارک کا گھر آیا۔ میں نے اتر کر اس کی کتابیں اس کے حوالے کی۔ میں سمجھا کہ عمر اور سعید بھی اتر کر اس سے ملیں گے لیکن دونوں کا کوئی ایسا ارادہ نہیں لگا۔ میں سمجھ گیا کہ ان کو یمن کے اس عرب سے ملنے میں دلچسپی نہیں ہے۔ وہ اپنے ہم وطن دوست فلسطینی اردنیوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ سعودی عرب یا کویت کا کوئی عرب ہوتا تو اس سے ضرور ملتے۔ یمن وہ ملک ہے جسے پڑوسی ممالک اور ہم زبان اچھوت سمجھے ہیں۔ شاید اس لئے کہ یہ ایک غریب ملک ہے۔ پے سے میں بھی اور ٹیکنالوجی کے حساب سے بھی، اس میں نہ سیاسی استحکام ہے نہ سماجی بلندی۔

اس کے بعد ہم نے روزن گورڈ کی طرف رخ کیا۔ یہاں کی سوئیڈش زبان میں گورڈ کی معنی جاگیر یا علاقہ ہے۔ روزن گورڈ نام میں تو گلاب کے پھولوں والا علاقہ ہے لیکن آپ کو یہاں صرف عرب لوگ ہی نظر آئیں گے۔ ہر ملک کے عرب دیکھنے میں آئیں گے، مڈل ایسٹ سے مراکش تک کے عرب۔ مالمو شہر میں سب سے زیادہ عرب اس علاقے (روزن گورڈ) میں رہتے ہیں۔ کچھ تھوڑے چھوڑ کر اکثریت اے سے ٹھگ لوگوں کی ہے جن سے یورپی لوگ تو کیا ایشیا کے لوگ بھی دور بھاگتے ہیں۔ ان کے ہنگاموں اور جھگڑوں کے قصے پورے سوئیڈن میں مشہور ہیں۔ دراصل فلسطینیوں، عراقیوں اور دوسرے عرب لوگوں کو سوئیڈن جے سے ممالک نے جب سیاسی پناہ آفر کی تو وہ عرب تو بہت کم آئے جن پر ظلم ہو رہے تھے لیکن قوم پرستوں نے اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اپنے ممالک میں جرائم کے مختلف مقدمات میں ملوث تھے۔

مالمو میں رہنے والے سکھ ستنام جو کسی زمانے میں روزن گورڈ میں رہتا تھا اس علاقے کو ہمیشہ "روشن گوٹھ" کہتا تھا۔ "اس علاقے کے حالات دن بدن اے سے خراب ہونے لگے کہ مجھے بھی اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا۔" ستنام نے ایک دن بتایا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سوئیڈن کے اس شہر مالمو میں سب سے زیادہ جھگڑے اس علاقے میں ہوتے ہیں۔ اس علاقے میں آپ کو ہر وقت پولیس کی گاڑی کی "روں روں" سننے میں آئے گی۔ بہر حال اس علاقے میں جہاں جھگڑالو عرب رہتے ہیں وہاں عرب اور افریقہ کے ممالک کے کئی نیک اور پڑھے لکھے لوگ بھی ہیں۔ اتنے اچھے لوگ جن کے عادات اطوار اور اخلاق کو دیکھ کر کئی مقامی لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ کئی سوئیڈش لڑکیوں نے

مسلمان ہونے کے بعد عربوں سے شادی کرلی ہے۔ کئی مولویوں اور علماء نے اپنے مثالی کردار کے ذریعے مغربی پریس کی جانب سے اسلام مخالف پروپیگنڈے کا منہ توڑ جواب دیا۔

روزن گورڈ میں جن اردنی دوستوں سے وہ ملنا چاہتے تھے وہ گھر میں موجود نہیں تھے۔ "چلیں حسن کے گھر چلتے ہیں اسے شادی کی مبارک دینی ہے۔" شیخ سعید کو یاد آگیا۔ ان کے اس فلسطینی دوست کے گھر کی سیڑھیاں چڑھتے وقت عمر اور سعید نے بتایا کہ حسن کی پچھلے ہفتے "خالص اسلامی" رسم و رواج کے مطابق شادی ہوئی ہے۔ اب اس وقت وہ سوچ رہا ہوں کہ ان سے پوچھ لیتا کہ ان کا 'خالص اسلامی رسم رواج' سے کیا مطلب تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ شادی ایسی نہ ہوئی ہو جیسے ہمارے ملک میں کئی شادیوں اور ختنوں کی تقریبات میں خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ سنت پوری کرنے کی خوشی میں ناچ گانے ہوتے ہیں۔ پے نے پلانے کے دور چلتے ہیں۔ آج کل کا تو مجھے پتہ نہیں ہے لیکن ساٹھ اور ستر کے عشرے کے دوران میں سندھ میں ایسی کئی تقریبات میں شریک ہوا۔ اب تو دنیا ہی بدل گئی ہے۔ ان دنوں میں ٹی وی، وی سی آر، ڈش یا انٹرنیٹ کا دور نہیں تھا۔ ان دنوں میں سائینوال کی کجن بانو کی بے سری آواز بھی روح کو راحت پہنچاتی تھی۔ لاہور کی ہیرا منڈی سے آئی ہوئی چربی چڑھی ٹانگوں والی رقاصاؤں سے سندھ کے وڈیروں کی آنکھیں نہیں ہٹتی تھیں۔ واہ واہ اور نوٹوں کی بن بادل برسات ہوتی رہتی تھی۔

بیل بجانے پر حسن باہر نکل آیا اور پڑوس والوں کے آرام کا خیال کئے بغیر ہم پاکستانیوں کی طرح دروازے کے باہر ہی ہماری زور زور سے خیریت معلوم کرنے لگا۔ مرحبا! مرحبا! حیاک اللہ، وغیرہ وغیرہ۔ اسی وقت ان کے دو اور دوست خالد اور فاطمی اپنی بیویوں کے ساتھ پہنچے۔ خواتین کو الگ کمرے میں بٹھایا گیا ہم لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے۔ سندھ کے رواج کے طرح عرب کے لوگ بھی چاہے سعودی عرب میں ہوں یا سوئیڈن میں خواتین کو الگ بٹھائیں گے تاکہ وہ آپس میں باتیں کریں (جن میں وہ زیادہ تر اپنے شوہروں کی ناانصافی کے دکھڑے بیان کرتی ہیں) اور مہمانوں کے لئے چائے قہوہ یا کچھ اور تیار کریں۔ مرد حضرات مردوں کے ساتھ الگ کمرے، ڈرائنگ روم یا اوطاق میں بیٹھ کر جو زبان پر آئے آزادانہ طور پر گفتگو کرتے ہیں۔ زبان کی بے جا آزادی اور اوٹ پٹانگ کے لطیفے اور نوک ٹوک کی وجہ سے اکثر اوقات ایک دوسرے کی دل آزاری کر بیٹھتے ہیں اور ایک لمبے عرصے تک کے لئے آپس میں رنجشیں پیدا کرلیتے ہیں۔ سوئیڈن کی اس میری ٹائم یونیورسٹی مین آئے ہوئے پڑھے لکھے عرب بھی ملتے وقت بڑے پیار اور خلوص سے ملیں گے، زور زور سے باتیں کریں گے، قہقہے لگائیں گے، خوش ہوں گے مگر آخر میں کئی دفعہ معمولی بات پر ناراض ہو کر جدا ہو جائیں گے۔ کئی دفعہ معاملہ ہاتھا پائی تک بھی جا پہنچتا تھا اور غیر مسلم کو بھی مذاق اڑانے کا موقع ملتا تھا۔

بہر حال اس ملاقات میں ایسی کوئی بدمزگی پیدا نہیں ہوئی۔ شاید اس لئے بھی کہ میری وجہ سے سب کو انگریزی بولنا پڑ رہی تھی جس میں سوائے عمر کے سب بہت کمزور تھے۔ اسی لئے سب آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے جملوں پر گزارا کر رہے تھے۔ خالد اور فاطمی بھی افغانستان میں مجاہدوں کے ساتھ روسیوں کے خلاف جہاد میں حصہ لے چکے تھے۔ پشاور میں کچھ عرصہ رہنے کی وجہ سے ان کو تھوڑی تھوڑی اردو بھی آ رہی تھی۔

گھنٹہ بھر بیٹھ کر ہم تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ عمر کے فلسطینی دوستوں سے جو باتیں ہوئیں ان میں سب سے اہم باتیں جو اس وقت مے رے ذہن میں ہیں وہ ے ہ ہیں۔

دوسرے عرب لوگوں کے مقابلے میں فلسطینی زیادہ پڑھے لکھے ہوتے ہیں اور ان کو اگر ملک مل جائے اور چین سے رہنے دیا جائے تو سارے عربوں سے آگے نکل سکتے ہیں۔

عمر نے بتایا کہ ے ہاں یورپی ممالک میں ہر چیز کو دولت کی ترازو سے تولا جاتا ہے۔ پھر ایک سرد آہ بھر کر کہا: "اس کے باوجود ان یورپی ممالک کے مشکور ہیں جنہوں نے ہمیں رہنے کو جگہ دی۔ ہم خالی ہاتھ یہاں آئے تھے آج ہمیں سر چھپانے کے لئے چھت ہے۔ تینوں وقت پیٹ بھر کر کھانا کھاتے ہیں۔ باہر سڑکوں پر بے خوف ہو کر آزادی سے چلتے پھرتے ہیں۔ تحفظ ہے، قانون ہے، سب کچھ ہے، ہمیں شکر ادا کرنا چاہے ے۔ ہم ے ہاں ایک نہیں دو نہیں ہزاروں کی تعداد میں پہنچے ہیں۔ ے ہاں تک کہ ہمارے آنے کی وجہ سے ان ممالک کی معاشی حالت خراب ہو گئی ہے پھر بھی ہمیں وہی سماجی اور سیاسی حقوق حاصل ہیں جو مقامی لوگوں کو حاصل ہیں۔ فلسطین کے اڑوس پڑوس میں ہمارے بہت سارے ہم زبان اور ہم مذہب ملک ہیں لیکن نہ سعودی عرب اور کویت والے نہ بحرین اور دبئی والے ہمیں رکھنا چاہتے ہیں۔"

"ایسا کیوں ہے؟" میں نے عمر سے پوچھا۔

"اس لئے کہ ہم پڑھے لکھے ہیں۔ سعودی عرب والوں کو جاہل گنوار چاہئیں جن کے ساتھ وہ غلاموں جیسا برتاؤ کریں۔ وہ نہیں چاہتے کہ ان کے ملک کے لوگوں میں سیاسی شعور پیدا ہو۔" عمر نے بتایا۔

لیبیا کی بات نکلی تو میں نے انہیں بتایا کہ ہم پاکستانی لیبیا کے کرنل قذافی کو پسند کرتے ہیں کئی لوگ اس کے نعروں سے متاثر ہیں۔

مے رے فلسطینی دوستوں کو قذافی کی بات پسند نہیں آئی۔

"انتہائی جاہل اور منافق آدمی ہے۔" ایک نے کہا۔

"مسلمانوں کے ساتھ مسلمانوں جیسا، یہودی اور عیسائیوں کے ساتھ ان جیسا۔" دوسرے نے کہا۔

"اسلام اور مسلمانوں کو دنیا میں بدنام کر دیا ہے۔" عمر نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "قذافی کو صرف اپنی تعریف اور پروپیگنڈا اچھا ہے۔ ایک آدمی جو حال ہی میں لیبیا کا دورہ کر کے آیا ہے بتا رہا تھا کہ لیبیا کی آبادی چار ملین نہیں آٹھ ملین ہے۔ چار ملین جے تے جاگتے انسان اور چار ملین قذافی کے پوسٹر ہیں جو سارے ملک میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔"

واپسی پر ہم ایک مرتبہ پھر ان اردنی دوستوں کے فلیٹ پر گئے لیکن دروازے پر ابھی تک تالہ تھا۔ راستے میں ایک اور اردنی کا ڈیپارٹمنٹ اسٹور تھا۔

سعید نے عمر کو اس دکان کے پاس گاڑی روکنے کو کہا۔ "ہو سکتا ہے یہ لوگ اس دکان میں اس کے مالک کے ساتھ گپ شپ لڑا رہے ہو کیونکہ وہ ان کا ہم وطن ہے۔" سعید نے کہا اور اتر کر اندر چلا گیا۔

"چلو ہم بھی چلیں۔ ہے ہاں باہر گاڑی میں بیٹھے بیٹھے شدید سردی لگ رہی ہے۔" میں نے عمر سے کہا۔

"میں اس بے وقوف دکاندار کے پاس جانا پسند نہیں کرتا۔ آپ ہو آئیں۔" عمر نے قدرے غصے سے کہا۔

"کیوں؟" میں نے تشویش کا اظہار کیا۔

"اس اردنی دکاندار نے مجھ سے دوستی کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے خود کو اس سے دور رکھا،" عمر نے بتایا، "ہے یہ کیسا مسلمان ہے جو اپنی دکان پر شراب اور خنزیر بیچتا ہے اور کھاتا بھی ہے! اس کی بیوی اور بیٹی ڈسکو میں ڈانس کرتی ہیں۔ توبہ توبہ! ہمارے لوگوں کو کیا ہو گیا ہے! ہے ہاں آکر اپنا دین، ثقافت اور رسم و رواج تک بھلا دیتے ہیں۔ میں نے اس سے صاف صاف بتا دیا کہ اپنی دوستی کے سے چل سکتی ہے۔ آپ جن چیزوں کا استعمال کرتے ہیں میں ان سے دور بھاگتا ہوں۔ کل میں اگر آپ کے گھر آؤں تو تمہارے پاس نہ کھانا کھا سکتا ہوں نہ کسی گلاس میں پانی پی سکتا ہوں، اس لئے بہتر یہی ہے کہ اپنی دوستی کو آگے بڑھنے ہی نہ دیا جائے۔"

تھوڑی دیر بعد شیخ سعید دکان سے باہر نکلا۔ "ہے ہاں بھی وہ لوگ نہیں ہیں کافی دیر ہو گئی ہے چلو واپس چلتے ہیں۔" عمر نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم گھر کی طرف چل پڑے۔ اس وقت گھڑی میں ساڑھے دس بج رہے تھے وقت اتنا زیادہ نہیں تھا کہ کہا جائے کہ بہت دیر ہو گئی۔ پاکستان، سعودی عرب وغیرہ میں بڑے تو کیا بچے بھی رات کو بارہ بجے تک جاگتے رہتے ہیں لیکن ہے ہاں ان برفانی اور لمبی راتوں والے ملک میں جہاں سورج تین بجے غروب ہو جاتا ہے رات کو نو بجے چاروں طرف سناٹا چھا جاتا ہے۔ اور اس وقت مالمو کی سڑکوں پر صرف چند گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ گاڑی کے اندر تو ہیٹر کی وجہ سے سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی لیکن باہر گرتی ہوئی برف اور ہلتے ہوئے درختوں کی ٹہنیاں دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ درجہ حرارت نقطہ انجماد سے بھی گر چکا ہے۔ آدھے سے زیادہ شہر نیند میں سو چکا ہو گا۔ دوسرے دن دفاتر اور کارخانوں میں تازہ توانا حالت میں پہنچنے کے لئے ہے ہاں کے لوگ کوشش کر کے دس بجے بستر

میں چلے جاتے ہیں اور بچوں کو تو ہر حالت میں آٹھ بجے بستر پر سلانا ہوتا ہے۔ آج کل سردی کے موسم کی وجہ سے راتیں بڑی ہیں اور جلد ہی اندھیرا ہو جاتا ہے۔ موسم گرما یعنی جون جولائی اگست میں دن بہت لمبے ہو جاتے ہیں۔ سورج رات کے دس بجے (اور مزید شمالی شہروں میں اور بھی دیر سے) غروب ہوتا ہے اور اس کے بعد بھی کافی دیر تک روشنی رہتی ہے۔ شام کو آٹھ بجے جس وقت بچوں کو سلانا ہوتا ہے اس وقت تو سورج کافی اوپر ہوتا ہے اور کمروں میں دھوپ ہوتی ہے پھر بھی کھڑکیوں پر دوہرے پردے لگا کر اندھیرا کر کے بچوں کو آٹھ بجے سلانا ہوتا ہے تاکہ وہ صبح اسکول جانے سے قبل کم از کم آٹھ گھنٹے گہری نیند سو سکیں۔

"سعید صاحب! ایک بات پوچھوں؟" گھر جاتے وقت سعید سے میں نے سوال کیا۔ "آج سے تقریباً تیس سال قبل جب میں ایک میرین انجینئر کی حیثیت سے بحری جہازوں میں ان اسکینڈی نیون (شمالی) ممالک میں آیا کرتا تھا تو ے ہاں پر اتنی بڑی تعداد میں نہ ایرانی اور عراقی تھے نہ افریقی اور ویتنامی تھے۔ کہیں کہیں چند پاکستانی، بھارتی یا ترک نظر آتے تھے اور وہ بھی صرف مرد حضرات۔ مسجد مندر کا تو نام ہی نہ تھا۔ عربوں کی ے ہ کبابوں یا گوشت کی دکانیں اور ہوٹل تھے اور نہ ایرانیوں کی ے ہ پنساری اور نانبائی کی دکانیں۔ اب تو جگہ جگہ عرب اور ایرانی، افریقی اور پاکستانی اپنے اہل خانہ کے ہمراہ جگہ جگہ سڑکوں، دکانوں، بس اسٹاپوں پر اپنے روایتی لباس میں گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ نیم عریاں لباس پہننے والے گوروں کے ملک میں ے ہ مسلمان عورتیں کالے رنگ کی عبایا (برقعے نما گاؤن) اور اپنے حجاب میں اتنا باپردہ ہو کر چلتی ہیں کہ ہمارے ملک میں ساڑھی پہن کر یا گلے میں دوپٹہ ڈال کر چلنے والی خواتین کو ے ہاں کے لوگ مسلمان سمجھنے میں دقت محسوس کریں۔ ایسی حالت میں ان یورپی ممالک کی تہذیب، تمدن اور ثقافت پر تو اثر پڑا ہو گا اس سلسلے میں ے ہاں کے سوئیڈش لوگ ایران، سعودی عرب، افریقہ اور ایشیا سے آئے ہوئے پناہ گزینوں، خصوصاً مسلمانوں کے لئے کیا سوچ رکھتے ہونگے جنہوں نے مقامی تہذیب اپنانے کی بجائے ے ہاں کے حالات میں واضح تبدیلی پیدا کی ہے۔"

"اس سوال کا جواب آپ کو مجھ سے زیادہ بہتر طور سے عمر دے سکے گا۔" شیخ سعید نے کہا۔

"بات ے ہ ہے کہ" عمر نے کہا۔ "سوئیڈن کے جو پڑھے لکھے لوگ ہیں ان کو ہم غیروں سے اتنی نفرت نہیں ہے باقی ے ہاں کا مزدور طبقہ یا بے روزگار اپنی مالی مشکلات کی وجہ ہم غیروں کی اپنے ملک میں موجودگی کو سمجھتے ہیں۔ وے سے قدرتی طور پر گزشتہ چند برسوں سے ساری دنیا میں مہنگائی بڑھنے کے ساتھ ساتھ دولت کی فراوانی میں کمی آگئی ہے جس کی تپش سوئیڈن جے سے ملک کو بھی آ پہنچی ہے۔ سوئیڈن کے کرونے (کرنسی) کی قیمت اپنے پڑوسی ممالک ناروے، ڈنمارک کے مقابلے میں بھی گر چکی ہے وہی حال ملازمت اور کاروبار کا ہے۔ لیکن ے ہ لوگ ساری باتوں کا مورد الزام ہم ہی لوگوں کو ٹھہراتے ہیں خاص طور پر مسلمانوں کو۔ ہمارے (مسلمانوں) کے خلاف تو کئی

طاقتیں کام کرتی رہتی ہیں لیکن ہم مسلمانوں کی طرف سے کوئی بھی ہماری سوچ اور نظریہ ان کو نہیں سمجھاتا۔ ایک دو دفعہ میں نے ے ہاں کے ریڈیو اور ٹی وی پر تقریر بھی کی ہے کہ "اسلام امن کا اور سلامتی کا نام ہے۔ ہم مسلمان آپ کے ملک میں ایڈز جیسی بیماری اور منشیات نہیں لائے۔ ہم تو شریف شہری بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ"۔ اور وہ ے ہ باتیں سنتے بھی ہیں اور اس سے بڑا فرق بھی پڑتا ہے۔ مگر بد قسمتی سے ہم مسلمانوں میں اتحاد اور ہم آہنگی نہیں ہے۔ ہم آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ ہر ایک اسی کوشش میں رہتا ہے کہ غلط طریقہ اختیار کر کے زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کی جائے۔ ملک، قوم اور مذہب بدنام ہو جائے تو ہونے دو۔ دراصل کوئی اچھا رہنما نہیں ہے۔ لیڈر، پروپیگنڈا اور تیسرا معلومات دینے کا طریقہ، بہت ضروری چیزیں ہیں، جن کے بغیر ہم گمنامی اور جرائم کا باعث بنے رہیں گے۔ کسی ایک کے قصوروار ہونے سے سب لوگ بدنام ہو جاتے ہیں۔ ے ہاں جتنے لوگ عراق، ایران، لبنان، فلسطین، پاکستان، سوڈان اور صومالیہ سے آئے ہیں وہ سارے مظلوم نہیں ہیں۔ ان میں کئی عادی مجرم بھی ہیں جو رشوتیں دے کر پچھلے دروازے سے یہاں پہنچ گئے ہیں جے سے پچھلے ہفتے ایک بدنام زمانہ پاکستانی مسلمان پکڑا گیا جو مقامی عورتوں کو دھوکہ دے کر ان سے زیادتی کے جرم میں ملوث تھا۔ ہمیں ے ہ ثابت کر کے دکھانا ہے کہ سارے مسلمان اے سے نہیں ہیں کئی عرب اسمگلنگ اور چوری کرتے ہوئے پکڑے جاتے ہیں تو اس کا مطلب ے ہ ہر گز نہیں ہے کہ سارے عرب اے سے ہیں اور ے ہ باتیں ہمیں ے ہاں کی حکومت اور عوام کو بتانی ہیں کہ تالاب میں ایک مچھلی گندی ہونے سے سارا تالاب گندا نہیں ہو جاتا۔ اسلام کبھی بھی غلط باتیں نہیں سکھاتا ہے۔ کسی خراب کام کے سرزد ہونے پر مجرم کو پکڑنا چاہیے۔ سارے مسلمانوں کے لئے منفی رویہ اختیار کرنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔" عمر نے بتایا۔

گاڑی گھروں تک پہنچ گئی تھی میں نے عمر سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے اسے الوداع کہا۔

فن لینڈ کے لوگ

فن لینڈ، سوئیڈن اور ناروے تینوں ممالک ایک دوسرے کے پڑوسی اور براعظم یورپ کے شمال میں ہیں جن کا آخری سرا 72 ڈگری Latitude تک جا پہنچتا ہے۔ یہ ممالک قطب شمالی کے اتنے قریب ترین ہیں کہ نقشے میں دائیں طرف دیکھیں تو روس کا سائبیریا والا علاقہ ہے اور بائیں طرف کینیڈا کا شمالی حصہ ہے جہاں اتنی سردی ہے کہ گرمیوں کے موسم میں بھی برف باری ہوتی رہتی ہے۔ یہ تینوں ممالک اسکینڈی نیویا کے ممالک کہلاتے ہیں جن کے شمال میں بحر بارینٹ (Barrent Sea) ہے جو سال کے آٹھ مہینے برف سے ڈھکا رہتا ہے اور جہاز رانی نہیں ہوتی ہے باقی چار مہینے بھی کہیں کہیں برف کی تہہ جمی ہوتی ہے اور برف توڑنے والے جہاز (Ice Breaker) کو ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے۔ اسے سے سمندر پار کرنے کے لئے چار پانچ جہاز جمع ہو کر قافلے کی صورت میں چلتے ہیں (جسے نہر سوئز میں چلتے ہیں) آگے آگے برف توڑنے والا جہاز ہوتا ہے جو سمندر کی سطح پر بنی ہوئی برف کی تہہ کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور باقی جہازوں کے لئے راستہ بناتا ہے۔ ناروے، سوئیڈن اور فن لینڈ کے جنوب میں بحر بالٹک (Baltic Sea) ہے جس میں پورا سال جہاز رانی ہوتی ہے۔ چھوٹے بڑے جہاز خاص طور پر مسافر اور ان کی گاڑیوں کو ایک بندرگاہ سے دوسری بندرگاہ لے جانے والے چھوٹے مسافر بحری جہاز (فیریاں) چلتے رہتے ہیں، جن کے ڈوبنے کی خبریں بھی آئے دن آتی رہتی ہیں۔ فیریاں بنانے والے پوری کوشش میں رہتے ہیں کہ ان میں سلامتی کا حصہ زیادہ سے زیادہ ہو۔ آج کل فن لینڈ والے دنیا کے مضبوط ترین، ماڈرن اور خوبصورت فیریاں بنا رہے ہیں۔ میرین انجینئر کی حیثیت سے سوئیڈن کی ورلڈ میری ٹائم یونیورسٹی نے مجھے ان جہازوں کی کارکردگی دیکھنے اور تحقیقاتی کام (Research Work) کے لئے ہیلسنکی بھیجا تھا۔ ہیلسنکی فن لینڈ کا سب سے بڑا شہر، دارالحکومت اور

جہازوں کے کارخانوں اور بندر گاہ ہونے کی وجہ سے مشہور ہے۔ ہیلسنکی فن لینڈ کا جنوبی اور بحر بالٹک کی بندر گاہ ہے بلکہ بحر بالٹک میں جتنی ساری بندر گاہیں ہیں ان میں فن لینڈ کی ےہ بندر گاہ(ہیلسنکی) سب سے زیادہ خوبصورت ہے اور ان علاقوں کے لوگ ہیلسنکی شہر کو پیار سے دختر بحر بالٹک(Daughter of Baltic) کہتے ہیں۔

ہیلسنکی میں میری رہائش ہوٹل اسکاٹا میں تھی جو بندر گاہ کے قریب ہونے کے علاوہ جہازوں سے وابستہ لوگوں سے تقریباً30 فیصد کم کرایہ چارج کرتے ہیں۔ شاید ےہی سبب تھا کہ تقریباً پورا ہوٹل جہاز چلانے اور بنانے والے نیوی گیٹروں، انجینئروں، سرویئروں سے بھرا ہوا تھا۔ کچھ لوگ جہازوں سے اترے تھے اور اب چھٹی کے دن گزارنے کے لئے ایک دو دن کے بعد اپنے گاؤں (فن لینڈ کے کسی شہر) یا اپنے ملک جانے والے تھے۔ یہاں کی کئی جہازراں کمپنیاں ہیں جو اپنے جہازوں کے لئے آفیسرز اور خلاصی نہ صرف اپنے ملک بلکہ دوسرے ملکوں سے بھی لے تے ہیں خاص طور پر فلپائن، چین، بنگلہ دیش، بھارت اور کچھ پاکستان کے بھی۔ ےہ لوگ جہازوں پر چھ مہینے یا ایک سال کا کنٹریکٹ مکمل کرکے آئے تھے اور اب اپنی جہازراں کمپنی سے ایک دو دن میں اپنا حساب کتاب صاف کرکے اپنے گھروں کے طرف جانے والے تھے۔ اسی طرح کچھ اے سے جہازراں اس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے جن کو ےہاں کی مقامی جہازران کمپنیوں نے ملازمت دی ہوئی تھی اور اب وہ اپنے جہازوں کا ہیلسنکی کی بندر گاہ میں آنے کا انتظار کررہے تھے۔

شام کے وقت جب میں تنہائی محسوس کرتا تھا تو ہوٹل کے تہہ خانے میں ٹیبل ٹینس کھے لنے چلا جاتا تھا وہاں پر ہوٹل والوں نے جمناسٹک اور سانا باتھ (Sauna) کا بھی بندوبست رکھا ہوا تھا۔ کبھی کبھی ہوٹل کی لابی میں آکر بیٹھ کر ٹی وی دے کھتا تھا یا ہوٹل میں آنے جانے والوں سے خیر خبر پوچھتا تھا۔ سب کو ےہ شکایت تھی کے سارے اسکینڈے نیویا کے لوگ شوخ طبیعت اور کم گو ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ہوٹل میں ایشیا اور افریقہ کے کئی لوگ ٹھہرے ہوئے تھے جن سے بات چیت کی جاسکتی تھی۔

ایک دن ہوٹل کی لابی میں ایک گورے سے بات چیت کر رہا تھا بلکہ بات چیت کرنے کی ابتداء اسی نے کی۔ پانچ چھ منٹ گزر جانے کے بعد میں نے حیرت سے اس سے پوچھا۔

”آپ ےہاں کے فنش (فن لینڈ کے مقامی باشندے) ہیں یا سوئیڈش (سوئیڈن کے رہنے والے؟)“

”نہیں بھائی۔ میرا ان ملکوں سے تعلق نہیں ہے۔“ اس نے بتایا۔

”میں بیلجیئم کے شہر اینٹورپ کا رہنے والا ہوں۔“

میں نے ہنس کر کہا۔ ”ےہ بات ہے! میں ے ہی سوچ رہا تھا کہ آج مغرب سے سورج کے سے طلوع ہو گیا ایک اسکینڈی نیوین مجھ سے خود ہی بات کررہا ہے۔“

میری اس بات پر بیلجیم کے نوجوان نے بھی قہقہہ مارا اور میری بات کی تائید کی۔ "واقعی یہ کمبخت اے سے ہیں کہ اپنوں سے بھی کھل کر بات نہیں کرتے۔ ہم بیلجیم والے تو تقریباً ان ہی کے پڑوسی ٹھہرے لیکن ہمیں بھی اپنے ملک کے لوگوں کے مقابلے میں غیر مہذب سمجھتے ہیں۔" اور ایک لمحہ سوچ کر کہنے لگا۔ "میرے خیال میں یہ عادتاً کم بولتے ہیں۔"

بیلجیم کا یہ جوان فن لینڈ حکومت کی اسکالرشپ پر اپنے ملک سے یہاں ہیلسنکی کی کسی یونیورسٹی میں زرعی سائنس جے سے کسی مضمون میں پی ایچ ڈی کرنے آیا تھا۔ یہاں کی یونیورسٹیوں کا دنیا میں بڑا نام ہے اور دنیا کے کئی ملکوں کے لوگ یہاں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں۔ شہر میں اے سے کئی افریقیوں سے ملاقات ہوتی رہتی تھی جو میڈیکل اور سائنس جے سے مضامین میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔

میرے تحقیقاتی مضمون میں مدد کرنے والے یہاں کے مقامی سپروائزر کیپٹن پیکا سے ایک دن میں نے دفتر میں کم بولنے کا سبب پوچھا۔ ہم دونوں ایک جہاز پر ساتھ بھی رہ چکے تھے وہ جہاز کے کیپٹن تھے اور میں چیف انجینئر۔

"دیکھیں چیف صاحب! ہم دنیا کے دوسروں لوگوں کی طرح کسی کے ساتھ جلدی فری نہیں ہوتے کیونکہ بچپن سے ہمیں کم بولنے کی عادت ڈالی جاتی ہے۔ سردیوں کے تقریباً آٹھ مہینے سردی اور اندھیرے میں گھر کے کمروں میں بند ہو کر اکیلے میں کتاب پڑھے گزر جاتا ہے۔ گرمیوں کے دنوں میں دن بڑے ہوتے ہیں تو باہر نکلتے ہیں لیکن ایک تو ان ملکوں کی آبادی کم ہے اور دوسری بات دفتر اور کارخانے میں اپنے کام میں اتنے مصروف رہتے ہیں کہ دوسروں سے ہنسی مذاق کا وقت نہیں ملتا۔ اگر دوستوں سے ملنے کا وقت ملتا بھی ہے تو زیادہ دیر ٹہلنے میں گزارتے ہیں کیونکہ گرمیوں کے دنوں میں بھی یہاں اتنی سخت سردی اور ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں کہ کسی سے بات کرنے کو دل نہیں چاہتا وے سے بھی چلتے پھرتے بات کرنا خطرناک ہے کیونکہ ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے گلے اور پھیپھڑوں کو نقصان پہنچتا ہے اور نمونیا جیسی بیماریاں ہو جاتی ہیں بہر حال کم بات کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ لوگ ہمیں دوستی کرنے میں کمزور سمجھیں۔"

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"ہم غیروں سے اتنی جلدی دوستی نہیں کرتے لیکن جب کرتے ہی تو پھر اسے صحیح معنوں میں اپنا سمجھتے ہیں۔" کیپٹن پیکا نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ہمارے لئے جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ ہم کم بات کرتے ہیں وہاں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہم اچھے دوست ثابت ہوئے ہیں۔ مشکل وقت پر ہمیں دوستی نبھانی آتی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ ایشیا افریقہ اور یورپ کے کئی ملکوں کے لوگ دو بول بولنے کے بعد ایک دوسرے سے اتنا فری ہو جاتے ہیں کہ دوسرا ہی محسوس کرتا ہے کہ یہ کئی برسوں سے پکے دوست ہیں لیکن مشکل وقت آنے پر کام آنے کے بجائے بھاگنے کی راہیں

ڈھونڈتے ہیں۔ مگر ہم اسکینڈی نیویا کے لوگوں کی ےہ عادت نہیں ہے۔ ہم یہ ہی کہیں گے کہ دوستی سوچ سمجھ کر کرنی چاہےے اور ایک دفعہ جب دوستی ہو جائے تو پھر اسے صحیح طرح نبھانا چاہےے۔" ےہ کہہ کر کیپٹن پیکا مسکرائے اور ایک لطیفہ سنایا۔

"فن لینڈ کے لوگوں کے کم بولنے پر ایک لطیفہ مشہور ہے۔ دو فنش (فن لینڈ کے رہنے والے) دوست شراب پےنے کے لئے ایک ہوٹل میں پہنچے۔ تقریباً آدھ گھنٹہ خاموشی سے شراب پےنے کے بعد ایک نے کہا۔ "آج موسم بڑا زبردست ہے۔" جواب کے لئے دوسرا آدھ گھنٹہ سوچتا رہا اور پھر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ہم لوگ ےہاں پےنے آئے ہیں یا باتیں کرنے۔"

حسین ترین۔ کالی جوزفین

سوئیڈن جہاں سال بھر موسم خراب رہتا ہے وہاں جون کے تقریباً پندرہ دن اچھے بھی ہوتے ہیں جن میں کبھی کبھی سورج نکلتا ہے۔ سڑکوں اور عمارتوں کی دیواروں پر ہلکی ہلکی دھوپ نظر آتی ہے۔ جسم پر کوٹوں کی تہہ چڑھانے کے بجائے ایک ہی سوئٹر یا کوٹ میں گزارہ ہو جاتا ہے۔ ان چند دنوں کو آپ چاہے بہار کا موسم سمجھیں یا Sunny Days کہیں، ے ہاں کے لوگ دل لگی اور معاشقے کی باتیں انہی دنوں میں زیادہ کرتے ہیں۔ ادھر ادھر سیر و سیاحت اور پارکوں میں بیٹھنا انہیں دنوں میں زیادہ اچھا لگتا ہے۔ کام سے چھٹی اور دعوتوں کے لئے یہی دن مخصوص ہوتے ہیں۔ ایک دعوت (ڈنر) ورلڈ میری ٹائم یونیورسٹی کی طرف سے بھی ہوتی ہے جس میں دنیا کے مختلف ملکوں سے سوئیڈن میں دو سال کے لئے آئے ہوئے جہاز راں کمپنیوں اور بندرگاہوں کے نمائندے ہوتے ہیں۔ ان میں خواتین اور حضرات دونوں ہوتے ہیں جو دو سال کی رہائش میں اپنی اپنی فیلڈ میں مزید کورسز اور تربیت حاصل کرتے ہیں۔

اس رات ڈنر پر ہم تقریباً 200 نمائندے تھے اور سب اہتمام سے تیار ہو کر آئے تھے۔ خصوصاً خواتین جو وے سے پورا دن ہماری طرح جینز کی پتلونیں پہن کر پھرتی ہیں لیکن اس دعوت میں ہر ایک کوشش کر کے کئی رنگوں والا چمکتا دمکتا اپنا قومی لباس پہن کر آئی تھیں اور تمام ملکوں کی خواتین اپنے چہرے کو مزید خوبصورت اور پرکشش بنانے کے لئے زیادہ میک اپ کر کے آئی تھیں۔ مے رے دائیں ہاتھ والی کرسی پر میرا کورس میٹ یمن کا انجینئر محمد مبارک تھا۔ سامنے کی کرسیوں پر پورٹ مینجمنٹ کورس سے وابستہ خواتین بیٹھ رہی تھیں۔ مے رے بالکل سامنے والی کرسی پر جے سے ہی نائیجریا (افریقہ) کی جوزفین بیٹھی تو میں نے اس کی طرف اشارہ کر کے مبارک سے آہستہ سے کہا۔ "اردن کی جہاز ران کمپنی کا اکانومسٹ عاید خلف کہتا ہے کہ یہ جو سلمٰی ستاروں والی جوزفین ہے وہ اس سال ساری خواتین کے نمائندوں میں اول نمبر پر ہے۔"

"کس میں؟ پڑھائی میں یا جہاز چلانے میں؟" مبارک نے آرام سے پوچھا۔ اور اس کے جواب میں، میں اگر پڑھائی میں یا جہاز چلانے میں کہتا تو مبارک سن کر خاموشی سے قبول کر لیتا کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ کئی افریقی کالی عورتیں دنیا بھر کی خواتین سے تو کیا مردوں سے بھی زیادہ پڑھی لکھی اور قابل ہیں اور بحری جہاز جو ایک خاتون کے

لئے ہوائی جہاز چلانے سے زیادہ مشکل کام ہے مگر کافی خواتین بحری جہاز کی کیپٹن اور چیف انجینئر ہو گئی ہیں۔ اور ایسی دو خواتین جو بحر اوقیانوس جے سے خطرناک سمندر میں جہاز رانی کرتی رہیں ہمارے گروپ میں موجود تھیں۔

"نہیں، ان دونوں میں نہیں۔" میں نے مبارک کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "جوزفین خوبصورتی میں اول ہے۔ وہ ورلڈ میری ٹائم یونیورسٹی کی حسین ترین عورت ہے۔"

"ے ہ جوزفین!" مبارک نے اے سے اچھل کر کہا جے سے کسی بچھو نے اسے ڈنک مار دیا ہو۔ ٹیبل کی اس طرف بیٹھی ہوئی جوزفین بھی مبارک کے منہ سے اپنا نام سن کر چونکی لیکن مے رے اشارے پر کہ ہم آپ کو نہیں بلا رہے ہیں وہ دوسروں کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئیں۔ مبارک اپنی غلطی کا احساس کر کے اب مجھ سے دھیمی آواز میں (مگر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر) اعتراض کرنے لگا۔ "اس کالی حبشن کو کس طرح سے کہتے ہو کہ ے ہ سب میں خوبصورت ہے؟"

"یار تم مجھ سے کیوں لڑ رہے ہو۔" میں نے مبارک کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کے لئے کہا۔ "ے ہ میں نہیں کہہ رہا ہوں، تمہارا عرب دوست اور جوزفین کا کورس میٹ عاید خلف کہتا ہے۔"

"کیا کہتا ہے؟" مبارک ہمیشہ کی طرح لگ رہا تھا کہ اس دن بھی کچھ زیادہ ہی پی کر آیا تھا۔

"ے ہی کہ نائیجیریا کی ے ہ سیاہ فام جوزفین بڑی ہی حسین ہے۔"

"لیکن ے ہ تو نائیجیریا کی کالی حبشن ہے۔" مبارک نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"نائیجیریا کے سارے لوگ کالے ہوتے ہیں، مبارک! بلکہ پورے افریقہ کے مقامی باشندے کالے ہوتے ہیں۔" میں نے مڑ کر مبارک کے کان میں کہا کیونکہ اس کا چہرہ سامنے بیٹھی ہوئی جوزفین کی طرف تھا اور وہ اس وقت غالباً جوزفین کے حسن کا موازنہ اس کے قریب بیٹھی ہوئی جنوبی امریکہ اور یورپ کی گوری خواتین سے کر رہا تھا۔

"لیکن دوست! مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ جوزفین کالی ہو کر بھی تم لوگوں کو حسین کے سے لگتی ہے؟" مبارک نے اپنی ضد قائم رکھتے ہوئے پوچھا۔

میری دوسری طرف ملائیشیا کا کیپٹن رزالی تھا جو ہماری گفتگو سن رہا تھا۔ "یار رزالی اس سے تو میں بات کر کے پھنس گیا ہوں۔ عجیب گدھا ہے ے ہ مبارک بھی۔" پھر مبارک سے کہا: "جوزفین کالی ہو کر خوبصورت نہیں ہو سکتی ہے کیا؟"

"ے ہی تو سوال میں آپ سے کر رہا ہوں؟" مبارک نے کہا۔

"مبارک! جوزفین کالی ہو کر بھی خوبصورت کیوں ہے ے ہ سوال تو بہتر ہے کہ مجنوں سے کیا ہوتا۔"

"کس کورس میں ہے؟ میری ٹائم ایڈمنسٹریشن میں یا پورٹ مینجمنٹ میں؟" مبارک نے پوچھا۔

"کون؟ جوزفین؟" میں نے سوال کیا۔

"جس کی آپ بات کر رہے ہیں۔ مجنوں" مبارک نے کہا۔

"بابا مجنوں غریب تو میٹرک بھی نہ کر سکا تھا۔ ان دنوں میں کہاں تھا ے ہ نظام تعلیم؟ وہ تو لیلیٰ کی ہی تسبیح پڑھتا رہا"۔ میں نے مبارک کو سمجھانے کی کوشش کی اور دل ہی دل میں سوچنے لگا مبارک آج زیادہ ہی پی کر آیا ہے جو اسے لیلیٰ مجنوں کی مشہور داستان عشق معلوم نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے مجنوں ایران کا ہو اور ے ہ غریب عرب اس سے غیر واقف ہو۔ "مبارک مجنوں ایک مشہور تاریخی عاشق گزرا ہے جس کی محبوبہ لیلی اپنی جوزفین جیسی کالی کوئل تھی لیکن مجنوں کو ساری دنیا میں اپنی وہ رات کے اندھیرے جیسی لیلیٰ پسند تھی"

"وہ! مگنوں!" مبارک تقریباً اپنی کرسی سے اچھل پڑا۔ "قیس مگنوں!"

"جی ہاں! مگنوں!" میں نے دہرایا اور ہنسنے لگا۔

"کیوں بھئی ہنس کیوں رہے ہو؟" مبارک نے پوچھا۔

"اس لئے کہ تم عربوں کا پتہ نہیں چلتا کہ کہاں 'گ' پڑھا جائے اور کہاں 'ج'؟ مجنوں کو مگ نوں اور جمال کو گمال کہتے ہو۔ گارنٹی کو جیرنٹی اور ایجنڈا کو ایگنڈا کہتے ہو...."

میری دوسری طرف بیٹھے ہوئے ملائیشیا کے کیپٹن رزالی نے میری تائید کرتے ہوئے کہا۔ "اور مبارک تم تو P کو بھی B بولتے ہو۔ شپ (جہاز) کو ہمیشہ شب بولتے ہو اور "Prevention of Port Pollution جو تمہاری تھیسز کا عنوان ہے اسے برویشن آف بورٹ بالوشن پڑھتے ہو۔"

کو کارا ما کرا....

بحری جہازوں کے حوادث پر لیکچر دے نے کے لئے ہر سال کی طرح اس سال بھی امریکہ سے وہاں کی کوسٹ گارڈ کا ایک ایڈمرل رینک کا نیول افسر سوئیڈن آن پہنچا۔ وہ صرف ایک ہفتے کے لئے آیا تھا اور اس تھوڑے سے عرصے میں مذکورہ مضمون مکمل کرنا ناممکن تھا اس لئے انہوں نے صرف اہم چیزوں کو اٹھایا۔ پورا ہفتہ لیکچر دے تے رہے، فلمیں دکھاتے رہے اور بحث مباحثہ بھی چلتا رہا۔ جہازوں کو خراب تیل سمندر میں خارج نہیں کرنا چاہے ے، امریکہ کے کناروں کے قریب پہنچ کر خبر دار ہونا چاہے ے، جہاز کا رخ تبدیل کرنے کے لئے اسٹیئرنگ گیئر صحیح رکھنا چاہے ے، افریقہ اور ایشیا سے جو اناج امریکہ کے لئے لایا جاتا ہے وہ کیڑوں سے پاک ہونا چاہے ے، سمندر میں دوران سفر بحری قوانین پر سختی سے عملدرآمد کرنا چاہے ے وغیرہ وغیرہ۔ بقول یمنی انجینئر محمد مبارک کے سارا الزام ہم غریب ملکوں پر تھوپا جا رہا تھا۔ سوڈان کے جہاز ران عبالہادی تغالی نے مبارک کو خبر دار کرتے ہوئے کہا۔ "چپ چاپ سنتے جاؤ ورنہ امریکہ کا ساتوں بحری بیڑہ یمن پر حملہ کرنے کے لئے عدن پہنچ جائے گا۔"

لیکن مبارک نے کھڑے ہو کر کہہ ہی دیا۔ "سر آپ امریکی اتنی زیادہ حفاظت اور صفائی کیوں چاہتے ہیں؟ کہیں آپ کی نیت ہم تیسری دنیا کی جہاز رانی کی صنعت کی حوصلہ شکنی کرنا تو نہیں ہے۔"

ایڈمرل صاحب، وہ بھی امریکی بحریہ کے، اس قسم کے سوالات کی امید نہیں رکھتے تھے لیکن پورا ہفتہ اس قسم کے سوال چلتے رہے۔ ے وہ تو پھر بھی شکر ہے (اور یقینا ایڈمرل صاحب اور یونیورسٹی والے بھی کر رہے ہونگے جنہوں نے امریکی بحریہ کی اس بڑی آفت کو امریکہ سے سوئیڈن بلایا تھا) کہ ایرانی جہاز رانوں کو اس لیکچر سے دور رکھا گیا۔ یا شاید ایرانی احتجاجاً خود ہی پورا ہفتہ غیر حاضر رہے۔

آخری دن آخری پیریڈ میں ایڈمرل صاحب کہنے لگے کہ "پورا ہفتہ جو میں نے پڑھایا ہے اس کا ٹیسٹ لوں گا۔" اب ہم لوگ کیا کر سکتے تھے شیر شیر ہے۔ وہ چاہے انڈے دے یا بچے! بحث کرنے کی کس کو ہمت۔

"کس قسم کا ٹیسٹ لیں گے؟" اتنا بھی مبارک نے ہمت کر کے پوچھا۔

"آپ کس قسم کا ٹیسٹ چاہتے ہیں؟" جواب کے بجائے ایڈمرل صاحب نے سوال کیا۔

"اوپن بک والا۔ یعنی جس میں کتاب دے کھنے کی اجازت ہو۔" تیونس کے فرنچ بولنے والے عرب جہاز ران نے کہا۔

"نہیں نہیں۔اس سے Book Close والا صحیح رہے گا۔ کھلی ہوئی کتاب والا ٹیسٹ مشکل رہے گا۔ جس نے پڑھا ہو گا وہی کھلی کتاب سے جوابات ڈھونڈھ سکتا ہے اور ے ہاں ایک نہیں پندرہ کتابیں ہیں جن کو ابھی پڑھا کسی نے نہیں ہے۔" تنزانیہ کے حبشی جہاز ران انجینئر دوبلیو نے رائے پیش کی۔

"بند کتابوں والا ٹیسٹ ہونا چاہے لیکن سوال مضمون ٹائپ ہونے کی بجائے Objective ٹائپ ہونے چاہئیں۔" فلپائن کی نیول آرکٹیکٹ انجینئر مس ڈیزی نے مشورہ دیا۔

ایڈمرل نے کہا۔"اب آپ مزید مشورے نہ دیں۔(مبارک نے جو اس وقت میرے ساتھ بیٹھا تھا اپنی عربی انداز والی انگریزی میں ایڈمرل صاحب کے اس جملے پر آہستہ سے مجھ سے کہا: ہمیں پتہ ہے کرو گے وہی جو چاہو گے۔ روس ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ورلڈ آرڈر آپ کے ہاتھ میں ہے) ایڈمرل صاحب نے مزید کہا۔ میں پہلے سے پیپر تیار کر کے آیا ہوں اور وہ ایم سی کیو پی اسٹائل ہو گا۔(MCQP یعنی، Multiple Choice Question Paper میں ہر سوال کے چار جوابات دے ئے جاتے ہیں ان میں سے ایک جو صحیح جواب کے برابر ہوتا ہے اس پر نشان لگانا ہوتا ہے۔)

سب نے دبے ہونٹ بیڈ لک! بیڈ لک! کہہ کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا کیونکہ اے سے امتحان میں پرچہ دے نے والا ممتحن کے رحم و کرم پر ہی رہتا ہے اور ممتحن کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے کہ کس جواب کو زیادہ صحیح قرار دے۔ دراصل اے سے سوالوں کے دے ئے ہوئے سارے جوابات صحیح ہوتے ہیں اور آپ چاہیں کتنی بھی بحث کریں ممتحن سے جیت نہیں سکتے مثال کے طور پر ایک عام سوال لے لیں کہ حیدرآباد کہاں ہے؟

اور نے چے دے ئے ہوئے چار جوابوں سے کونسا درست ہے؟

ا۔ حیدرآباد ایشیا میں ہے۔

(ب) حیدرآباد سندھ میں ہے۔

(ت) حیدرآباد ٹنڈو ٹھوڑو کے قریب ہے۔

(ج) جہاں ریشمی گلی اور پھلیلی ہے۔

اب ایسے جوابات میں سے (جو ظاہری طور پر سارے صحیح ہوتے ہیں) صحیح ڈھونڈنا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے جتنا چڑیا کے نومولود بچے کی جنس معلوم کرنا اور بقول ہمارے کیپٹن سلیم کے جسے پیا چاہے وہی سہاگن کہلائے یعنی جسے ممتحن چاہے صحیح جواب قرار دے کر پاس کرے یا فیل کرے اور یہی سبب تھا کہ سارے لوگ اپنی ناپسندیدگی کا مبہم سا اعلان کر رہے تھے سوائے وینزویلا کے چیف انجینئر مسٹر ایفرین کے۔ وہ تالیاں بجا کر ویری گڈ ویری گڈ کہنے لگا۔

"ے ہ پاگل اے سے ہی تالیاں بجارہا ہے۔" یمن کے مبارک نے مجھ سے کہا۔ "اس ہسپانوی زبان بولنے والے کو یا تو ایڈمرل صاحب کی امریکی طرز کی انگریزی سمجھ میں نہیں آئی ہے یا ایسے ہی چمچہ گیری پر اتر آیا ہے کیونکہ ایک ہی براعظم میں رہنے کی وجہ سے کولمبیا، پانامہ اور وینزویلا جے سے ملکوں کا ے ہ ایڈمرل بڑا تھانیدار ہوا جس کی خوشامد کرنا ے ہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔"

چائے کے وقفے پر ہم لوگوں نے ایفرین کو پکڑ لیا کہ وہ تالیاں بجا کر خوش کیوں ہو رہا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ صرف ہاں یا ناں لکھنے والے ٹیسٹ میں پاس ہونے کے چانسز ففٹی ففٹی ہوتے ہیں کیونکہ اس میں لڑکا نہیں تو لڑکی والا حساب ہوتا ہے لیکن MCQP میں چار جوابوں میں سے ایک صحیح ہوتا ہے اور ایفرین جے سے بندے کے لئے جو انگریزی اور جہاز رانی میں کمزور ہے ے ہ کام تو اور بھی مشکل تھا۔

"امیگو! اس لئے تو میں خوش ہو رہا تھا۔" ایفرین جو انگریزی بولتے وقت بھی امیگو (دوست) سنوریتا (محترمہ) گراسش (شکریہ) جے سے ہسپانوی الفاظ استعمال کرتا تھا، قہ قہ لگا کر کہنے لگا "تاکہ مے رے ساتھ اور بھی کئی لوگ فیل ہو جائیں۔ وے سے اے سے سوالوں کا جواب عقل سے نہیں فال سے نکالا جاتا ہے جس کے لئے سب سے بہتر فال ہسپانوی ہے۔

کوکارا.... ماکارا

تیترے.... فئے

پیغالی.... پیغالی

کے ایجا.... فئے

"جس جواب پر آخر والا فئے آجائے وہ صحیح جواب ہوتا ہے۔"

ہسپانوی لوک گیت "کوکاراماکار" اے سے ہے جے سے ہمارے ہاں "ارچک مرچک دھ مہ دھرچک" یا انگریزوں کے پاس "انی منی مینامور...."

شماریات میں یقین نہیں ہے

سوئیڈن میں باہر سے آنے والے پروفیسروں میں سے ایک پروفیسر جرزی لس ونک(Jerzy Listewink) بھی تھے جو پولینڈ کی میرین یونیورسٹی سے ہر سال ایک ہفتے کے لئے ےہاں تدریس کے لئے آتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خوش مزاجی اور اپنے مضمون میں ماہر ہونے کی وجہ سے پروفیسر جرزی ہر دلعزیز شخصیت تھے۔ آپ پولینڈ کے ہی رہنے والے تھے۔ ہماری طرح میرین انجینئر تھے۔ جہاز کا چیف انجینئر بننے کے بعد دنیا کی مختلف جہازران کمپنیوں میں سپرنٹنڈنٹ انجینئر کی حیثیت سے کام کیا۔ سنگاپور کی معروف جہازران کمپنیNeptune میں بھی کافی عرصہ ملازمت کی۔ آج بھی سنگاپور اور ملائیشیا کے کئی پرانے جہازران پروفیسر جرزی سے واقف ہیں۔ ان کی سمندری ملازمت کا ایک بڑا حادثہ مشہور ہے۔ افریقہ کے نچلے حصے سے گزرتے وقت کیپ آف گڈ ہوپ کے پاس جہاں بحرہند اور بحراوقیانوس ملتے ہیں اور جہاں پورا سال سمندر میں جوش رہتا ہے، ان کا جہاز ڈوبتے ڈوبتے بچ تو گیا لیکن جہاز کا پنکھا(Propeller) ٹوٹ گیا۔ اے سے سمندر میں پنکھے بغیر ایسا ہے جے سے کسی صحرا میں ٹرک کا ٹائی راڈ ٹوٹنا۔ یعنی انجن چلتا رہے اور پہیے اپنی جگہ سے ہل نہ پائیں۔ لیکن پروفیسر جرزی نے جوان دنوں میں اس جہاز کا چیف انجینئر تھے جہاز کو ڈوبنے سے بچالیا۔ کچھ عقل اور تجربے سے کام لے کر کچھ دعائیں مانگ کر۔ شاید اس لئے وہ کمیونسٹ ملک سے تعلق رکھنے کے باوجود ہمیشہ کہتے ہیں کہ کوئی بھی جہازران دہریا نہیں ہو سکتا خصوصاً کیپ آف گڈ ہوپ کے پاس سے گزرنے والا۔ پروفیسر جرزی نے میرین سائنس میں ایم ایس سی کرنے کے بعد جہازوں کی مشینوں کے کسی پہلو پر پی ایچ ڈی کی۔ آپ انگلینڈ کے انسٹی ٹیوٹ آف میرین انجینئرز کے فیلو ممبر بھی ہیں۔ آپ بحری جہازوں کے انجنوں کی کارکردگی کی شماریات پر لیکچر دے تے ہیں۔

"یار و شماریات پڑھانا میرا کام ہے لیکن میں اس پر یقین نہیں رکھتا کیونکہ شماریات سے حالات کا ہمیشہ صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے۔"

"آپ ےہ کے سے کہتے ہیں؟" ہم نے حیرت سے پوچھا۔

"دے کھو اس کا اندازہ آپ اس چھوٹی سی مثال سے کر سکتے ہیں۔ ایک آدمی اپنی بیوی کی روز پٹائی کرتا ہے جبکہ دوسرا آدمی بالکل نہیں کرتا لیکن شماریات کی رو سے ہر آدمی اپنی بیوی کی ہر دوسرے روز پٹائی کرتا ہے۔"

انجن کے پرزوں کو گھسنے، گرم ہونے اور آواز سے بچانے کے سلسلے میں لیوب آئل کی اہمیت اور خاصیت پر لیکچر دے نے سے پہلے ہمیں کہا

"One who lubricates well travels well"

اور پھر کچھ سوچ کر شاید اپنے ملک پولینڈ کے راشی نظام کا سوچ کر کہنے لگے ےہ مقولہ نہ صرف جہاز رانوں کے لئے ہے بلکہ کچھ ممالک میں بندر گاہ کی ملازمت میں ترقی حاصل کرنے کے لئے بھی اہم ہے۔

"جہازوں کے انجنوں میں سے بہترین کونسا انجن ہے؟" ہم لوگوں نے ان سے سوال کیا۔

"دیکھیں ہمارے ملک پولینڈ میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ ہر گیدڑ کو اپنی دم اچھی لگتی ہے۔ اس طرح مجھے بھی وہ میرین انجن بہتر لگتا ہے جو مے رے ملک کا تیار کردہ ہے۔" انہوں نے جواب دیا۔

پروفیسر جرزی میں، اور تو بہت اچھائیاں ہے لیکن ایک خرابی بھی ہے وہ ےہ کہ لیکچر شروع کرنے کے بعد اسے چائے کے وقفے کا احساس نہیں رہتا۔ ایک تو سوئیڈن جے سے ٹھنڈے ملک میں جو چائے کا عادی نہیں ہوتا ہے وہ بھی بار بار پینا چاہتا ہے اور پروفیسر کے ےہ لیکچر سننے والے سارے میرین انجینئرز تھے، جو جہاز رانی کے وقت مستریوں کی طرح چائے کے اے سے عادی ہو جاتے ہیں کہ کوئی بھی کام بغیر چائے پے ئے ان سے نہیں ہو پاتا۔ مجبوراً ہم دبے دبے الفاظ میں ہاتھوں کے اشاروں سے پروفیسر صاحب کو چائے کی یاد دلاتے تھے۔

"اوہ معاف کیجئے گا! واقعی چائے کے بغیر بھی کوئی زندگی ہے۔" پروفیسر صاحب جواب کے ساتھ جیب سے سگریٹ نکالتے تھے۔

تیسرا شوہر سوچ کر کروں گی

یہاں ناروے، فن لینڈ وغیرہ میں اور خاص طور سوئیڈش سوسائٹی میں شادی کا وہ تصور نہیں جو ایشیا، افریقہ اور لے ہاں تک کہ یورپ کے دوسرے ممالک میں پایا جاتا ہے۔ یہاں سوئیڈن میں کئی خواتین بچوں کو جنم پہلے دیتی ہیں شادی کا بعد میں سوچتی ہیں اور شادی کے بعد تھوڑی سی تو تو میں میں پر ایک دم جدائی اختیار کر لیتی ہیں۔ بچہ ابھی پیٹ میں ہی ہوتا ہے تو حکومت کی طرف سے ماں کا الاؤنس ملنا شروع ہو جاتا ہے جو اٹھارہ سال تک ملتا رہتا ہے۔ بہر حال بچہ ہو یا نہیں طلاق کے بعد عورت کو دوسرے الاؤنس کے علاوہ حکومت اور شوہر کی طرف سے جدائی الاؤنس بھی ملنے لگتا ہے۔ بس ے ہ سمجھیں کہ سوئیڈن میں طلاق کے بعد عورت کی لاٹری نکل آتی ہے۔

ہمارے ممالک میں طلاق کے بعد عورت مصیبت میں گرفتار ہو جاتی ہے لیکن ےہاں سوئیڈن میں (اور پڑوسی ملکوں ناروے، ڈنمارک اور فن لینڈ میں) مرد کا برا حال ہو جاتا ہے عورت مالا مال ہوتی ہے۔ طلاق کی صورت میں گھر پر قبضہ بھی عورت کا ہوتا ہے اور مرد کو تین کپڑوں، قمیص، پتلون اور مفلر سمجھ لیں۔ میں گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔ مرد کے گھر چھوڑنے پر اس کی طلاق شدہ بیوی سابق شوہر کے سامان کی گٹھری بنا کر کچرے کے ڈبے میں پھینک دیتی ہے یا شہر میں ہفتے میں ایک یا دو دفعہ لگنے والی جمعہ مارکیٹ ٹائپ LOPIS (سستی مارکیٹ) میں اونے پونے داموں میں نیلام کر دیتی ہے۔ اسکینڈی نیوین ممالک میں جہاں ہر چیز مہنگے داموں ملتی ہے وہاں اس قسم کی لوپیز مارکیٹ غیر ملکی اور مقامی لوگوں کے لئے دبئی اور سنگاپور سے بھی سستی ہوتی ہیں۔ ان مارکیٹوں میں شہر یا ملک چھوڑنے والے، مکان تبدیل کرنے والے، کسی دکان کے دیوالیہ ہونے پر اپنے سامان کی فوری فروخت چاہنے والے ہر قسم کی اشیاء میز پر رکھ کر بیچتے ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو فالتو سامان بیچنا چاہتے ہیں اور طلاق والی خواتین بھی ہوتی ہیں جو اپنے سابق شوہر کی یاد بھلانے کے لئے نہ صرف اس کی چیزیں بلکہ اپنی وہ چیزیں بھی جو اچھے دنوں میں شوہر صاحب نے بطور تحفہ دی تھیں، ٹیبل پر رکھ کر اونے پونے میں فروخت کر دیتی ہیں۔

ایک دن ایسی ہی مارکیٹ میں تقریباً پچیس تیس برس کی ایک خاتون کپڑے بیچ رہی تھی۔ اس کے پاس بڑی زبردست ٹائیاں اور مردانہ قمیصیں تھیں۔ قمیصیں تو بالکل نئی نئی اور پلاسٹک میں پیک تھیں۔ اس کے علاوہ گھر کے کام کی کئی چیزیں تھیں۔ ہماری طرح سوئیڈن میں دو سال کے لئے آئی ہوئی نائیجیریا کی میرین اکیڈمی کی میڈم جولیانا بھی وہاں موجود تھی۔ ان دنوں میں اس کا شوہر چھٹیاں گزارنے کے لئے اس کے پاس سوئیڈن آیا ہوا تھا۔ وہ اپنے شوہر کے لئے اس عورت سے کچھ سامان خرید رہی تھی۔ میں نے ایک دو قمیصیں نکال کر اپنے جسم پر پہنی ہوئی قمیص پر رکھ کر دیکھا تو مجھے تنگ محسوس ہوئیں۔

"تمہارے آنے سے پہلے ےہ قمیصیں چیک کر چکی ہوں" میڈم جولیانا نے کہا۔ "میں اپنے شوہر کے لئے لینا چاہتی تھی لیکن ےہ قمیصیں اس کے جسم سے کافی تنگ ہیں۔"

قمیصیں واپس کرتے ہوئے مجھے بھی بڑا افسوس ہوا ےہ قمیص بڑی دکان میں ایک ڈیڑھ ہزار روپے سے کم نہیں ہونگی جبکہ ےہاں سو سوا سو روپے سے بھی کم قیمت میں مل رہی تھیں۔ ہمیں واپس کرتے ہوئے دے کھ کر بیچنے والی عورت نے کہا "لے لو بھئی بڑی زبردست چیز ہے کہو تو قیمت اور کم کر دوں؟"

"لینا تو چاہتے ہیں لیکن بہت تنگ ہیں۔ لگتا ہے تمہارا شوہر بہت دبلا پتلا ہے۔"

"ہے نہیں بلکہ تھا۔" اس نے مسکراتے ہوئے تصحیح کی۔

"کیا جاگنگ چھوڑ دی ہے اور اب وہ موٹا ہو گیا ہے؟"

میں سمجھا وہ اس کی جسامت کی بات کر رہی ہے۔ جولیانا سمجھ گئی اور ہنس کر قمیصیں بیچنے والی خاتون کی رام کہانی سنانے لگی جو وہ جولیانا کو میرے آنے سے پہلے سنا چکی تھی کہ اس کا اپنے شوہر کے ساتھ نباہ نہ ہو سکا اس لئے طلاق کی صورت میں اس سے آزادی حاصل کر لی ہے اور اب اس کا سامان بیچ کر اپنے گھر کو سابق شوہر کی یاد سے پاک کرنا چاہتی ہے۔

جولیانا کی بات سن کر سامان بیچنے والی سوئیڈش عورت ہنسنے لگی اور جولیانا کی بات کی تائید کرتے ہوئے مجھ سے کہا: "ے ہ درست کہہ رہی ہیں۔ اب مجھے اس کے ساتھ رہنا ایک دن بھی برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اس لئے میں نے اس سے کہا کہ اب مجھ سے الگ ہو جاؤ تمہاری مہربانی ہو گی۔ اس نے اقرار میں سر ہلایا اور کاغذات پر دستخط کے ے اور میں اسے رے لوے اسٹیشن چھوڑ آئی۔ اب مجھے اس کی چیزیں دے کھ کر بھی غصہ آتا ہے۔"

"اس سے تو بہتر تھا کچرے کے ڈبے میں پھینک دیتی۔" میں نے اسے مخلصانہ مشورہ دیا۔

"کسے؟ اس شوہر کو۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں اس کے سامان کو۔" میں نے وضاحت کی۔

"شوہر کو کچرے کے ڈبے میں پھینکنا اگر ممکن ہوتا تو وہ بھی کر دیتی وے سے تو اس کا ے ہ سامان بھی پھینکنا چاہے ے لیکن ے ہاں لانے سے مجھے اس کے چارپے سے مل جائیں گے۔"

"اچھا نیا شوہر جو ہے وہ کیسا ہے؟ میرا مطلب ہے موٹا ہے یا دبلا؟" مذاق کے موڈ میں دیکھ کر ہم نے سوال کیا۔

"وہ بھی پہلے والے کی طرح دبلا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"تو پھر ے ہ قمیصیں اس ہی کے کام آجاتیں۔" نائیجیریا کی جولیانا نے اسے مشورہ دیا۔

"توبہ کریں تیلی نہ لگادوں۔" اس نے کچھ غصے سے کہا۔ "میں ے ہ ہرگز نہیں چاہتی کہ اس کمبخت (سابق شوہر) کی کوئی چیز، خیال یا کوئی دھندلی سی یاد مجھے اس کا احساس دلائے"

"ویری گڈ۔" ہم لوگوں نے ماحول کو خوشگوار بناتے ہوئے کہا۔ "مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ سوئیڈن میں ہمارے ہوتے ہوئے ایک دفعہ پھر معاملہ طلاق تک پہنچا تو تمہارے اس نئے شوہر کی قمیصیں بھی ہمارے لئے بیکار ثابت ہونگی۔ مجھے فٹ آئیں گی نہ جولیانا کے شوہر کو۔"

ہمارے مذاق کا مذاق میں جواب دے نے کے لئے اس نے ٹیبل سے انچی ٹیپ اٹھا کر کہا: "ناپ لے لوں تا کہ تیسرے شوہر کے لئے اسے دوست بناؤں جس کے سے نے اور بازوؤں کا ناپ آپ سے ملتا ہو"

ہم نے ہنستے ہوئے اسے "ہائے دو" (خدا حافظ) کہا اور دوسرے اسٹال پر چلے گئے۔ راستے میں جولیانا کہنے لگی۔

"ے ہاں کے رسوم ورواجات بھی عجیب ہیں۔"

"بہر حال قمیصیں اپنے نصیب میں نہیں تھی۔ کیا زبردست رنگ کی تھیں۔" میں نے کہا۔

دوسرے دن ناشتے پر میس میں جولیانا اپنے ٹیبل سے اٹھ کر مے رے پاس آئی۔ "کل جو سوئیڈش لڑکی قمیصیں بیچ رہی تھی اس کے سابق شوہر کی جسامت معلوم کرنا چاہو گے؟" اور پھر آہستہ سے کہا۔ "ذرا پیچھے والے ٹیبل پر مڑ کر دیکھو۔"

پیچھے دیکھا تو ترکی کا نمائندہ جہازوں کا انجینئر حسن بقال کل والی قمیصوں میں سے ایک پہن کر گپیں مار رہا تھا۔

"کیوں بھئی خیریت تو ہے؟" ہمیں گھور کر دے کھنے پر حسن بقال نے پوچھا۔

"آپ کی شرٹ دیکھ رہے ہیں۔ بڑی زبردست ہے۔" جولیانا نے اسے کہا۔ "کہاں سے لی ہے۔"

حسن بقال ایک نمبر کا استاد آدمی، کہاں ہماری پکڑ میں آسکتا ہے۔ جولیانا کی طنز کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایک دم جواب دیا۔

"ایسی اعلیٰ قمیصیں صرف استنبول میں بنتی ہیں۔"

ہم نے قمیص پر لکھا ہوا Made in Norway پہلے ہی پڑھا ہوا تھا۔ "لیکن حسن قمیص پر میڈ ان ناروے لکھا ہوا ہے۔" میں نے حسن سے کہا۔

ے ہ تو ہم ترکی والے دوسرے لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لئے لکھتے ہیں جے سے آپ لوگ پاکستان کی بنی ہوئی اشیاء جاپانی یا امریکی ساختہ لکھتے ہیں۔

ایک اہم شخصیت سے ملاقات

مالمو کے سٹی روٹری کلب کا ڈنر ہر ہفتے SAVOY ہوٹل میں ہوتا ہے۔ سامنے مالمو شہر کا مرکزی اسٹیشن ہے جہاں سے بسیں اور ریل گاڑیاں شہر اور اس کے نواحی علاقوں کو جاتی ہیں۔ ایک رات سردی کے موسم میں روٹری کلب سے واپسی پر اپنے علاقے ہولما کے لئے بس لے نے کے لئے سینٹرل اسٹیشن پہنچا۔ سخت سردی اور تیز ٹھنڈی ہوائیں چلنے کی وجہ سے شہر میں جلدی سناٹا چھا گیا تھا۔ سڑکوں پر لوگوں کی چہل پہل تو کیا گاڑیاں بھی کوئی اکا دکا ہی نظر آ رہی تھیں۔ میں گرم کوٹ ٹوپ پہنے اور مفلر اوڑھے بس اسٹاپ پر پہنچا تو ایک شخص مجھ سے پہلے وہاں بس کا انتظار کر رہا تھا۔ غور سے دیکھا تو وہ بیساکھیوں کے سہارے کھڑا تھا۔ مے رے ہیلو کہنے پر اس نے بھی خوش ہو کر میری خیریت دریافت کی اور ے ہ معلوم کر کے کہ میرا تعلق پاکستان سے ہے اسے بہت خوشی ہوئی اور اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"آپ کو ے ہ کیا ہو گیا ہے؟" میں نے اس کی ٹانگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"حادثے میں میری ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔" اس شخص نے جواب دیا جو شکل و صورت سے کوئی پینتیس سال کا مقامی سوئیڈش لگ رہا تھا۔

ہم لوگ اپنے ملک میں ٹریفک کے ستائے ہوئے، ہر حادثے کو ٹریفک حادثہ سے ہی منسوب کرتے ہیں اور ے ہاں بھی حادثے کا سن کر میں نے ایک دم پوچھا کہ اس کا بس یا گاڑی میں حادثہ ہوا تھا یا سڑک پار کرتے ہوئے۔

"نہیں۔ کسی گاڑی سے حادثہ نہیں ہوا تھا گزشتہ ماہ ایک دوست کے ساتھ برفانی پہاڑوں پر ہم لوگ Skiing کرنے گئے تھے وہاں میرا توازن بگڑ گیا جس کے نتے جے میں اوپر سے گرنے پر گھٹنا زخمی ہو گیا۔" اس نے بتایا۔

"آپ Skiing کے شوقین لگتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔ وہ میں اے سے ہی کبھی کبھار کر لیتا ہوں جب پہاڑوں پر بہت زیادہ برف باری ہوتی ہے وے سے میں اسکواش کھیل کا کھلاڑی ہوں۔ میرا نام اولف لونڈیل ہے۔" ےہ کہہ کر اس نے میری طرف غور سے دیکھا شاید وہ میرے چہرے پر پیدا ہونے والا تاثر پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مے رے چہرے پر جب اس نے کوئی تاثر نہیں دیکھا تو اس نے خود ہی کہا۔ "لگتا ہے آپ اسکواش نہیں کھیلتے اور اس کے بین الا قوامی میچ دیکھنے کا بھی آپ کو شوق نہیں ہے؟"

"آپ نے درست کہا۔" میں نے کہا

"اس لئے آپ مجھے نہیں پہچان رہے ہیں۔" اس نے کہا۔ "میں اپنے ملک کی اسکواش ٹیم کا چیمپئن تھا، اب ریٹائر ہو چکا ہوں۔ 1979ء میں میں نے آپ کے ملک کے چیمپئن جہانگیر خان سے کھیلا تھا لیکن 3-2 سے وہ جیت گیا۔ اس وقت سے جہانگیر میرا اچھا دوست ہے۔ آج کل میں تجارت کرتا ہوں، کراچی سے ٹوپیوں کے بیج بنوا کر ے ہاں بیچتا ہوں۔ اس کے علاوہ سیالکوٹ سے کھیلوں کا سامان بھی منگوا کر یہاں کے اسکولوں کو سپلائی کرتا ہوں۔ اس کام میں جہانگیر خان میری کافی مدد اور رہنمائی کرتا ہے۔" اسکواش کا یہ سوئیڈش کھلاڑی مسٹر اولف لونڈیل ہمارے علاقے کے قریب والے علاقے کروس گاٹن میں رہتا ہے۔

بجلی کے ستائے ہوئے ہم

سوئیڈن میں آتے ہی مجھے جس چیز کی سخت ضرورت محسوس ہوئی وہ تھا وال کلاک۔ میں چاہتا تھا کہ میرے کمرے کی دیوار پر ایک عدد بڑے سائز کی گھڑی ہونی چاہیے تاکہ آنکھ کھلتے ہی پتہ چل سکے کہ کیا وقت ہوا ہے۔

پہلے دن ہی یونیورسٹی سے واپسی پر شہر کے مرکزی بازار کے قریب اتر گیا اور دو تین دکانوں میں وال کلاک دیکھے۔ میرے ساتھ سنگاپور اور پرتگال کے جہاز ران نمائندے بھی تھے۔ گھڑی مجھے پسند نہیں آئی، میں ایسی گھڑی چاہتا تھا جو بیٹری سے چلے۔ یہاں ہر دکان پر الیکٹرک پر چلنے والی گھڑیاں مل رہی تھیں۔ دوسرے دن ایک اور بازار میں چلا گیا۔ میرے ساتھ وہ ہی کل والے دوست تھے جو دکان کے باہر ہی کھڑے ہو کر انتظار کرتے رہے۔ مجھے ان دکانوں میں بھی اپنی پسند کی گھڑی نہیں مل رہی تھی اور ایک دکان سے اتر کر دوسری میں گھس رہا تھا۔ آخر میرے ساتھیوں نے بھی محسوس کیا اور ان کو تجسس بھی ہوا کہ میں کر کیا رہا ہوں۔ وہ دکان میں گھس آئے۔

"بھئی یہ کیا ہو رہا ہے؟ کل سے تقریباً دس دکانوں کا چکر لگا چکے ہو۔ ایک گھڑی لینی ہے یا پوری دکان؟" پرتگالی کیپٹن نے پوچھا۔

"یار دیوار کے لئے سیل والی وال کلاک چاہیے۔" میں نے کہا۔

"یہ اتنے سارے وال کلاک جو پڑے ہیں۔" سنگاپوری جہاز ران ساتھی نے کہا۔

"یہ سب الیکٹریکل ہیں۔" میں نے کہا۔

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" ایک نے تعجب سے پوچھا۔

"بجلی چلی جائے تو؟" میں اپنے ملک کی بجلی کا ستایا ہوا جہاں بجلی روزانہ گھنٹوں کے حساب سے جاتی ہے یہاں بھی یہ ہی سوچ رہا تھا اور یہاں میرے ساتھ کھڑا پرتگالی (جس کا یورپ کے ملک سے واسطہ ہے) تو اپنی جگہ سنگاپوری بھی اس بات کا نہیں سوچ سکا کہ آج کے دور میں دنیا میں ایسے بھی ملک ہیں جہاں بجلی کی تاریں کئی گھنٹے مردار رہتی ہیں اور پانی کے نلکے خشک رہتے ہیں۔ ظاہر ہے میرے یہ کہنے پر کہ اگر بجلی چلی جائے تو ان کے منہ سے یہی نکلا:

"کیوں چلی جائے گی؟"

اور سوئیڈن میں رہتے ہوئے آج تقریباً دو سال ہو چکے ہیں۔ کسی ایک دن بھی ایک منٹ کے لئے بھی بجلی نہیں گئی۔ ایک دن صرف پانچ منٹ کے لئے بجلی ضرور چلی گئی تھی لیکن وہ صرف میرے فلیٹ کی۔ ہمارے فلیٹ کا مالک فلیٹ سے پرانا چولہا نکلوا کر نیا لگا کر دے رہا تھا۔ چولہا الیکٹرک کا تھا اس لئے چولہا لانے والے نے تھوڑی دیر کے لئے فلیٹ کا مین سوئچ بند کر کے نیا چولہا فٹ کیا تھا۔

اپنے گاؤں کے اسکول ٹیچر سے ایک مرتبہ میں نے پوچھا کہ "سر! ہمارے دور کے بچوں اور آج کے بچوں میں کیا فرق ہے؟" جس پر انہوں نے جواب دیا۔

"آپ کے دور میں جب کوئی بچہ ہوم ورک نہیں کر کے آتا تھا تو وہ بہانہ کرتا تھا کہ اس کی طبیعت خراب تھی۔ آج کل تقریباً سارے بچے روزانہ بغیر ہوم ورک کے آتے ہیں۔ پوچھو تو جواب دیتے ہیں کہ "بجلی چلی گئی تھی۔"

گوِڈیول اٹس ڈیو

کچھ دن ہوئے سوئیڈن کے پڑوسی ملک ڈنمارک کے دارالحکومت کوپن ہیگن میں ناچ گانے کا ایک فنکشن، یورپین سانگ فیسٹیول ہوا جس میں تقریباً ڈیڑھ درجن مغربی ممالک کے فنکار شریک ہوئے۔ گانے والیوں نے اپنے ملک کی زبانوں فرانسیسی، اطالوی، جرمن، پرتگالی، ہسپانوی، ڈینش کے علاوہ انگریزی میں بھی گانے گائے۔ اس مقابلے میں ترکی اور اسرائیل کے فنکاروں نے بھی حصہ لیا۔ ترکی ایک ایسا ملک ہے جس کا کچھ حصہ براعظم ایشیا میں اور کچھ یورپ میں آتا ہے لیکن اسرائیل کو معلوم نہیں کس خیال سے یورپی ملکوں میں شامل کیا گیا تھا۔ شاید اس لئے کہ اس کی شناخت عربوں اور مشرقی ملکوں سے نہیں بلکہ یورپ اور مغربی ممالک سے ملتی ہے۔ بہرحال ےہ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے اور صرف ایشیائی ممالک کا مقابلہ ہوتا تو بھی عرب ممالک اس میں حصہ نہ لیتے۔

گانوں کا ےہ مقابلہ اولمپک کھیلوں کی طرح پانچ سال میں ایک مرتبہ ہوتا ہے اور اسے دےکھنے کے لئے نہ صرف یورپ بلکہ امریکہ، کینیڈا، نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا جے سے دور دراز ممالک سے موسیقی کے شائقین بڑی تعداد میں آتے ہیں۔ اس شو کا ٹکٹ بہت مہنگا رکھا جاتا ہے جس کا بڑا حصہ فنکاروں کو اور باقی پے سے تعلیمی اداروں کو دے ئے جاتے ہیں۔ اس شو کی ٹکٹیں سوئیڈن کے محکمہ بلدیات کی طرف سے ہمیں مفت ملی تھیں۔ ہال میں بھی نشستیں صحیح

جگہ پر ملی جو اسٹیج سے نہ زیادہ دور تھیں نہ ہی قریب۔ میرے دائیں جانب کرسیوں پر میرا پاکستانی ساتھی کیپٹن سلیم قاسم اور اردن کا انجینئر عبدالکریم تھا اور بائیں جانب کرسیوں پر منقسم سوشلسٹ سوویت ریپبلک کے چند ممالک جارجیا، آزربائیجان، ازبکستان کے جہازران نمائندے تھے۔ جے سے ہی کوئی گانے والی اسٹیج پر آتی تھی تو پہلی مرتبہ اس کے چہرے کی خوبصورتی، کپڑوں کے اسٹائل اور دل لبھانے والی اداؤں کے حساب سے تالیاں بجا بجا کر ہم سامعین اس کی حوصلہ افزائی کرتے اور پھر دوسری دفعہ اس کے گانا ختم ہونے پر تالیاں بجا کر اس کے فن کی داد دیتے رہے۔ فرانس، جرمنی، آسٹریا، ہنگری اور اس کے بعد ترکی کی گانے والی اسٹیج پر پہنچی اس کے بعد رومانیہ کی آئی۔ رومانیہ کے بعد جس ملک کی گانے والی اسٹیج پر آئی اس کا جب تک نام اور قومیت اناؤنس ہو ہم اس کا سدا بہار چہرہ اور دلربا اداؤں کا اظہار نہ صرف تالیاں بجا کر کرتے رہے بلکہ زبان سے بھی تعریف کرنے لگے۔ یعنی ہم آپس میں دو پاکستانی، اردنی اور آگے کی قطار میں بیٹھا ہوا ایک مصری عرب بھی۔ اتنے میں میزبان نے اس گانے والی لڑکی کا نام لے کر جیسے ہی اس کے ملک کا نام لیا تو ہمیں جے سے سانپ سونگھ گیا۔ اب اسرائیل کی لڑکی کی تعریف ہم کے سے کریں! اسرائیل یا بھارت کی کوئی چیز چاہے بین الاقوامی معیار کی کیوں نہ ہو اس میں طرح طرح کے عیب نکالنا جو ہماری نس نس میں بھرا ہوا ہے۔

"کیسی بے حیا لگ رہی ہے، شکل سے بھی اور کپڑوں سے بھی۔" میرے پاکستانی ساتھی نے یکدم کہا اور میں نے بھی اس کی بھرپور تائید کی۔ یعنی ہم دونوں اپنی اصلیت پر آگئے یعنی کوئی ملک یا آدمی ہمیں پسند نہ ہو تو ہمیں اس کی خوبی بھی خامی لگتی ہے۔ کیا کریں بچپن سے اپنے ملک کے ٹی وی اور ریڈیو سے یہی سبق لیا ہے۔ ہمارے اظہار کے اس تبدیلی سے اردن والا عرب ہمارے چہرے کو غور سے اے سے دے کھنے لگا جے سے کوئی پاگل خانے میں جا کر پاگلوں کو دے کھتا ہے۔ ہم تو سمجھے تھے کہ ہمارا ے ہ عرب ساتھی بھی اسرائیل کا نام سن کر اس کے گانے والی کی ہم سے زیادہ برائی کرے گا لیکن انہوں نے لڑکی کے حق میں اپنی تعریف کو قائم ہی رکھا۔

مزے کی بات ے ہ کہ اس کمبخت کا نہ صرف گانا اچھا تھا بلکہ اس کی ادائیگی بھی عمدہ تھی اور وہ گانا بھی انگریزی میں گا رہی تھی جو ہمیں اچھی طرح سمجھ میں آرہا تھا۔ اس لئے ہم اس کے گانے اور سر میں کوئی عیب نہ پا کر اس کے کپڑوں کی برائی کرنے لگے کہ دے کھو کیسا لباس پہن کر آگئی ہے اس میں تو نیم عریاں نظر آرہی ہے۔ ہم نے اس کے خلاف اور بھی نہ جانے کیا کچھ کہا حالانکہ سچ بات ے ہ تھی کہ اس سے پہلے ترکی کی جو مسلمان گانے والی آئی تھی وہ اس سے زیادہ عریانیت کا مظاہرہ کر کے جا چکی تھی اور اس کے گانے کے ساتھ اس کا ناچ بھی کافی حد تک بے تکا اور اشتعال انگیز تھا۔ لیکن ترکی تو ٹھہرا ہمارا مسلمان ملک اس لئے اس کی ہر بات ہمیں اچھی لگی، جے سے ہمارے ملک کے اخبارات میں ہوتا ہے۔ دادو، ٹھٹھہ یا کراچی کے اہم چوراہوں پر پولیس دن دہاڑے خواتین و حضرات کے پر امن

جلوس پر لاٹھی چارج کر کے شرکاء کو بے ہوش بھی کر دے اس کی تصویر اخبار میں نہیں چھپے گی۔ تصویر ہو گی تو بھارت کے کسی گاؤں کی جہاں کی پولیس کسی (بقول ہمارے اخبار کے) "بے قصور" پر ظلم کر رہی ہے۔ تو جناب غیر حقیقت پسند ہونا ہماری عادات میں شامل ہے۔ بہر حال گانا ختم ہونے پر پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ یہاں تک کہ ہمارے قریب بیٹھے ہوئے اردن، مصر اور افریقی مسلمان ممالک کے ہمارے جہاز ران ساتھی کافی دیر تک تالیاں بجا بجا کر اس اسرائیلی لڑکی کو داد دیتے رہے۔ مجھے اور میرے پاکستانی ساتھی کو خاموش بیٹھا ہوا دیکھ کر اردنی عرب نے ایک مرتبہ پھر ہماری طرف حیرت سے دیکھا۔ وہ ہمارے افسردہ چہروں کو دیکھ کر یقیناً یہ سوچ رہا ہو گا کہ ہم نے ضرور کوئی چینی سے لدا جہاز ڈبویا ہے لیکن اسے اچانک ہی ساری بات سمجھ میں آ گئی اور ہمیں ٹوکتے ہوئے کہا۔ "یار! کوئی بات نہیں۔ گانے والی اسرائیل کی ہے تو کیا ہوا Give devil its due یہ سیاست نہیں ہے، پیارے! یہ ساز کی دنیا ہے۔ آپ جس سے (یعنی اسرائیل سے) جس کی خاطر (یعنی یاسر عرفات اور عربوں کی خاطر) روٹھ رہے ہیں وہ تو ان سے (یعنی اسرائیل سے) صلح نامے کرتے پھر رہے ہیں۔"

طویل ناموں والے لوگ

سوئیڈن میں دنیا کے تقریباً 200 ممالک کے جن جہازراں نمائندوں کے ساتھ رہنے کا موقع ملا ان میں سے کچھ لوگوں کے نام اتنے مشکل تھے کہ دو سال گزرنے کے بعد بھی یاد نہیں ہو سکے۔ آخری دن تک ان کو ان کے اپنے ناموں کی بجائے ان کے ملکوں کے نام سے پہچاننا پڑتا تھا۔ ان کے مقابلے میں چینیوں اور ویتنامیوں کے نام آسان تھے۔ چینیوں کے نام میں پہلا لفظ ان کی ذات ہوتی ہے باقی دو الفاظ ان کے نام ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر لی کو ان یو نام میں لی اس کی ذات ہے۔ ہمارے ملک میں بھی نام لکھنے کا یہی انداز ہے یہ دوسری بات ہے کہ بعض لوگ اپنی ذات نام کے شروع میں لکھتے ہیں اور بعض آخر میں۔

اس کے علاوہ بعض نام مثلاً علی، عادل، عمران، خالد اور طارق وغیرہ جنہیں پکارنے میں آسانی ہوتی ہے اور بعض اے سے نام بھی ہوتے ہیں جنہیں پکارنے میں ملکی اور غیر ملکی دونوں افراد کو خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بلکہ

یوں کہئے کہ جہاز کو(Low tide) میں بندر گاہ سے باہر لانے کے برابر ہوتا ہے جے سے شمشیر الحیدری مستنصر حسین تارڑ، میر لشکری عیسانی وغیرہ۔

ملائیشیا کے رہنے والوں یعنی ملے ئی افراد کے نام البتہ ہم سے کچھ آسان ہیں کیونکہ ان کے نام کے ہماری طرح تین کی بجائے صرف دو حصے ہوتے ہیں کیوں کہ ان کے یہاں ذات پات کا کوئی چکر نہیں ہے۔ پہچان کے لئے وہ اپنے نام کے ساتھ اپنے والد کا نام لکھتے ہیں۔ لیکن ہر ایک کا ایک لفظ والا نام ہونے کی وجہ سے پورا نام دو الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے جیسا کہ مہاتیر محمد یعنی محمد کا بیٹا مہاتیر۔ بیچ میں بن یا بنتِ بھی شامل کرتے ہیں تاکہ پتہ چلے کے نام کسی مرد کا ہے یا خاتون کا کیونکہ بعض نام اے سے ہیں جو کسی ملک میں مرد کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں تو کسی میں خاتون کے لئے اور کہیں دونوں کے لئے۔ مثال کے طور پر برصغیر میں ممتاز مرد کا نام بھی ہے تو عورت کا بھی۔ لیکن ملائیشیا، انڈونیشیا اور برونائی میں ممتاز خالص نسوانی نام ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ملائیشیا میں ایک دفعہ پاکستانی ہاکی ٹیم آئی تھی جس میں ایک کھلاڑی کا نام ممتاز تھا۔ ملائیشیا والوں کو اتنا تعجب ہوا کہ دوسرے دن اخبارات میں کارٹون تک چھپے تھے۔ رانی ہمارے ملک میں عورت کا نام ہے لیکن ملائیشیا میں رانی خالص مردانہ نام ہے۔ ملائیشیا کی بحریہ کے ایک ہمارے دوست کا نام کمانڈر رانی ہے۔ مزے کی بات ےہ کہ ملے ئی زبان میں راجہ لفظ بھی ہے لیکن راجہ عورتوں اور مردوں کے ناموں میں آتا ہے جے سے ہمارے ہاں گلشن، نسیم، راحت وغیرہ دونوں میں آتا ہے۔ ملائیشیا کی ایک مشہور گانے والی کا نام راجہ ایما ہے۔

ایک دن یہ لے نے اپنے پرتگالی ساتھی کیپٹن جیمی کی توجہ اس کے طویل نام کی طرف مبذول کرتے ہوئے کہا کہ "جیمی! تمہارا نام (پیڈروڈی گمرڈو جیمی لیچاویگا) اتنا طویل کیوں ہے؟"

"صرف میرا نام ہی طویل نہیں بلکہ ہم تمام پرتگالیوں اور ہسپانوی افراد کے نام اے سے ہی ہیں۔ جے سے آپ لوگ اپنے نام کے ساتھ ذات اور والد کا نام لکھتے ہیں اس طرح ہم بھی کرتے ہیں فرق صرف ےہ ہے کہ ہم اس میں اپنی والدہ کا نام بھی شامل کرتے ہیں اور کبھی کبھی اس میں اس علاقے یا گاؤں کا نام بھی لکھتے ہیں جس سے ہمارا تعلق ہوتا ہے۔" اس نے بتایا۔ اس وقت ہمارا ایک اور ساتھی جس کا تعلق وسطی امریکہ کے ایک چھوٹے سے ملک کوسٹاریکا سے ہے وہاں سے گذرا۔ کیپٹن جیمی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وسطی امریکہ اور جنوبی امریکہ کے ممالک میں جو ہسپانوی یا پرتگالی نسل کے لوگ رہتے ہیں ان کے نام تو ہمارے نام سے بھی زیادہ طویل ہیں کیونکہ وہ اپنے نام کے ساتھ اس علاقے کا نام تو لکھتے ہیں جس سے آج کل ان کا تعلق ہے ساتھ ہی وہ جگہ بھی شامل کرتے ہیں جہاں سے ان کے آباؤ اجداد ہجرت کرکے جنوبی امریکہ پہنچے۔ کچھ تو اس کو بھی نامکمل سمجھتے ہیں اور اس میں شاعرانہ

تخلص یا کاروباری القاب بھی ڈالتے ہیں۔ جے سے ہمارے ایک کلاس میٹ چلی کی بحریہ کا کمانڈر ہے جس کا پورا نام:
"کمانڈر انجینئر اینٹونیو مینوئل سرخام ڈی سلورا میریم پنہرو" ہے۔
"بھلا اس میں اس کا نام کون سا ہوا؟" میں نے جیمی سے پوچھا۔
"ے ہ اندازہ لگانا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ کئی ناموں میں تو ے ہ اندازہ لگانا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کے والد کا نام کونسا ہے اور والدہ کا کونسا۔ بہتر طریقہ یہی ہے کہ اس سے پوچھا جائے کہ آپ کو کس نام سے پکارا جائے"
"لیکن پہلا نام تو اس کا ہونا چاہیے ے؟" میں نے سوال کیا۔
"نہیں ے ہ بھی ضروری نہیں ہے۔ جے سے میرا نام والد اور والدہ کے ناموں کے بیچ میں ہے۔ کچھ لوگ تو اپنے علاقے یا شہر کا نام شروع میں رکھتے ہیں۔ بہر حال پرتگالیوں کے ناموں میں ایک بہت بڑی کنفیوژن ہے۔"
قارئین اس کنفیوژن کا اندازہ اس نام سے لگا سکتے ہیں جو سمجھیں کہ ایک پرتگالی نام کا پاکستانی متبادل ہے۔
"جلال آبادی نسیم بدر دین طلعت صدیقی ٹنڈو جان محمد" اب ے ہ بدر دین صاحب ہیں جن کے والد صاحب کا نام نسیم ہے اور والدہ کا طلعت۔ ذات صدیقی ہے آپ کا اصل گاؤں بھارت کا (یا افغانستان کا بھی کہہ سکتے ہیں) جلال آباد ہے لیکن آج کل ٹنڈو جان محمد میں مقیم ہیں۔ اب اس تفصیلی تعارف کا آپ کو تو پتہ چل گیا لیکن نئے آدمی کو خصوصا کسی غیر ملکی کو جس کو ے ہ بھی معلوم نہ ہو کہ ہمارے ملک میں ٹنڈو لفظ شہر یا گاؤں کے نام کے ساتھ لگایا جاتا ہے وہ تو ہو سکتا ہے ٹنڈو جان محمد کسی گاؤں کا نام سمجھنے کے بجائے باپ کا نام سمجھے اور وے سے بھی کچھ نام ایسے ہیں جے سے کہ نسیم، طلعت وغیرہ جن سے اندازہ لگانا مشکل ہے کہ مرد (والد) کا نام ہے یا عورت (والدہ) کا۔

آنکھوں نے آنکھوں کو سلام کیا

روٹرڈام (ہالینڈ) میں، میں جس گروپ کے ساتھ جہازوں کا کام کر رہا تھا اس میں میرے علاوہ ایک برا عظم افریقہ کے ملک تیونس کا چیف انجینئر مسٹر عیاض تھا اور ایک یمن کی بندر گاہ کا انجینئر محمد مبارک تھا۔ مبارک ہم سب میں تیز تھا۔ اس کی انگریزی اتنی اچھی نہیں تھی پھر بھی وہ اپنی ہر بات نہ صرف دوسرے کو سمجھاتا بلکہ اسے قائل بھی کر دیتا تھا۔ حسن لطافت (Sense of Humor) بھی اس میں کچھ زیادہ ہی تھی۔ اس کے خلاف ہم سب مل کر ایک ہو جاتے تھے پھر بھی مقابلہ کرنے سے نہیں گھبراتا تھا۔ ہمیں بھی جہاں موقع ملتا تھا اس کی کھنچائی کرتے رہتے تھے۔

مبارک کو غصہ بھی جلدی آتا تھا اور اس کمزوری کا فائدہ اٹھا کر تیونس کا عیاض کوئی ایسا جملہ بول دیتا تھا جس سے مبارک تنک جاتا تھا۔ اس کے بعد عیاض خود تو خاموش ہو کر صرف مسکراتا رہتا تھا مگر مبارک شروع ہو جاتا تھا۔ ایک دفعہ ہم ریل گاڑی میں روٹرڈام سے بیلجیم کے شہر انیٹورپ جا رہے تھے۔ ریل گاڑی میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تقریباً سب لوگ سو رہے تھے اگر کوئی جاگ بھی رہا تھا تو وہ اخبار یا رسالہ پڑھنے میں مشغول تھا۔ کچھ دیر کے بعد چائے کافی بیچنے والی لڑکی آئی اور ہم لوگ اس سے گرم کافی خرید کر خاموشی سے اس کی چسکیاں لے نے لگے اور باہر سے گزرنے والے چھوٹے چھوٹے گاؤں، دور دور تک پھیلے ہوئے سبز کھیت اور ان میں چرنے والی صحت مند گائیں دیکھتے رہے۔ ریل گاڑی کی پٹریاں ہموار زمین سے گزر رہی تھی اور وے سے بھی الیکٹرک ٹرین ہونے کی وجہ سے وہ پسٹن اور کرینک شافٹ جیسی چیزوں کے شور سے خالی تھی۔ کوئی پیچھے کی سیٹ پر سویا ہوا ہلکے ہلکے خراٹے لے رہا تھا وہ بھی سنائی دے رہے تھے۔ اور اس خاموشی اور سردی میں ہم چائے کا مزہ لے رہے تھے۔ اتنے میں تیونس کے عیاض کو پتہ نہیں کیا سوجھی کہ اس نے سامنے بیٹھے ہوئے یمن کے مبارک سے عربی میں کوئی جملہ کہا۔ (بعد میں مجھے پتہ چلا کہ عیاض نے اس سے کہا کہ "تم عرب لوگوں کو ہر وقت شادیوں کا شوق لگا رہتا ہے") عرب تو عیاض خود بھی تھا لیکن آپس میں لڑتے وقت افریقی ملکوں کے عرب مشرق وسطیٰ کے عربوں سے خود کو اکثر علیحدہ سمجھتے ہیں۔

"شادیوں کا شوق ہم یمنیوں کو اتنا نہیں ہے جتنا سعودیوں کو ہے۔" مبارک اب مجھے بھی اس جھگڑے میں شامل کرنے اور شاید فیصلہ کن کردار ادا کرنے کے لئے انگریزی میں بولنے لگا۔ "ے ہ سعودی لوگ اپنی طاقت اور جوانمردی کا اظہار شادیوں کی تعداد سے کرتے ہیں۔ ے ہ لوگ سمجھتے ہیں کہ عورت کے لئے سب سے بڑی خوشی اس سے ہر وقت جنسی تعلقات قائم رکھنے سے ہے۔ کبھی کبھی تو کم عمری میں ہی ے ہ لوگ ان چیزوں میں اتنے مگن ہو جاتے ہیں کہ بعد میں بڑی عمر میں ان کا سارا زور کشتے اور معجون کھانے پر صرف ہوتا ہے۔ سعودی عرب کے کئی بڑی عمر کے عرب ہمارے ملک (یمن) آ کر کم عمر کی غریب لڑکیوں سے شادی رچا کر ان کو لے جاتے ہیں۔ لڑکیوں کے غریب ماں باپ بھی مجبور ہوتے ہیں مگر ان لڑکیوں کی اکثریت جلد ہی اپنے وطن بھاگ آتی ہیں۔"

"پیسہ اور کھانا پینا تو ہے۔" ہر لڑکی یہی شکایت کرتی ہے "مگر سعودی عرب کے عربوں کے گھروں مین قید جیسی زندگی ہے، کوئی آزادی یا عورت کی عزت نہیں ہے۔ عورت کو غلام سمجھا جاتا ہے جس کا کام ہر وقت مرد کی جنسی خواہشات کی تکمیل کرنا ہوتا ہے۔ عورت کیا چاہتی ہے یا اس کی کیا ضروریات ہیں اس کی ان کو کوئی پرواہ نہیں ہے۔ خود تو گھر سے باہر کیا ملک سے باہر موج مزے کرتے پھرتے ہیں، عورت کو چڑیا سمجھ کر گھر کے سونے پنجرے میں بند کر دے تے ہیں۔ اس سے تو اپنے ملک میں کسی غریب کے گھر میں روکھی سوکھی کھا کر وقت گزرانا اچھا ہے۔" اس

کے بعد مبارک نے اپنے شہر عدن مین رہنے والی ایک پڑوسی عورت کا قصہ سنایا، جس کی سعودی عرب میں شادی ہوئی تھی اور ایک مہینہ بھی نہیں گذرا تھا کہ وہ وہاں سے واپس عدن بھاگ آئی۔

"کیوں بھاگ آئی؟" ہم لوگوں نے مبارک سے پوچھا۔

"حد سے زیادہ سیکس کی وجہ سے۔" مبارک نے بتایا۔ "اس کے بڑی عمر کے میاں نے دوائیاں کھا کھا کر اسے پاگل کر دیا تھا۔ گھر سے باہر ہی اس کی دکان تھی نہ صبح نہ شام دے کھو جس وقت اس کا دل کرتا تھا گھر کا رخ اختیار کرتا تھا۔ اس کے ہر وقت کمر بند میں ہاتھ ہوتے تھے۔''

"کیا یے ہ ساری باتیں اس عورت نے آپ سے کیں؟" عیاض نے مبارک سے پوچھا۔

"مجھ سے کیوں کرے گی بھائی! وہ میری بوڑھی والدہ کے پاس اپنے دکھڑے رونے اور مشورہ لے نے آئی تھی۔ میں ساتھ والے کمرے میں تھا اور سن رہا تھا۔ میری ماں اس کو سمجھا رہی تھی کہ خواہ مخواہ شوہر کو چھوڑ آئی ہو، وہاں تہ ماری زندگی سکھ وچین سے گزرتی لیکن وہ لڑکی اپنے شوہر سے تنگ تھی۔ وہ بار بار اپنے اس عمر رسیدہ شوہر کی میری ماں سے شکایت کررہی تھی۔ "یاخالہ خلقہ نی ھذاالرجل" (خالہ! اس آدمی نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے)۔

مبارک کی اس کہانی کے بعد ہم نے مبارک کا نام ہی "خالہ" رکھ دیا اور باقی دو سال ہم لوگوں نے جو مختلف جگہوں پر گزارے اس میں یہ جملہ ہم کوڈ کے طور استعمال کرنے لگے۔ مثال کے طور ناروے کی سخت سردی میں جن صاحب کے ساتھ ہم لوگوں نے جہاز کا کام کیا وہ ڈیوٹی کے معاملے میں اتنے سخت تھے کہ ہم بار بار اس کے سامنے مبارک سے کہتے رہے: "یاخالہ! خلقنی ھذاالرجل (اس انسان نے ہماری زندگی اجیرن کر دی)۔"

مبارک خالہ کہنے سے کافی چڑتا تھا اور بار بار کہتا تھا: "تم لوگ اتنے کم ظرف ہو کہ آئندہ تم لوگوں کو میں کوئی بات نہیں بتاؤں گا۔"

لیکن مبارک جس شخص کا نام تھا وہ کبھی بھی خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ خود بھی دوسروں کو تنگ کرنے سے باز نہیں آتا تھا اور بتاتا تھا کہ وہ بچپن مین بہت شریر تھا اور اس کی شرارتوں کی وجہ سے ہر وقت اس کی پٹائی ہوتی رہتی تھی۔

"ایک مرتبہ میری ماں کو اتنا غصہ آیا۔" مبارک نے بتایا "کہ میری ماں نے مے رے کپڑے اتار کر مجھے دھوپ میں چارپائی کے ساتھ باندھ دیا اور میرے منہ پر لال مرچ مل دیئے۔"

"پھر تو تمہاری حالت خراب ہو گئی ہو گی۔" ہم لوگوں نے پوچھا۔

"تو اور کیا۔ میں نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ زور زور سے چلانے لگا: یامسلمین! یا مسلمین!"

"یہ کیوں؟" میں نے یے ہ سوچ کر پوچھا کہ عدن میں تو سب مسلمان رہتے ہیں یے ہ کیا خاص مسلمانوں کو مدد کے لئے بلا رہا تھا۔

"ہمارے پاس یمن میں ےہ رواج ہے کہ محلے میں آگ لگ جائے یا چور آئے یا کوئی اور مصیبت نازل ہو جائے تو زور زور سے یا مسلمین کہہ کر محلے والوں کو مدد کے لئے بلاتے ہیں۔ ےہ ایسا ہے جے سے مغرب میں Help me! Help me! کہتے ہیں۔" مبارک نے بتایا۔

"پھر کیا ہوا؟" ہم لوگوں نے پوچھا۔

"پھر کیا ہونا تھا۔ محلے کے لوگ جمع ہو گئے اور میری ماں کی منتیں کی کہ خالہ چھوڑ دو! بچہ ہے۔ آئندہ شرارت نہیں کرے گا اس کے بعد میری ماں نے رسیاں کھولیں۔"

"اور رسیاں کھلتے ہی تم کپڑے پہننے کے لئے بھاگے ہو گے؟" ہم نے پوچھا۔

"تم لوگ بھی کمال کرتے ہو۔ اس وقت میرا منہ جل رہا تھا اور تمہیں کپڑوں کی پڑی ہے۔ میں سیدھا نلکے کی طرف بھاگا اور کافی دیر تک منہ پر پانی مارتا رہا۔ محلے کے لوگ، بچے بوڑھے سب مجھے دے کھ کر ہنستے رہے۔"

"پھر محلے والوں کو تو تم نے خوب گالیاں دی ہو نگی؟" ہم نے مبارک سے پوچھا۔

"میں اتنا بھی بے وقوف نہیں تھا۔" مبارک نے ہنس کر کہا۔ "اگر اے سے کرتا تو آئندہ کون چھڑانے آتا۔"

بہر حال اس قصے کے بعد ہم لوگ کافی دنوں تک مبارک کو "یا مسلمین یا مسلمین" کہہ کر پکارتے رہے۔

کئی لوگوں کو بیٹھے بیٹھے کوئی شعر یا کسی شعر کی کوئی لائن گنگنانے یا زور سے پڑھنے کی عادت ہوتی ہے۔ مبارک ادب اور شعر و شاعری کا شوقین تھا یا نہیں لیکن عربی کا کوئی نہ کوئی شعر ضرور دہراتا رہتا تھا اور اسے بار بار سن کر ہمیں بھی یاد ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی کسی شعر کے کچھ الفاظ یاد آرہے ہیں جو مبارک کئی دنوں تک ٹھنڈی آہیں بھر کر دہراتا رہا تھا۔

"عیون تناجی عیون"

"اس کا مطلب تو سمجھاؤ۔ مبارک!" میں نے اس سے پوچھا تھا۔

"یارے ےہ بڑا زبردست شعر ہے جو عربی میں تو سمجھا سکتا ہوں لیکن انگریزی میں اس کی خوبصورتی قائم رکھنا بڑا مشکل ہے۔"

"پھر بھی یار کچھ تو بتاؤ؟" میں نے زور دے کر کہا۔

"عربی میں ایک آنکھ کو عین اور دونوں آنکھوں کو عیون کہتے ہیں۔ اس کا مطلب ےہ ہے کہ عاشق کی آنکھیں اپنے محبوب کی آنکھوں سے ملیں اور آنکھوں نے آنکھوں کو سلام کیا۔ عیون تناجی عیون!"

گوروں کے ملک میں ہم کالے

ہالینڈ کی بندر گاہ روٹر ڈیم (Rotterdam) دنیا کی سب سے بڑی بندر گاہ سمجھی جاتی ہے جہاں روزانہ سینکڑوں جہاز آتے ہیں اور یہاں ان کے کھڑے ہونے کا بھی بہترین نظام ہے۔ روٹر ڈیم شہر کیا ہے یہ ایک پوری بندر گاہ لگتا ہے جہاں دیکھو جہاز ہی جہاز نظر آتے ہیں۔ شہر کی کوئی گلی بندر گاہ سے دور نہیں۔ بلکہ ے ہ کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا کہ گلی گلی میں سمندر پھیلا ہوا ہے۔ وے سے بھی ہالینڈ دنیا کا وہ ملک ہے جس میں پانی کا تناسب خشکی سے زیادہ ہے۔ یہاں کے لوگوں (ڈچوں) نے سمندر کو بھر بھر کر رہنے کے لئے زمین بنائی اور آج تک بنائے جا رہے ہیں۔ اس طرح ہالینڈ کا رقبہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اسی پر تو ایک کہاوت مشہور ہوئی۔

God made Land

Dutch made Holland

بہر حال ہالینڈ کی اس بندر گاہ روٹر ڈیم میں آپ کو دنیا کے کئی ممالک کے جہاز نظر آئیں گے۔ جہازوں کی اتنی زیادہ نقل و حرکت کی وجہ سے یہاں ہر جہاز بنانے اور مرمت کے لئے بڑے بڑے کئی شپ یارڈ ہیں۔ کئی کمپنیوں کے دفاتر ہیں جن کی معرفت جہازوں سے سامان بھیجا جاتا ہے۔ انشورنس کمپنیاں ہیں جو جہازوں اور جہازوں پر لادے جانے والے سامان کا بیمہ کرتی ہیں۔ جہاز رانی کی تعلیم و تربیت کے ادارے اور کلاسیفکیشن سوسائٹیاں ہیں۔ کلاسیفکیشن سوسائٹی جہاز کے بننے سے لے کر چلنے تک ان پر نظر رکھتی ہے کہ جس مواد سے جہاز بنایا جا رہا ہے اور جس

طرے قے سے بنایا جارہاہے وہ عالمی معیار کے ہے ں بھی یا نہیں۔ کہیں مالک نے پے سے بچانے کے چکر میں سستا مال استعمال تو نہیں کیاہے۔ کلا سیفکد یشن سوسائٹی ہر وقت جہازوں کی سلامتی سے متعلق اعتراضات کرتی رہتی ہے تا کہ جہاز ٹوٹے یا ڈوبے نہیں اور جہاز رانوں کو سمندر میں کسی پریشانی کا سامنا نہ ہو۔ مثال کے طور پر سالانہ معائنے میں کلا سیفکد یشن سوسائٹی والوں کو اگر جہاز کی کچھ زنگ آلودہ پلیٹیں کمزور محسوس ہوتیں ہیں تو وہ جہاز کے مالک کو مذکورہ پلیٹیں فوراً تبدیل کرنے کے لئے کہتے ہیں اور مالک کو ان کے مشورے پر عمل کرنا ہی پڑتا ہے ورنہ جہاز ڈوبنے پر انشورنس کمپنی مالک کو کلیم ادا نہیں کرتی۔ وے سے جہاز کا مالک تو ہر گز نہیں چاہتا کہ وہ مرمت پر خرچہ کرتا رہے۔ اور اس کی کلا سیفکد یشن سوسائٹی نشاندہی نہ کرے تو اچھا ہے۔ جہاز اور جہاز چلانے والے ڈوب جائیں تو کیا فرق پڑتا ہے، جہاز کے مالک کو تو جہاز کے پے سے مل جانے چاہئیں۔ لیکن کلا سیفکد یشن سوسائٹی والے بھی عقابی نظریں رکھتے ہیں اور ان کو بڑی محنت اور ایمانداری سے نگرانی کرنی پڑتی ہے اور انہی کی رپورٹ پر انشورنس کمپنیاں جہازوں کی انشورنس کرتی ہیں۔ وے سے دنیا میں کئی اے سے جہاز مالکان ہیں جو جہازوں کی انشورنس نہیں کراتے اور ان کا کلا سیفکیشن سوسائٹی سے واسطہ نہیں پڑتا۔ ان جہازوں پر مال برداری کا کرایہ بھی کم ہوتا ہے۔ جہاز رانوں کی تنخواہیں زیادہ کی ہوئی ہوتی ہیں لیکن جہاز آئے دن ڈوبتے رہتے ہیں کیونکہ وہ جہاز نہ اعلیٰ معیار کے ہوتے ہیں اور نہ ان کے مالکان ان کی مرمت پر خرچہ کرتے ہیں۔ اے سے جہازوں کو رجسٹرڈ کرانے میں مونورویا اور لایبیریا جے سے ممالک خاصے بدنام ہیں۔

دنیا میں تقریباً گیارہ کلا سیفکد یشن سوسائٹیاں بہت مشہور ہیں جن میں انگلینڈ کی لائڈ(Lioyd)، امریکہ کی اے بی ایس، جاپان کی این کے کے وغیرہ شامل ہیں۔ ان ساری کلا سیفکد یشن سوسائٹیوں کے ذیلے دفاتر روٹرڈیم میں موجود ہیں۔ ہم تقریباً گیارہ ممالک کی جہاز راں کمپنیوں اور بندرگاہوں کے انجینئر تھے جن کو روٹر ڈیم میں کسی ایک کلا سیفکیشن سوسائٹی کے ساتھ تقریباً دو مہنے رہ کر کام سیکھنا تھا۔ مجھے جاپانی کلا سیفکیشن سوسائٹی کے ساتھ کام کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ ہم سب لوگوں کی رہائش گاہ کا انتظام ایک ہی ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ میرا کمرہ پانچویں منزل پر تھا اور مے رے ارد گرد کے کمروں میں یمن کا محمد مبارک، تیونس کا عیاض اور سعودی عرب کا خالد تھا۔ ے ہ تینوں عرب تھے اور میری سوئیڈن سے ان سے خاصی دوستی اور ہنسی مذاق تھا۔ صبح کو ناشتے کے بعد ہر ایک اپنے دفتر میں چلا جاتا تھا اور شام کو اکٹھے بیٹھ کر چائے پیتے تھے۔ میری جو موجودگی میں سب کو انگریزی میں بات کرنی پڑتی تھی کیونکہ میں عربی سے ناواقف تھا۔ تینوں عربوں کی انگریزی اتنی اچھی نہیں تھی بلکہ انہوں نے سوئیڈن میں آکر ہی سیکھی تھی اس لئے کسی بات پر بحث یا جھگڑے کرنے کی نوبت آتی تھی تو میرا خیال کئے بغیر عربی میں شروع ہو جاتے تھے اور خوب جی بھر کر چیخ چیخ کر اپنی رائے کو دوسرے پر تھوپنے کی کوشش کرتے تھے۔

شام کو چائے کے بعد شہر کا چکر لگانے نکلتے تھے۔ میں ہوٹل کے کمرے میں ہی بیٹھ کر اپنے ملک اور ملائیشیا کے اخبارات کے لئے کالم اور مضامین لکھتا اور مقامی دفتر کا کام ٹائپ کرتا تھا۔ مے رے عرب دوست بھی اپنے دفتر کا کام مے رے حوالے کر جاتے تھے جو انگریزی زبان سے واقف ہونے کی وجہ سے مے رے لئے کوئی ایسا مشکل نہیں تھا لیکن ان کے لئے کافی پریشانی کا سبب بنتا تھا۔ مے رے اس معمولی سے کام کی وجہ سے وہ مجھ سے بہت خوش اور مے رے احسان مند رہتے تھے اور میں ان سے خوش تھا کہ مجھے زبردستی گھسیٹ کر باہر لے جانے اور میرا وقت ضائع کرنے سے مجھے بچاتے تھے۔ میں رات کے کھانے کی بجائے سیب اور بسکٹ ہی کھالیتا تھا یا واپسی پر مبارک مے رے لئے دودھ کا ڈبہ اور کیک لے آتا تھا۔ جس کے پے سے ہمیشہ کی طرح سعودی عرب کا کمانڈر خالد دیتا تھا۔

"یار آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں کتنا برا لگتا ہے کہ ہم باہر جا کر خوب کھاتے پے تے ہیں اور آپ کمرے میں بیٹھ کر ہمارا کام کرتے ہیں۔" تیونس کا عرب انجینئر عیاض کہتا تھا۔

"آپ میری فکر نہ کریں۔" میں ہنس کر جواب دیتا تھا۔ "میری جوانی کے کافی دن اسی بندر گاہ کی گلیوں میں گزرے ہیں جب میرا جہاز اس بندر گاہ روٹرڈیم کو کال کرتا رہتا تھا۔ اس وقت مے رے لئے خوشی اسی میں ہے کہ سردی میں باہر مارے مارے پھرنے کی بجائے کمرے میں بیٹھ کر کچھ لکھتا پڑھتا رہوں۔"

دراصل مجھے نہ کھانے پے نے کا شوق تھا اور نہ اتنا لمبا یعنی دو تین گھنٹے شہر میں گھومنے کا۔ کسی شام کو موڈ ہوتا تھا تو اکے لے ہی ایک آدھے گھنٹے کے لئے واک پر نکل جاتا تھا ورنہ صبح دفتر جانے آنے میں کافی واک ہو جاتی تھی۔ کلاسیفکیشن سوسائٹی والے ہمیں دفتر میں بٹھانے کے بجائے سارا دن بندر گاہ میں بھی ادھر ادھر بھگاتے تھے اور مختلف جہازوں کا معائنہ کراتے تھے۔ اس کام میں جاپان والے جن کے ساتھ میں کام کر رہا تھا زیادہ ہی "ہیڈ ماسٹر" تھے اور ان کے کام کے انداز سے میں پہلے ہی واقف تھا۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ سعودی عرب کے خالد کے ساتھ رہنے اور گھومنے میں ہم بڑی عیاشی کرتے تھے اور اپنی جیب پر بھی بوجھ نہیں پڑتا تھا۔ ہر چیز مفت مل جاتی تھی کیونکہ خالد ہمارے لئے چلتا پھرتا بینک تھا اور چھوٹے سے لے کر بڑے سے بڑا خرچہ وہ خود کرتا تھا۔ بقول مبارک کے خالد اتنا امیر آدمی ہے جس کے پاس پے سے کی ریل پیل ہے۔ سعودی بحریہ میں بڑے عہدے پر ہونے کے علاوہ سعودی عرب میں اس کے والدین کی کئی فیکٹریاں اور کارخانے ہیں جن کی وہ دیکھ بھال کرتا تھا۔ ہماری رہائش کا جو خرچہ اقوام متحدہ والے دے تے ہیں اس سے کئی گنا زیادہ مزید خرچہ سعودی حکومت خالد کو دیتی تھی۔

خالد بھی ہمارے گروپ میں خوش تھا۔ وقت پاس کرنے کے لئے اسے اپنے عربی بولنے والے مل گئے تھے اور دفتر کا کام نمٹانے کے لئے میری خدمات مہیا تھیں۔ لیکن اسے ہر وقت ے ہ پریشانی رہتی تھی کہ میں دودھ اور کیک کے علاوہ کسی بڑی چیز کی فرمائش کروں۔

ایک دن یہ تینوں عرب جلدی واپس آ گئے اور مجھے جاگتا دیکھ کر خالد نے ضد کی کہ میں اس کے ساتھ چلوں۔ "آج آپ کو ہر صورت میں میری طرف سے دعوت قبول کرنی ہو گی۔" خالد نے کہا۔

"اس وقت میرا کچھ کھانے کو موڈ نہیں، رات کے کھانے کی اگر آپ ضد کرتے ہیں تو نے چے کی ریستوران سے ملک شیک پی لیتے ہیں۔" میں نے خالد کو سمجھایا۔

"چلیں آپ کا موڈ نہیں ہے لیکن مجھے تو کھانا ہے، کل دفتر سے بھی چھٹی ہے جلدی سے گرم کپڑے پہن کر چلنے کی تیاری کریں۔" خالد نے کہا۔ یمن کے مبارک نے بھی کہا کہ "آج آپ چلے جائیں، خالد کو برا لگتا ہے کہ آپ بیٹھ کر ہمارا کام کرتے رہتے ہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ خالد مے رے احسان کا بدلہ اتارنا چاہتا ہے اور جب مجھے محسوس ہو گیا کہ خالد میری وجہ سے چل رہا ہے تو میں نے نے چے آکر ضد کی کہ رات کے دس بج چکے ہیں اس وقت سینٹرل سٹی چلنے کی بجائے یہاں میں اپنی دل پسند چیز آئس کریم کھالیتا ہوں۔ لیکن خالد نہیں مانا اور ایک ٹیکسی روک لی کیونکہ رات کی وجہ سے پبلک سروس بند ہو چکی تھی۔ راستے میں خالد نے کہا۔ "کسی اے سے ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں جہاں سیلف سروس کی بجائے ہوٹل کا بیرا کھانا پیش کرے"۔

خالد کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی پر تکلف ہوٹل میں چلنا چاہتا ہے اور آج تو میری خاطر وہ ہر صورت میں کسی بڑے ہوٹل کا انتخاب کرنا چاہتا ہے۔ اور روٹرڈیم جے سے مہنگے ترین یورپی شہر کے مہنگے علاقے میں ایسا ویسا ہوٹل بھی کوئی کم نہیں ہوتا۔ ہم ٹیکسی سے اتر کر اس علاقے میں واک کرنے لگے۔ سینٹرل اسٹیشن کے پاس ہمیں ایک پاکستانی وکیل مل گیا۔ خالد کے کہنے پر میں نے اس سے کسی اچھے ہوٹل کے بارے میں پوچھا جو سامنے کے ہوٹلوں مین سے ایک تھا۔ وہاں پہنچ کر ہمیں بلکہ مجھے اندازہ ہو گیا کہ ے ہ ایک اچھا خاصا مہنگا ہوٹل ہے جس میں مجھ جیسا غریب ملک کا کھانا تو کیا چائے پینا بھی پے سے کازیاں سمجھے ں لیکن خالد اس سے بھی اعلیٰ قسم کے ہوٹل کا انتخاب کرنا چاہتا تھا۔ تھوڑا آگے چلنے کے بعد آخر کار ایک ایسا ہوٹل نظر آ گیا جس میں خالد مجھے لے جانے کا سوچ کر آیا تھا۔ اس ہوٹل کی باہر کی دیواریں اعلیٰ قسم کے پتھر سے بنی ہوئی تھیں بلکہ جن کا آدھے سے زیادہ حصہ ہلکے رنگ کے شے شے کا تھا۔ شیشہ کافی موٹا اور اعلیٰ معیار کا تھا۔ ظاہر ہے بیلجیم جیسا ملک جس کا پڑوسی ہو اس مین اعلیٰ قسم کے شے شے نظر آنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ بس پیسہ ہونا چاہے ے جو جہاز رانی اور جہاز سازی کے اس ملک (ہالینڈ) میں بہت ہے۔

ہوٹل میں نوجوان اور امیر جوڑے خوش گپیوں میں مصروف تھے یا موٹے، بوڑھے اور گنجے بین الاقوامی تاجر اور جہازوں کے مالکان لاکھوں کروڑوں ڈالروں کے سودوں پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ ہوٹل میں آنے والے معزز

مہمانوں کو ہوٹل کا بیرا ہوٹل کے دروازے پر استقبال کر کے اندر ٹیبل تک لا رہا تھا، جہاں موجود دو عدد لڑکیاں کرسیاں باہر نکال کر انہیں بٹھا رہی تھیں۔ شیشے کی وجہ سے یہ سب کچھ باہر سے نظر آ رہا تھا۔

ہم ایشیائی کالے، جب ہوٹل کے دروازے پر پہنچے تو گاہکوں کو خوش آمدید کرنے والا بیرے نے جو دروازے کے پاس کھڑا تھا، اپنی گردن دوسری جانب موڑ لی۔ شاید یہ سوچ کر کہ ہم کہیں کسی مکان یا دکان کا پتہ معلوم کرنے کے لئے اس کا وقت ضائع نہ کریں اور اے سے خوبصورت ہوٹل جس کی آدھی سے زیادہ دیواریں Tinted شیشوں کی ہو جس میں اندر بیٹھے گورے گاہک اور ان کی خدمت کے لئے کوشاں جل پریوں جیسی خوبصورت لڑکیاں اور چمکے لے یونیفارم میں فوجیوں سے زیادہ چاک و چوبند بیرے کھڑے ہوئے نظر آ رہے ہوں ایسی جگہ ہم دو کالوں کا گیٹ کے پاس آ کر کھڑا ہونا ظاہر ہے پورے سین کو خراب کرنے کے برابر ہو سکتا ہے۔ ہمیں دیکھ کر ہوٹل کے بیرے کا منہ پھیرنے کا سبب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اسے خیال آیا ہو کہ یہ دو کنگلے ضرور اپنی جیب کٹنے کا بہانہ بنا کر دوسرے گاؤں (ہیگ یا ایمسٹرڈیم) کا کرایہ مانگیں گے۔ بیرے کی اس بے رخی کو خالد نے بھی محسوس کیا۔ خالد کو Embarrassment سے بچانے اور اس خوف سے بچنے کے لئے کہ کہیں ہوٹل کا بیرا بد تمیزی سے ہمیں یہ نہ کہہ دے کہ ہوٹل کے آگے سے کیوں گزر رہے ہیں میں نے بیرے سے انگریزی میں کہا کہ ہم یہاں کھانا کھانا چاہتے ہیں۔ یہ سن کر بیرا کچھ دیر ہمیں حیرت سے اے سے دے کھنے لگا جے سے ہم اس دنیا کی نہیں کسی اور سیارے کی مخلوق ہوں۔ مے رے اس جملے کو سننے کے لئے وہ تیار ہی نہیں تھا اور نہ اس نے سوچا تھا کہ ہم اس غرض کے لئے اس ہوٹل میں آئیں گے ورنہ تو ہمیں بھگانے کے لئے اتنا کہنا کافی ہوتا کہ ہوٹل کی تمام میزیں Reserved ہیں۔

بہر حال جلدی میں کچھ کہہ کر ہمیں بھگانے کا بہانہ بنانے کی بجائے مرجھائی ہوئی آواز میں اس نے او کے کہا جس میں کسی قسم کا کوئی خوش آمدیدی تاثر پیدا نہیں ہو رہا تھا۔ بقول ہمارے ایک ساتھی یمن کے محمد مبارک کے یہاں کے یورپی ہم ایشیائی باشندوں کو ایسا فقیر سمجھتے ہیں جن کے ساتھ بیٹھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ مجبوری کی حالت میں جب ان کو ہم سے بات کرنی پڑتی ہے تو ایسے لگتا ہے جیسے ان کی نانی مر گئی ہو۔

اور اس ہوٹل کے بیرے کے بولنے کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ اس کی نانی کے علاوہ کسی اور عزیز کی بھی موت واقع ہوئی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ پاکستانی جو اس طرف خاصے بدنام ہیں، جو یہاں فراڈ کرتے پھر رہے ہیں، جو محنت مزدوری کر کے کمانے سے زیادہ حکومت سے "سوشل" (بے روزگاری کے نام پر خیرات) لے تے پھر رہے ہیں وہ اس قسم کے "رکھ رکھاؤ" والے ہوٹل میں کیونکر آ رہے ہیں۔ ضرور اسے خدشہ ہوا ہو گا کہ ہم کھانا کھانے کے بعد اس کا بل بھی کھا جائیں گے۔ میرا سعودی عرب کا ساتھی جہاز ران ناک سے ضرور عرب لگتا ہے لیکن گندمی رنگ اور باقی شکل و صورت سے وہ بھی مجھ جیسا پاکستانی لگتا ہے۔ جرائم کس ملک کے لوگ نہیں کرتے؟ لیکن یہاں

یورپ میں (اور برطانیہ میں بھی) ےہ رجحان عام ہو گیا ہے کہ جرم کرتے ہوئے چاہے بھارتی یا بنگلہ دیشی ہی کیوں نہ پکڑا جائے مگر بغیر تصدیق کئے ےہ مشہور کیا جاتا ہے کہ وہ پاکستانی ہے۔ افسوس کی بات ےہ ہے کہ اس معاملے میں ہماری یورپی صحافی برادری بھی جو وے سے تو سچائی اور حق بات کرنے کے بڑے دعوے کرتی ہے لیکن اس معاملے میں وہ اپنی ذاتی نفرت اور تعصب پرستی کو مد نظر رکھتے ہوئے پاکستانیوں کو بدنام کرنے میں خوشی بھی محسوس کرتی ہے۔

بہر حال ہوٹل کے گیٹ کے پاس کھڑے بیرے نے ہمیں اس شان سے اندر لے چلنے کے بجائے ہاتھ کے اشارے سے ایک کونے میں پڑی خالی ٹیبل کی طرف جانے کو کہا۔ ہم نے اس کی بے رخی کو در گذر کرتے ہوئے ایک خالی ٹیبل پر قبضہ جمالیا۔ ٹیبل کے پاس کھڑی خدمتگار لڑکیوں میں سے کسی ایک نے بھی کرسی کھینچ کر بٹھانا تو درکنار خاص توجہ بھی نہ دی۔ ےہ باتیں ہم واضح طور پر محسوس کر رہے تھے اور در گزر کرنے کے علاوہ میں زبردستی ادھر ادھر کی کوئی بات نکال کر خالد کا دھیان اس بے توجہی اور بے دھیانی سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا اور اسے بالواسطہ طور پر یہ احساس دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس ہونے والی بے عزتی کا کم از کم میں نوٹس نہیں لے رہا ہوں۔ ظاہر ہے وہ مجھے لایا ہی اس لئے تھا کہ مہنگے ہوٹل میں کھانا کھلا کر مجھے احساس دلائے کہ اس کے دل میں مے رے لئے کتنی عزت اور قدر ہے لیکن یہاں تو ہوٹل والے ہمیں اچھوت سمجھ رہے تھے۔

مجھے سوئیڈن میں رہنے والے کوئٹہ کے ارباب داؤد کی بات یاد آئی کہ ہم چاہے کچھ بھی کریں مگر یہاں کے یورپی لوگ ہم ایشیا اور افریقہ کے لوگوں کو کمتر سمجھتے ہیں خاص طور پر ہم پاکستانیوں کو اور دوسرے نمبر پر مسلمانوں کو۔ کوئی پاکستانی پے سے کی بچت کا سوچ کر کسی سستے ہوٹل میں جائے گا تو کہا جائے گا کہ کنجوس ہے، بھوکا اور مسکین ہے، اگر کوئی پاکستانی پے سے والا (جو پیسہ اس نے چاہے اعلیٰ نوکری یا حلال کی کمائی سے کمایا ہو) کسی بڑے ہوٹل میں جاتا ہوا دے کھیں گے تو اس کے لئے کہیں گے کہ یہ ضرور اسمگلنگ کرتا ہے۔ کوئی بعید نہیں کہ ہوٹل کا عملہ اور ہوٹل میں موجود مہمان ہمارے لئے سوچ رہے ہوں کہ ہم اسمگلر ہیں یا ہماری جیب خالی ہے، کنگلے ہیں، کھانا کھا کر بل ادا کئے بغیر بھاگ جائیں گے۔

ایک تو ہمیں بھوک نہیں تھی خواہ مخواہ پیسہ ضائع کر رہے تھے۔ رات بھی کافی گزر چکی تھی اور ہمیں جلدی واپس جانا تھا (اگر شام کا وقت ہوتا تو چلو ہوٹل میں بیٹھنے کا ہی لطف اٹھالے تے) اور اس پر مصیبت یہ تھی کہ بے رے لوگ دوسروں سے تو آرڈر لے رہے تھے لیکن ہمیں ترچھی نظروں سے دے کھ کر دور سے ہی نکل جاتے رہے۔ آخر مجھ سے رہا نہ گیا اور فارغ کھڑے ایک بیرے کو اشارے سے اپنے پاس بلالیا۔ وہ بغیر قلم اور کاغذ کے ہم سے آرڈر لے نے آیا۔

اس نے سوچا ہو گا کہ ہم میں چائے یا کافی پینے کی طاقت مشکل سے ہو گی جو بے شک اس نے صحیح سوچا تھا۔ ظاہر ہے اتنی سمجھ تو وہ بھی رکھتا ہو گا کہ دنیا میں ہر شے بڑی مہنگی ہو گئی ہے۔ ڈالر، مارک اور جاپانی ین کے ساتھ یہاں (ہالینڈ) کے گلڈر کا ریٹ آسمان کو چھونے لگا ہے اور پاکستانی روپے اور باشندوں کی ساکھ گرتی جا رہی ہے۔ تو ایسی صورت مین ہم پاکستانی روٹر ڈیم جے سے یورپی شہر کے ایک اعلیٰ ترین ہوٹل مین کوئی چیز کے سے افورڈ کر سکتے ہیں۔ لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ جن کو وہ پاکستانی سمجھ رہا تھا ان میں ایک تیل کی دنیا کا امیر ترین عرب شہزادہ ہے جس کی ملکیت کا اسے بھی اندازہ نہیں ہے اور وہ گر چاہے تو ایک ڈنر تو کیا اس پورے ہوٹل کی قیمت کا چیک کاٹ کر اسی وقت سودا کر سکتا ہے۔

مینو پر لکھی ہوئی اشیاء میں سے خالد نے نہ صرف ایک دو سالن کے نمونے کہے بلکہ چاول مچھلی، جھینگے اور کسی سوئٹ کے ساتھ کولڈ ڈرنک لانے کا بھی کہا۔

بیرا چپ چاپ واپس گیا اور کاغذ اور قلم لے آیا اور مینو مطابق آرڈر کی ہوئی چیزوں کے نمبر نوٹ کرنے لگا۔ خالد تو اس فہرست کو مزید لمبا کرنا چاہتا تھا لیکن مے رے زور دے نے پر اسے کم کر کے وہاں تک پہنچایا کچھ دیر بعد ہوٹل کے دستور کے مطابق بیر اہر چیز گرم تیار کروا کر لے آیا۔

کھانے کے دوران دو تین اور بھی اس قسم کے واقعات پیش آئے جن سے اس ہوٹل کے بیروں کا ہمارے لئے بد تمیزی والا رویہ ظاہر ہوا۔ مثال کے طور پر ڈبل روٹی کے ساتھ مکھن لانا بھول گئے۔ جب ان کو یاد دلایا تو اسے پلیٹ میں لانے کی بجائے کاغذ میں لپٹی ہوئی مکھن کی ٹکیا آکر ہمارے آگے پھینکی۔ ہم دونوں اس قسم کی باتیں شدت سے محسوس کرتے رہے۔ میں نے بھوک نہ ہونے کی وجہ سے مشکل سے چند نوالے کھائے۔ خالد نے اس بے عزتی کا گہرا اثر لے تے ہوئے نہ کھانے کے برابر کھایا اور بے رے کو پلیٹیں اٹھانے کے لئے اشارہ کر کے پھل لانے کو کہا۔ بے رے کا انجانا خوف حقیقت بنتا گیا کہ ہم غریب ملک کے غریب لوگ ضرور کھانے کا بل چکائے بغیر بھاگ جائیں گے۔ اس لئے، شاید، وہ پھل لانے سے پہلے اس کے پے سے بھی بل میں شامل کر کے پلیٹ پر بل کی پرچی پیش کی۔ اس بات پر خالد کو اور بھی غصہ آیا کیونکہ پھل کے بعد اسے کافی منگوانے کا ارادہ تھا جو اس وقت اس کے لئے سب سے اہم چیز تھی جو اس کے غصے میں کچھ افاقہ پیدا کرتی۔ بل پر میری بھی نظر پڑی جو بے رے کی Tip (بخشش) سمیت تقریباً 300 گلڈر (چار ہزار روپے سے بھی زیادہ) تھا۔ ٹپ کی شمولیت کے باوجود خالد نے چھ سات سو روپے تقریباً مزید رکھے۔ دیکھا جائے تو اس ڈنر میں کھایا پیا کچھ نہیں گلاس توڑا بارہ آنے والا حساب ہوا تھا لیکن ے ہ چیز صرف مے رے لئے تھی خالد کے لئے یہ معمولی بات تھی۔ وہ تو اتنے سارے پیسوں کے کئی مرتبہ لندن اور ڈنمارک

کے چڑیا گھروں میں بندروں کو Pea Nuts (مونگ پھلیاں) کھلا چکا ہے۔

بل ادا کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہوٹل سے باہر نکلنے سے پہلے ہوٹل کے کونے میں رکھے ہوئے ٹیلیفون میں پے سے ڈال کر خالد نے جدہ اپنی بیوی سے تقریباً دس منٹ بات کی۔ تب تک بے رے نے بل اور چھوڑی ہوئی رقم اٹھا کر گننا شروع کیا۔ اتنی ساری ٹپ دیکھ کر وہ خود سراپا حیرت بن گیا تھا۔ اس نے ڈچ زبان میں کھسر پسر کر کے اپنے ساتھیوں کو بتایا اور وہ میری طرف اور پھر خالد کی طرف حیرت سے دے کھنے لگے۔ اس کے بعد ہماری ٹیبل کا بیرا مے رے قریب آ کر خالد کے بارے میں پوچھنے لگا۔ عربوں اور ان کے سخاوت کے قصے اس نے کئی لوگوں سے سنے تھے لیکن کسی عرب کو دے کھنے کا اس کے لئے پہلا موقع تھا۔ مجھ سے معلوم کرنے کے بعد اس نے تجسس میں کھڑے باقی بیروں اور خدمت گار لڑکیوں کو بتایا تب تک خالد نے فون پر بات ختم کر لی اور مجھے ہوٹل چھوڑنے کا اشارہ کیا۔ ہمارا رخ دروازے کی طرف ہوتے ہی دو بیروں نے جست لگا کر دروازے کے پاس پہنچے اور دروازے کو دونوں پٹ کھول کر اپنے حساب سے فرشی سلام کئے۔ ہمارے ٹیبل والے بے رے نے تھینک یو کہہ کر ٹیکسی منگوانے کے لئے ہم سے پوچھا۔ دل میں میں نے سوچا کہ پے سے میں بڑی طاقت ہے اور ہر کوئی پے سے کو ہی سلام کرتا ہے۔ خالد کا موڈ سخت خراب تھا۔ وہ ٹیکسی لے کر فوراً اپنے ہوٹل میں چلنے کے بجائے شہر کی سڑکوں پر کچھ دیر کے لئے گھومنا چاہتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ ے ہ سخت ٹینشن میں ہے۔ تین چار سو گلڈر کھانے پر خرچ کرنے کی بجائے دو گلڈر کا مجھے ملک شیک پلا دیتا تو اس وقت ہم سب سکون سے ہوتے بلکہ نیند بھی آ چکی ہوتی لیکن اب شہر کی سڑکوں پر ہم چپ چاپ ٹہل رہے تھے اور نجانے کتنی دیر ٹہلنا پڑتا اگر دو تین ایشیائی اور افریقی چرسی اور دانت ٹوٹی ہوئی بھکارنیں بھیک مانگ کر ہمیں پریشان نہ کرتیں۔ ہالینڈ کے کئی بڑے شہروں کے سڑکوں پر رات کو دس بجے کے بعد چرسی موالیوں اور خوفناک قسم کی بھکارنوں اور مدی خارج رنڈیوں کا راج رہتا ہے۔ خالد نے اسی میں عافیت سمجھی کہ ٹیکسی روکی جائے۔ ایک ٹیکسی جے سے ہی گزری تو ہم اس میں سوار ہو گئے جس نے ہمیں لا کر ہمارے ہوٹل کے پاس چھوڑا۔

ڈچوں نے ہالینڈ بنایا

روٹر ڈیم اور ایمسٹرڈیم کے بارے میں بہت سے لوگوں نے سنا ہو گا کہ ان میں سے ایک دنیا کی بڑی بندر گاہ ہے اور دوسرا بہت بڑا ہوائی اڈہ لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ دونوں شہر ہالینڈ میں ہیں جسے نیدر لینڈ (Netherlands) بھی کہتے ہیں۔ اس ملک کے رہنے والے ڈچ (Dutch) کہلاتے ہیں اور ڈچ اور ڈیوچ میں فرق ہے۔ ڈیوچ مارک جرمنی کی کرنسی ہے اور جرمنی کو ڈیوچ لینڈ کہتے ہیں۔ دنیا کی معروف ایئر لائن KLM بھی ڈچ کمپنی ہے یعنی اس کا تعلق ہالینڈ سے ہے۔ دنیا کی معروف پیٹرولیم کمپنی شیل اور ریڈیو ٹی وی ٹیوب لائٹ اور بلب وغیرہ بنانے والی فلپس بھی ہالینڈ کی کمپنی ہے۔

ڈچ (یعنی ہالینڈ کے رہنے والے) حالانکہ انگریزوں اور پرتگالیوں سے بھی اچھے جہاز ران تھے (اور آج بھی ہیں) اور انگریزوں سے بھی پہلے برصغیر اور جنوبی ایشیا کے ممالک سری لنکا، ملائیشیا، انڈونیشیا پہنچے تھے لیکن بقول مے رے ڈچ میزبان کیپٹن ہوگلینڈ کے "ہمارا (ڈچ لوگوں کا) مقصد صرف اور صرف تجارت تھا اس لئے ہم انگریزوں کی طرح کہیں بھی قبضہ جما کر نہیں بیٹھے۔ کہیں بھی مقامی لوگوں کو آپس میں لڑا کر ان کی زمین ہڑپ نہیں کی اور نہ ان پر حکومت کے خواب دیکھے۔۔"

دراصل ڈچوں نے کوشش پوری کی لیکن انگریز جے سے استادوں کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ پھر بھی 1948ء تک انڈونیشیا کے سارے جزیروں پر (جاوا اور سماٹرا سے لے کر بالی اور عیراں جایا تک) ڈچوں کا قبضہ تھا جن سے سوئیکارنو نے جان چھڑوائی۔ ملایا (آج کا مغربی ملائیشیا) پر بھی ڈچوں کا قبضہ تھا جس کا ان دنوں دارالخلافہ ملاکا تھا۔ انگریزوں نے آکر ڈچوں کو بھگایا اور جاتے جاتے ملاکا کے بدلے میں انگریزوں سے جزیرہ سماٹرا کی بندر گاہ بینکولیں لے لی تھی۔ ڈچ سری لنکا، جو ان دنوں سیلون کہلاتا تھا، کی بھی جان نہیں چھوڑ رہے تھے۔ جنوبی امریکہ کے ملک سری نام اور وہیں کے پڑوسی جزیروں پر ہالینڈ کا ابھی تک بالواسطہ قبضہ ہے۔

ہالینڈ کا بڑا حصہ سطح سمندر سے نیچے ہے جو سمندر کی بڑی لہر آنے سے ڈوب جاتا ہے مگر یہاں کے لوگ (ڈچ) ہمیشہ سمندر کا مقابلہ کرتے آئے ہیں۔ سمندری لہر اور سیلاب سے بچاؤ کے لئے ان لوگوں نے بڑی کھائیاں کھود رکھی

ہیں جن میں سمندر کا پانی جمع ہو جاتا ہے جہاں سے پن چکیوں (Wind Mills) کے ذریعے پانی کو نکال کر واپس سمندر میں ڈالا جاتا ہے۔

جہازوں کی سہولت کے لئے بندر گاہ اور سمندر کے چینل کی کھدائی کر کے گہرا کرتے رہتے ہیں اور نکلی ہوئی مٹی سے سمندر کا کچھ حصہ بھر کر اسے زمین کی شکل دے تے ہیں۔ یعنی تھوڑی تھوڑی زمین حاصل کرتے رہتے ہیں۔ اس کام میں (سمندر کو زمین میں تبدیل کرنے میں) ڈچ لوگ دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ پورٹ قاسم کے سمندری چینل (جن سے آنے جانے والے جہاز گذرتے ہیں) کو گہرا کرنے کے لئے ان کی کھدائی کر کے نکلی ہوئی مٹی سے ڈیفنس سوسائٹی کے کچھ حصوں کو بھرنے کے کام مین ڈچ انجینئرز کا ہاتھ ہے۔ کئی صدیاں قبل ہالینڈ کی زمین کم سمندر زیادہ تھا جسے ڈچ لوگوں نے بھر بھر کر موجودہ شکل دی ہے۔ اس سلسلے میں ڈچوں سے متعلق کئی کہاوتیں مشہور ہیں جے سے کہ:

God made land – Dutch made Holland

یا God made Sea, Dutch made Shore

ےہ ملک گائے بھینسوں، دودھ، مکھن اور پنیر جیسی چیزوں کے باعث مشہور ہے۔ شہر سے باہر چاروں طرف ہریالی اور چراگاہیں نظر آتی ہیں۔ بقول ہمارے یمن کے ساتھی محمد مبارک کے ہالینڈ میں انسانوں سے زیادہ گائیں ہیں۔ شہروں میں جتنے لوگ نظر آتے ہیں اس سے کئی گنا زیادہ گائیں دیہات میں نظر آتی ہیں۔

ہالینڈ پن چکیوں اور لکڑیوں کے رنگین جوتوں (سلیپروں) کی وجہ سے بھی مشہور ہے جو یہاں کے کسان لوگ کھیتوں میں کام کرتے وقت پہنتے ہیں۔ فلپس، شیل اور کے ایل ایم کے علاوہ فوکر، ٹنکن اور اکزو بھی مشہور نام ہیں جو ڈچ کمپنیاں ہیں جن کا ہیڈ کوارٹر ہالینڈ ہے۔ فوکر کمپنی ہوائی جہاز بناتی ہے جس کے فوکر 50 اور فوکر 100 نامی ہوائی جہاز دنیا بھر میں بہت مشہور ہیں یہاں تک کہ دنیا کی کوئی بھی کمپنی ان سے ملتے جلتے ہوائی جہاز بناتی ہے تو وہ بھی فوکر کہلاتے ہیں جے سے Jeep (جیپ) گاڑی کا نہیں کمپنی کا نام ہے لیکن اس کمپنی کی اس شکل کی گاڑی اتنی مشہور ہوئی کہ اب سوزوکی، ٹویوٹا یا دوسری کمپنیاں اس قسم کی گاڑی بنا کر چاہے کچھ بھی نام دیں لیکن سڑک پر کھڑا ہوا ایک عام آدمی اسے جیپ ہی کہتا ہے۔ Heineken شراب بنانے کی کمپنی ہے جس کا اس نام کا بنا ہوا بیر (Beer) پورے یورپ میں اے سے مشہور ہے جے سے پاک وہند میں ہمدرد کا روح افزا۔ ڈاکٹر اور دل کے مریض ڈچ کمپنی AKZO سے اچھی طرح واقف ہونگے جس کی امراض قلب کی ادویات اور آلات جراحی دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ٹرک تیار کرنے والی کمپنی DAF، کاغذ بنانے والی کمپنی KPN بھی ہالینڈ کی ہیں۔

آرٹ کی دنیا سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ےہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ دنیا کا مشہور آرٹسٹ رمبرانٹ (Rembrandt Harmensozoon) ڈچ تھا جو 1606ء میں لیڈن (Leiden) نامی شہر میں پیدا ہوا۔ دنیا کی

مشہور تصویریں The Syndics of Draper's Guild اور دی نائٹ واچ وغیرہ اس ڈچ آرٹسٹ ریمبرانٹ کی ہیں۔

ہالینڈ کے دو بڑے شہروں ایمسٹرڈیم اور روٹرڈیم کے علاوہ ہیگ بھی بڑا شہر ہے جسے انگریزی میں The Hague اور ڈچ زبان میں Dan Haag کہتے ہیں جو عالمی کانفرنسوں اور معاہدوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس قسم کے کاموں کے لئے ہالینڈ کا ایک جنوبی شہر (Maasticht) (ماسٹر فٹ) بھی دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یورپی کمیونٹی کے اکثر اجلاس اس شہر میں ہوتے ہیں۔

مالمو سے ایمسٹرڈیم

مجھے اور مے رے ساتھی انجینئر (یمن کے محمد مبارک) کو جہاز میں اگلی نشست پر بیٹھنے کا بڑا شوق تھا۔ چھ مہینے سے کبھی اس ملک کبھی اس ملک فیلڈ ٹرپ کے سلسلے میں جانا ہو رہا تھا لیکن ہماری تو اگلی نشست پر بیٹھنے کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ ہوائی اڈے پر جلدی آکر قطار مین سب سے آگے بھی کھڑے ہوتے لیکن بورڈنگ کارڈ پے چھے کی سیٹ کا ہی ملتا۔ آگے کی سیٹ پر بیٹھنے کا یہ مزا ہے کہ ٹانگیں پھیلانے کے لئے کافی جگہ مل جاتی ہے اخبارات اور رسالے بھی مرضی کے ملتے ہیں ورنہ پیچھے کی سیٹ پر اکثر بچا کھچا فرانسیسی یا ہسپانوی اخبار ملتا تھا جسے پڑھنے سے ہم قاصر تھے۔

اور یہ پہلی مرتبہ تھا کہ خوش قسمتی سے ہمیں اگلی نشست پر بیٹھنے کا موقع مل گیا تھا حالانکہ یہ کوئی لمبی اڑان بھی نہیں تھی۔ ہمارا ہوائی جہاز تقریباً ساٹھ ستر مسافروں کو لے کر سوئیڈن کے مالمو ائیرپورٹ سے ہالینڈ کے ایمسٹرڈیم ائیرپورٹ کی طرف جا رہا تھا۔ موسم ٹھیک ہی تھا اور مقررہ وقت یعنی ڈیڑھ گھنٹے میں جہاز کو ایمسٹرڈیم پہنچنا تھا۔ بہر حال ہم خوش تھے۔ اگلی نشست پر بیٹھتے ہی ہم نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر اپنی فتح کا اظہار کیا اور پے چھے باقی مسافروں کے بیچ میں بکھرے ہوئے اپنے باقی دس بارہ ساتھیوں پر بڑے فخر سے فاتحانہ انداز میں نگاہیں ڈالیں بلکہ جان بوجھ کر تھوڑی دیر کے لئے کھڑے رہے تاکہ باقی ہمارے جہاز ران ساتھی اچھی طرح ہمیں دیکھ لیں کہ صرف ان کو نہیں ہمیں بھی آگے کی سیٹ مل سکتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگلی نشست حاصل کرنے میں ہم دونوں نے بڑی محنت کی تھی۔ ایئرپورٹ پر جلدی پہنچنے کے لئے ہم گھر سے دو گھنٹے پہلے ہی نکلے تھے، ائیرپورٹ تک آنے

کے لئے بس کی بجائے ہم نے ٹیکسی کی تھی۔ گھر سے جلدی جلدی نکلنے کے چکر میں ہم دونوں نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ ائیر پورٹ پر پہنچ کر ہی کافی سینڈوچ سے ناشتہ کیا۔

"کوئی بات نہیں۔ ٹیکسی اور ناشتے پر خرچہ کیا لیکن اکانومی کلاس کے آگے کی سیٹ حاصل کرنا بزنس (فرسٹ) کلاس کے برابر ہے جس کا کرایہ دگنا ہوتا ہے۔ مالمو کے ہوائی اڈے پر بورڈنگ کارڈ لیتے وقت بھی ہم سب سے آگے تھے۔ ٹکٹ لینے والا کلرک انگریزی سے ناواقف تھا۔ وہ اپنی مادری زبان سوئیڈش میں کچھ بولے جارہا تھا لیکن ہماری ضد یہ تھی کہ ہمارے بورڈنگ کارڈ پر ون اے اور ون بی لکھو تا کہ اگلی نشستیں ہمارے لئے کنفرم ہو جائیں۔ اس کے لکھنے پر محمد مبارک نے مجھے مبارک کے ساتھ ساتھ شاباش بھی دی۔

جہاز میں سوار ہوتے وقت مسافروں کی کوئی بھاگ دوڑ محسوس نہ ہوئی۔ سب مقامی سوئیڈش لوگ تھے سوائے ہم چند جہاز رانوں کے۔ جہاز بہت چھوٹا تھا۔ سیڑھی پر ڈچ کمپنی کے ہوائی جہاز کی ڈچ ائیر ہوسٹس نے خوش آمدید کہا ار جواب میں ہم نے اپنا بورڈنگ کارڈ اس کی آنکھوں کے آگے لہرایا۔ اس نے کارڈوں کی پروانہ کرتے ہوئے ہمیں صاف انگریزی میں کہا۔ "برائے مہربانی جلدی جلدی بیٹھ جائیں سیٹ نمبروں کے چکروں میں نہ پڑیں۔"

یہ تو اچھا ہوا کہ ہمارے آگے صرف چار پانچ بوڑھے سوئیڈش تھے جو جہاز میں چڑھتے ہی پیچھے کی طرف چلے گئے اور ہمیں آگے کی سیٹ مل گئی۔ اس وقت ہمیں ایئرپورٹ کے کلرک کی بات سمجھ میں آگئی کہ وہ اپنی زبان میں ہمیں یہ سمجھا رہا تھا کہ جہاز چھوٹا ہے اور مسافروں کی تعداد کم ہے اس لئے سیٹ نمبر نہیں دیئے گئے ہیں۔ جہاز واقعی اتنا چھوٹا تھا کہ فرسٹ کلاس بھی نہیں تھا۔ بس دو پائلٹوں کے لئے ایک چھوٹا سا کاک پٹ تھا۔ پورے جہاز کے لئے صرف ایک خدمتگار یعنی ائیر ہوسٹس تھی۔ اس کے بیٹھنے کے لئے بھی الگ سیٹ نہیں تھی۔ ہماری دوسری طرف والی آگے کی جو دو سیٹیں خالی تھیں، ٹیک آف کے وقت وہ ان میں سے ایک پر بیٹھی تھی۔ بعد میں اسی ائیر ہوسٹس سے معلوم ہوا کہ KLM ہوائی جہاز کمپنی نے ان چھوٹے چھوٹے جہازوں کی ایک نئی سروس چند ماہ قبل شروع کی ہے تا کہ پڑوس کے شہروں کو ایمسٹرڈیم سے ملایا جائے جہاں سے مسافر بڑے جہازوں کے ذریعے دنیا کے دور دراز ملکوں میں جا سکیں۔

تمام مسافروں کے بیٹھنے کے بعد ائیر ہوسٹس نے دروازے کے پاس رکھی ہوئی سلائڈنگ والی الماری کو تھوڑا سا سرکا کر ہوائی جہاز میں داخل ہونے والے دروازے کو اچھی طرح بند کیا اور الماری کو پھر واپس دروازے کے ساتھ ملا کر اس سے باندھ دیا تا کہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکے۔ اس کے بعد مائیکروفون ہاتھ مین لے کر دستور کے مطابق تقریر کے ذریعے مسافروں کو بتایا کہ اس جہاز کے ایمرجنسی دروازے یہاں ہیں۔ جہاز کا پورا سفر بحر شمال (North Sea) کے اوپر رہے گا اور دوران پرواز کوئی حادثہ پیش آنے پر سیٹ کے نیچے رکھی ہوئی لائف جیکٹ پہن کر سمندر میں

چھلانگ لگائی جا سکتی ہے۔ لائف جیکٹ کو منہ سے پھلانے کے بجائے اس میں لٹکتے ہوئے دھاگے کو کھینچنے سے وہ آٹو میٹک پھول جائے گی، وغیرہ وغیرہ (اور اس قسم کے جب بھی حادثے ہوتے ہیں تو افراتفری کے عالم میں آدھے سے زیادہ لوگوں کو اپنی لائف جیکٹ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی اور جن کو مل جاتی ہے ان سے جلدی میں پہنی نہیں جاتی اور جو شہزادے پہننے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ان کو وہ چوہے کے دم جیسا لٹکتا ہوا دھاگا نظر نہیں آتا۔ اندھیرے میں غیر مانوس ماحول اور سرد ہواؤں میں جن کا ہاتھ اس دھاگے تک پہنچ جاتا ہے ان سے وہ کھینچا نہیں جاتا ہے) بقول مے رے ساتھ بیٹھے ہوئے یمن کے محمد مبارک کے: "ہم سب کے بدلے میں صرف یہ نیلی آنکھوں والی ڈچ ایئر ہوسٹس اگر اپنی زندگی بچا سکے تو وہ بھی بڑی غنیمت ہو گی۔"

بہر حال ہر جہاز میں ڈیوٹی پر مقررہ ایئر ہوسٹس جان بچانے کی ترکیب اتنا جلدی سے بتاتی ہے کہ سمجھنا آسان کام نہیں ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ اسی پر گزارا کرنا چاہیے۔ ہر مسافر کے سامنے اس قسم کا بروشر رہتا ہے جس میں تصاویر کے ساتھ یہ تمام باتیں تحریر ہوتی ہیں تا کہ سمجھنے میں آسانی رہے۔ ایئر ہوسٹس بھی اپنی تقریر کے آخر میں اس بروشر یا کتابچے کو پڑھنے کی تاکید کرتی ہے تا کہ کل کوئی اس پر یا ہوائی کمپنی پر الزام نہ لگائے۔

بہر حال یہ سارے کام پورے کر کے وہ خود بھی کمر کی پیٹی باندھ کر بالم ہو کر ہوائی جہاز کے اڑنے کا انتظار کرنے لگی۔ جہاز نے رن وے پر دوڑنا شروع کیا اور نامعلوم کتنی دوڑ کے بعد پرواز بھی شروع کر دی لیکن ہمیں یہی محسوس ہوتا رہا کہ جہاز ڈامر کے رن وے پر دوڑ رہا ہے۔ جہاز کے دھچکوں کے علاوہ اس کے انجن کی آواز اور تھرتھراہٹ (Vibration) وہی رہی۔ باہر موسم بھی خراب نہ تھا۔ ساتھ بیٹھے ہوئے مبارک نے اپنے انداز میں مائی ڈیئر فرینڈ کا تکیہ کلام استعمال کرتے ہوئے کہا۔ "یہ درد سر کیا اس طرح چلتا رہے گا یا بہتر بھی ہو گا؟"

مبارک کے پوچھنے سے پیشتر میں بھی اس کھوج میں لگا ہوا تھا کہ شاید جہاز چھوٹا ہے اس لئے یہ سب کچھ ہو رہا ہے کیونکہ بڑے جہاز میں تو ایسا کبھی نہیں ہوتا لیکن پھر فوراً یہ پتہ چل گیا کہ جہاز کا انجن جس پر (Wing) میں ہے وہ بالکل ہماری سیٹ سے ملا ہوا ہے۔ مبارک کو میں نے یہ بُری خبر سناتے ہوئے کہا: "اب اِدھر اُدھر گردن گھما کر کوئی خالی سیٹ تلاش کرو۔"

پورے جہاز میں سیٹوں کی کل تعداد ہی کیا تھی۔ سوائے دو کے ساری پر تھیں اور یہ دو ہمارے بالکل پیچھے والی تھیں۔ یعنی بقول ایک سندھی کہاوت کے "نابینا دلہن کے لئے کیا میکہ کیا سسرال" اگلی سیٹ سے اٹھ کر ایک فٹ پچھلی سیٹ پر بیٹھنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اب ہمیں یہ بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس قسم کے جہازوں میں سیانے لوگ اگلی نشستوں سے کیوں دور بھاگتے ہیں اور ہم لیڈری دکھا کر آگے بیٹھ چکے تھے۔ مبارک نے پریشان ہو کر پوچھا

کہ "اب کیا کیا جائے مائی ڈیئر فرینڈ؟ جہاز کی لرزش (Vibration) کی وجہ سے کانوں میں گدگدی ہو رہی ہے جن کو کھجا کھجا کر میں تھک گیا ہوں۔"

میں نے مبارک کو خبردار کرتے ہوئے کہا۔ "اب صبر و تحمل سے بیٹھے رہو۔ اپنے ساتھیوں کو اپنی اس خواری کا پتہ نہیں چلنا چاہیے ورنہ بڑا مذاق اڑائیں گے۔"

مبارک کو میری بات سمجھ میں آگئی اور پھر ہماری قطار میں دوسری طرف بیٹھی ہوئی (بلکہ آنکھیں بند کئے سونے کی کوشش کرتی) ہوئی ایئر ہوسٹس کو غور سے دیکھ کر خود بھی اس کی طرح اپنا سر کھڑکی پر رکھ کر سونے لگا مگر اسے مزہ نہ آیا اور سونے کو چھوڑ کر اخبار پڑھنے لگا لیکن ایسی Vibration میں سوئی میں دھاگہ ڈالنے اور اخبار بینی جیسا کام کون کر سکتا ہے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا درمیان میں اور پیچھے بیٹھے ہوئے ہمارے باقی جہاز ران ساتھی بڑے آرام سے ٹیلیگراف اور یورپین اخبار پڑھ رہے تھے یعنی باقی جہاز میں طوفان تھا نہ لہریں۔ اس طوفان کی زد میں صرف ہماری آگے والی دو تین سیٹیں تھیں۔ مبارک نے اخبار کو ایک طرف پھینک دیا۔

"روٹرڈیم آنے میں باقی کتنی دیر ہے؟" مبارک نے بیزار ہو کر پوچھا۔

"بس یہی کوئی ایک گھنٹہ۔" میں نے جواب دیا۔

"بھلا ایئر ہوسٹس خود جاگے گی یا اسے جگانا پڑے گا؟"

"کیوں بھئی؟" میں نے پوچھا۔ مبارک نے کان کھجاتے ہوئے کہا۔

"مائی ڈیئر فرینڈ ایمسٹرڈیم آنے میں وقت ہی کتنا رہ گیا ہے ابھی تو اس کو کھانے کی ٹرے نکال کر ہر ایک کے آگے رکھنی ہے۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد اسے چائے پلانی ہے۔ ڈیوٹی فری چیزوں کی فروخت کرنی ہے پھر برتن جمع کرنے ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں ایمسٹرڈیم پہنچنے سے پہلے یہ سارے کام کر سکے گی؟ اور پھر جہاز کا دروازہ کھولنے کے لئے الماری کو بھی کھسکانا ہے۔"

'فی الحال اسے سونے دو۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

مے رے اس سوال پر مبارک نے ہنستے ہوئے کچھ دن پہلے بتائی ہوئی میری بات دہرائی۔ "کیا اسے بھی آزادی کا خواب دے کھنے دیں؟"

ہمارے جے سے غریب ملک کے رہنے والے کو سڑک کے کنارے سوتا ہوا دیکھ کر گزرنے والے ایک دانشور نے اسے جگانے کی کوشش کی۔ وہیں سے گزرنے والے ایک اور راہ گیر نے یہ دیکھ کر اس دانشور سے کہا۔

"بھائی سوئے ہوئے انسان کو کیوں جگا رہے ہو؟ ہو سکتا ہے وہ آزادی کا خواب دیکھ رہا ہو۔"

دانشور نے جواب دیا۔ "میرے خیال میں آزادی کا خواب دے کھنے کی بجائے اٹھ کر آزادی کے لئے جدوجہد کرے تو بہتر ہے۔"

مبارک یہ حکایت یاد کر کے کہنے لگا "یہ خوبصورت ڈچ دوشیزہ بھی شاید آزادی کا خواب دیکھ رہی ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ ڈچ دوشیزہ آزادی کا تو نہیں البتہ ہم جیسے ایشیائی اور افریقی باشندوں کو غلام بنانے کا خواب دیکھ رہی ہو گی.... ایک اور انڈونیشیا، ملائیشیا، سری نام اور سری لنکا پر قبضہ کرنے کا۔"

مبارک نے سنجیدہ شکل بنا کر کچھ خفگی سے مجھ سے کہا۔ "مائی ڈیئر فرینڈ! آپ یورپی اور انگریزوں پر ہر وقت کیوں ناراض رہتے ہیں؟ میں مانتا ہوں کہ ان لوگوں نے ہمارے ملکوں پر حکومت کی مگر کبھی تو حقیقت پسند ہو کر یہ سوچو کہ ہمارے اپنے حاکموں سے تو یہ یورپین اور انگریز بہتر تھے۔ سو سال کی حکومت میں انگریزوں نے اتنے لوگ نہیں مارے ہونگے جتنے ہمارے حاکموں کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے غریب لوگ مر چکے اور مر رہے ہیں۔ یوگینڈا اور نائیجیریا سے فجی اور پاپوانیوگنی تک کی مثال لے لیں۔ گوروں نے لوٹ کھسوٹ ضرور کی ہے لیکن اس کے بدلے میں ہمارے ملک کو بنایا بھی۔ ہمرے حکمرانوں نے فقط ایک کام کیا ہے وہ دن رات اپنے ذاتی حالات درست کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ مائی ڈیئر فرینڈ! جھاڑو دے نے والے فقط سڑکیں صاف کرتے ہیں جبکہ ہمارے حکمرانوں نے تو پورا ملک ہی صاف کر دیا ہے۔...."

نیند پوری ہونے پر یا شاید مبارک کی زوردار تقریر پر اس ہوائی جہاز کی اکلوتی ایئر ہوسٹس اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کام کرنے میں وہ بڑی تیز نکلی۔ اس نے ہر ایک کے آگے جلدی جلدی ناشتہ لگایا اور چائے اور کافی بھی ایک مرتبہ نہیں بلکہ دو مرتبہ پلائی۔ آخر میں خالی برتن اٹھا کر ٹرالی میں لیجے سے ہی جمع کئے تو ہمارا جہاز بادلوں سے نیچے آنے لگا اور پائلٹ نے ایمسٹرڈیم کے ہوائی اڈے پر اترنے کی نوید مسرت سنائی۔

ایمسٹرڈیم کے ہوائی اڈے پر

ایمسٹرڈیم میرے خیال میں یورپ کا واحد ایئرپورٹ ہے جہاں امیگریشن اور کسٹم والوں نے رسمی چیکنگ کے نام پر ہمیں ذلیل وخوار نہیں کیا۔ شاید ان کو پہلے سے اطلاع تھی کہ ہمارے گروپ کا تعلق IMO جے سے بین الاقوامی ادارے سے ہے یا شاید "ڈائن بھی ساتواں گھر چھوڑتی ہے" کے اصول پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے اپنی آنکھیں

بند کر لیں اور ہمارے پاسپورٹ کے ایک ایک صفحے اور بیگ کے ایک ایک کونے کو غور سے دیکھے بغیر ہمیں باہر جانے کی اجازت دے دی۔ ویسے بھی اس ائیر پورٹ پر مجھے ایشیا اور افریقہ کے کافی لوگ نظر آئے۔ آنے والے مسافروں میں بھی اور ائیر پورٹ پر کام کرنے والے بھی۔ کچھ فرانس اور انگلینڈ کے ہوائی اڈے کا ماحول لگ رہا تھا جہاں اسکینڈی نیوین ملکوں کی نسبت افریقہ اور ایشیا کے لوگ زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس ہوائی اڈے پر یورپ، افریقہ اور ایشیا کے لوگوں کی کھچڑی بھی کافی نظر آرہی تھی جسے ہم یوروافریقن، اینگلوانڈین، فرینکوالجیرین، یوروانڈین یا حرف عام میں ہمارے ملکوں میں ففٹی ففٹی بولتے ہیں۔

شکل میں گورے اور کالے بالوں والے ایک خوبرو پولیس افسر سے میں نے پوچھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔

"یہاں کا، جرمنی کے قریبی شہر ارن ہیم میں میں پیدا ہوا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

ہالینڈ کے مشرق مین جرمنی ہے اور جنوب میں بیلجیئم شمال اور مغرب میں بحر شمال (North Sea) ہے بلکہ دیکھا جائے تو نصف سے زیادہ ہالینڈ بحر شمال کا حصہ ہے جسے مٹی سے بھر بھر کر زمین بنائی گئی ہے اور اس وقت بھی یہ زمین سطح سمندر سے کافی نیچے ہے۔

"میرا مطلب ہے آپ یہاں کے مقامی باشندے ہیں یا کہیں اور سے نقل مکانی کر کے آئے ہیں؟" میں نے اس نوجوان پولیس افسر سے پوچھا جو اپنے ناک نقشے اور گورے رنگ کی وجہ سے تو بالکل مقامی باشندہ یعنی یورپی لگ رہا تھا لیکن اس کے کالے بال گواہی دے رہے تھے کہ وہ یہاں کا نہیں ہے۔ اس نے بتایا کہ "مے رے ماں باپ ترک ہیں۔ مے رے والد یا شاید دادا دوسری جنگ عظیم کے بعد ازمیر (ترکی) سے یہاں آئے۔"

"شکریہ - میں یوں ہی پوچھ رہا تھا۔ اس وقت میں سوئیڈن سے آرہا ہوں وے سے میرا وطن پاکستان ہے۔" میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"ہمارے ڈپارٹمنٹ میں کئی پاکستانی کام کرتے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"میرے لئے حیرت اور خوشی کی بات ہے ورنہ یورپ کے دوسرے ملکوں میں ایشیا اور افریقہ کے لوگوں کو اہم اداروں میں ملازمت دینے سے گریز کی جاتی ہے۔ زیادہ تر بے روزگاری کی صورت میں سرکاری خیرات (Social) کی ماہوار رقم پر گزارا کرتے نظر آتے ہیں یا ریلوے اسٹیشن، ہوائی اڈوں اور کارخانوں کے آگے (زیادہ تر پاکستانی اور عرب) بانس کے لمبے ڈنڈے میں جھاڑو باندھ کر دیواروں اور چھتوں سے جالے اتارتے یا سڑکیں صاف کرتے پھرتے ہیں۔"

"اس ملک (ہالینڈ) میں اتنی نسل پرستی نہیں ہے۔ جو شروع سے یہاں رہتے چلے آرہے ہیں ان کو یہاں کے مقامی لوگ اپنے جیسا سمجھتے ہیں اور یہاں ایک عرب یا پاکستانی کو بھی وہی حقوق دیئے گئے ہیں جو ڈچوں کو حاصل ہیں۔ یہ

الگ بات ہے کہ اب کسی نئے آنے والے کو یہاں رہنے نہیں دیا جاتا، یہ ملک بھی جاپان کی طرح چھوٹا ہے۔" ترک پولیس افسر نے بتایا۔

یہی بات دوسرے دن ہمارے دفتر کے ڈچ سروئیر مسٹر ہوگ لینڈ نے بتائی کہ ڈچ دوست مزاج قوم ہے، ہالینڈ میں رہنے والا آزاد ہے کہ وہ اپنی پسند کی کوئی سی زبان یا مذہب اختیار کرے۔ "ہالینڈ میں رہنے والا جب تک کسی کو تکلیف نہیں دیتا وہ ہماری نظروں میں اچھا شہری ہے۔ ایک عیسائی اگر شراب پی کر دنگا فساد کرتا ہے اور محلے والوں کے آرام میں خلل پیدا کرتا ہے تو اس سے یہودی یا مسلمان بہتر ہے جو خاموشی سے عبادت کرتا ہے اور محنت کر کے پیسہ کماتا ہے۔"

ترک افسر سے میری بات ہو رہی تھی کہ ہمارا ایک جہاز ران ساتھی تیونس کا عیاض آ گیا۔

"میرا سامان رکھو تو میں ٹوائلٹ سے ہو آؤں۔" اس نے کہا۔

"چلو میں بھی چلتا ہوں۔ سامان کی ٹرالی بھی وہیں لے چلتے ہیں۔" میں نے اس سے کہا۔ واش روم کا پوچھتے ہوئے ہم اس کونے میں پہنچے جہاں W.C کا بورڈ تھا۔ دروازے کے باہر جھاڑو، بالٹی، صابن، پوچے کے کپڑے اور صفائی کے کاغذوں سے بھری ہوئی ٹرالی کو تھامے ایک پاکستانی عورت کھڑی تھی۔ وہ واش روم صاف کر کے نکلی تھی یا شاید صاف کرنے کے لئے اب جا رہی تھی۔ یورپ کے ملکوں میں ایسی جگہوں پر صفائی کا کام عورتیں کرتی ہیں اور جس وقت اس قسم کی ٹرالی بیت الخلاء کے باہر نظر آئے تو اندر نہیں جانا چاہیے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مردانہ بیت الخلاء میں کوئی عورت صفائی کر رہی ہے۔ اس وقت ٹرالی کے ساتھ صفائی والی بھی کھڑی تھی اس لئے میں نے اس سے انگریزی میں (جس زبان سے میں واقف تھا) پوچھا۔

"ہم اندر جا سکتے ہیں یا آپ صفائی کے لئے اندر جا رہی ہیں؟"

وہ انگریزی نہیں سمجھتی تھی۔ مجھے ہم شکل دیکھ کر سمجھ گئی کہ میں بھی دنیا کے اس کونے سے آیا ہوں جہاں سے اس کا تعلق ہے۔ اس نے پنجابی میں کہا۔

"مجھے ڈچ اور پنجابی آتی ہے۔"

یعنی اسے یا اس کے ماں باپ کو یہاں آئے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے اور اپنی مادری زبان کے علاوہ مقامی زبان ڈچ سے بھی واقف ہے۔

"ایسٹ پنجاب کی ہو یا ویسٹ کی؟" میں نے پاکستان یا بھارت کہنا مناسب نہیں سمجھا۔

"گوجرانوالہ کی ہوں" اس نے جواب دیا۔ اس کے جواب سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ جغرافیہ میں کمزور ہے یا اس کے لئے ایسٹ ویسٹ یا بھارت پاکستان جیسی سیاسی پہچان کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ صفائی کر چکی تھی لہٰذا اس نے ہمارے اجازت لے نے پر اپنی ٹرالی دروازے کے آگے سے ہٹا کر ہمیں اندر جانے دیا۔ اندر پہنچ کر میں نے عیاض سے کہا۔

"میں ابھی ابھی اس پولیس افسر سے شکایت کر رہا تھا کہ یورپ کے لوگ ہم ایشیائی اور افریقی افراد کو اپنے ملک میں اچھی ملازمت نہیں دے تے اور ابھی دو منٹ بھی نہیں گزرے تو اپنے ملک کی عورت کو دے کھ کر حقیقت سامنے آگئی۔"

عیاض ایک نمبر کا جذباتی، پہلے سے ہی بھرا بیٹھا تھا۔ بس مے رے دو الفاظ کہنے کی دیر تھی کہ وہ شروع ہو گیا۔

"یہ ذلیل یورپی ہمیں نیچ سمجھتے ہیں۔ مے رے ساتھ ذرا فرانس چل کر دیکھو جہاں ہمارے ملک تیونس اور الجیریا وغیرہ کے کئی مسلمان رہتے ہیں۔ کوئی اکا دکا اچھی ملازمت کر رہا ہو گا ورنہ ہمارے سارے عرب بھائی ہاتھ میں جھاڑو لئے نظر آئیں گے۔ اس سے تو اپنے ملک میں رہیں تو بہتر ہے۔"

"نہیں۔ ہر گز نہیں۔ عیاض! میں نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی ایسا اہم مسئلہ ہے جسے اپنی غیرت کا مسئلہ بنایا جائے اور جو کچھ ملازمتیں یہاں حاصل ہو چکی ہیں ان کو چھوڑ کر وطن واپس لوٹنا چاہے ے۔" میں نے کہا۔

"کے وں؟" عیاض نے پوچھا۔

"بس یونہی۔ میں سمجھتا ہوں یہ آج کے انسان کی مجبوری ہے۔ کیا ان غریب لوگوں کو ایسی نوکری ان کے اپنے وطن میں مل سکتی ہے جس سے اس کے گھر کا چولہا جل سکے، بچے اسکول جا سکیں؟ کیا ہماری حکومتیں اتنی اہل ہیں کہ ہر شہری کو کوئی روزگار مہیا کر سکیں جس سے وہ باعزت زندگی گزار سکے؟ ہمارے ملک میں کسی غریب عورت کو چھوٹی یا بڑی نوکری مل بھی جاتی ہے تو اسے جو ماحول ملتا ہے اس میں اسے ہر وقت مردوں کی طعنہ زنی اور تنقید سننی پڑتی ہے۔ بری نظریں ہر وقت اس کے تعاقب میں لگی رہتی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ یہ صفائی ستھرائی جیسی نوکریاں جن کو ہم خراب سمجھتے ہیں وہ ہمارے دماغ اور سوچ کی کمزوری ہے۔ یہاں کے لوگ اسے خراب نہیں سمجھتے ان کے اپنے گورے لوگ بھی گٹر صاف کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں ہر وہ آدمی جو اپنی ملازمت ایمانداری اور محنت سے سرانجام دیتا ہے وہی اچھا سمجھا جاتا ہے اور اس کی معاشرے مین عزت بھی ہوتی ہے، چاہے وہ جھاڑو دینے کا کام کرتا ہو یا فیکٹری میں مزدوری کرتا ہو۔ اسی طرح اگر کوئی کام سے بھاگتا ہے، دفتر سے غیر حاضر رہتا ہے، ایمانداری سے کام نہیں کرتا ہے تو وہ خراب سمجھا جاتا ہے چاہے وہ ڈاکٹر ہو یا انجینئر، پائلٹ ہو یا جج۔ تیسری بات یہ ہے کہ یہاں یورپ یا امریکہ میں چھوٹی نوکری والے کو بھی اتنی تنخواہ مل جاتی ہے جس سے اس کی بنیادی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔ اس کا اور اس کے بچوں کا علاج معالجہ ہو جاتا ہے، پڑھائی اور اسکول میں داخلہ مل جاتا ہے۔ ہمارے لوگ جو یہاں چاہے

جھاڑو دے تے ہیں یا ٹیکسی چلاتے ہیں عزت کے قابل ہیں۔ یہ لوگ وطن سے دور رہ کر محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کو پالتے ہیں اور اپنے غریب ملک کی کمزور معیشت کو بہتر بنانے میں مدد کرتے ہیں۔ یہ لوگ یقینا ہمارے ان حاکموں، سیاستدانوں اور سرکاری افسروں سے بہتر ہیں جو غریب ملک اور اس کے عوام کو لوٹ کر اپنی عیاشی کے لئے دولت باہر لے جاتے ہیں۔"

معلوم نہیں میری سوچ کس حد تک صحیح تھی لیکن ہر بات پر ضد کرنے والا عیاض میری بات بڑے غور سے سنتا رہا۔

ہالینڈ میں ایک اجنبی سے ملاقات

ایمسٹرڈیم کے ہوائی اڈے تک تو ہم پہنچ گئے تھے لیکن ہماری منزل ایمسٹرڈیم نہیں تھا۔ ہمیں جہازوں کی تعمیرات اور پیمائش کے سلسلے میں ہالینڈ کے ایک اور شہر اور دنیا کی بڑی بندرگاہ روٹرڈیم میں تقریباً دس بارہ دن قیام کرنا تھا۔ سردی کا موسم تھا۔ اس وقت ایمسٹرڈیم میں شدید بارش اور ہوا چل رہی تھی اور ہم اتنی بری طرح تھکے ہوئے تھے کہ دل چاہ رہا تھا کہ کاش روٹرڈیم کی بجائے ہمیں اس شہر ایمسٹرڈیم میں ہی رہنا ہوتا اور ایئرپورٹ سے فوراً ٹیکسی لے کر اپنے ہوٹل میں جا کر آرام کرتے۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ شاید یہ دونوں شہر اتنے قریب ہوں جتنا راولپنڈی اسلام آباد ہیں یا سکھر خیرپور ہیں جن شہروں کے لئے ایک ہی ایئرپورٹ استعمال ہوتا ہے۔ میں یہ معلوم کرنے کے لئے گلبرٹ کو ڈھونڈنے لگا۔ فلپائن نیوی کا کمانڈر گلبرٹ اس دورے میں ہمارا گروپ لیڈر تھا۔ اتنے مین وہ اپنے سامان کی ٹرالی کھینچتا ہوا سامنے سے آتا نظر آیا۔ ہمارے قریب پہنچتے ہی مجھ سے کہنے لگا۔ 'اب روٹرڈیم کے سے پہنچنا ہو گا؟"

"میرے بھائی مجھے کیا معلوم۔" میں نے بے ساختہ جواب دیا۔ "لیڈر آپ ہیں آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔ سوئیڈن سے نکلتے وقت دفتر والوں نے آپ کو ضرور بتایا ہو گا اور ٹکٹیں بھی دیں ہو نگی۔"

"مجھے تو صرف یہاں تک آنے کے ٹکٹ دے ئے تھے اور کہا تھا باقی جو خرچہ ہو وہ واپسی پر کلیم کرنا۔ اب آپ بتائیں آپ تو روٹرڈیم کافی مرتبہ جا چکے ہیں۔" گلبرٹ پریشانی کے عالم میں مجھ سے پوچھنے لگا۔

"دیکھو گلبرٹ! میں روٹر ڈیم گیا ضرور ہوں لیکن وہاں ہمیشہ بحری جہاز میں جانا ہوتا تھا۔ کبھی لندن سے تو کبھی انٹورپ یا ہیمبرگ سے بحری جہاز کے ذریعے روٹر ڈیم کی بندرگاہ پر پہنچ جاتے تھے۔ کبھی کبھی تو جہاز کسی اور کی واچ (ڈیوٹی) میں پہنچ جاتا تھا ہم نیند سے بیدار ہوتے تھے تو جہاز کو بندرگاہ میں لنگر انداز پاتے تھے۔" میں نے بتایا اور پھر قریب کھڑے ہوئے تیونس کے عیاض سے کہا۔ "روٹر ڈیم کی باتیں آپ بھی بہت کرتے ہیں، کچھ معلوم بھی ہے کہ وہاں کے سے پہنچا جائے؟" عیاض نے شکل بنا کر کہا "مے رے پاس کیا کوئی موٹر سائیکل تھی کہ جس کے ذریعے ایک شہر سے دوسرے شہر آتا جاتا رہا۔ میں بھی آپ کی طرح بحری جہاز پر تھا۔ آپ پاکستانی لوگ تو پھر بھی ہر بندرگاہ تک جہاز کو خود لیکر جاتے ہیں ہماری جہاز ران کمپنی کے دفتر سے تو ہمیں یہ ہدایت تھی کہ بحیرہ شمال (North Sea) پہنچ کر ایک مقامی کیپٹن (پائلٹ) مستقل طور اپنے جہاز پر رکھو جو ہمارے جہاز کو مختلف بندرگاہوں میں لے جاتا تھا۔" "چلو رہنے دو میں معلوم کرتا ہوں۔" گلبرٹ نے کہا اور وہ اپنے سامان کی ٹرالی ہمارے پاس چھوڑ کر چلا گیا۔ میں دل ہی دل میں یہی دعائیں مانگتا رہا کہ روٹر ڈم چاہے بس یا ٹیکسی جس سے بھی جانا پڑے ایئرپورٹ کے دروازے سے ہی مل جائے ورنہ اس بارش میں بغیر چھتری کے حالت خراب ہو جائے گی۔"

تھوڑی دیر کے بعد جب گلبرٹ واپس آیا تو پتہ چلا کہ ہم جس شہر میں ہیں اس کی پوزیشن نواب شاہ جیسی ہے جہاں سے ہم بس، ٹیکسی، ٹرین یا ہوائی جہاز کے ذریعے کراچی یعنی روٹر ڈیم پہنچ سکتے ہیں اور سب سے آسان اور سستی سواری ٹرین ہے جس کے لئے ہمیں ایئرپورٹ سے باہر سرد ہوا اور بارش میں نکلنے کے بجائے صرف دو سیڑھیاں نیچے اترنا ہے۔ اندھا کیا مانگے دو آنکھیں، مشینی سیڑھی (Escalator) سے نیچے اترے تو لاہور جیسا خوبصورت ریلوے اسٹیشن دیکھا۔ (اب تو پاکستان میں صرف لاہور کے ریلوے اسٹیشن کا یہ حال ہے کہ اس کا کچھ حصہ دیکھنے کے قابل رہ گیا ہے باقی ریلوے اسٹیشن تو اے سے بھوت بنگلہ بن چکے ہیں کہ ان کو بنانے والے (انگریز) آج انہیں دیکھیں تو وہ بھی ڈر جائیں) ہم نے پچیس گلڈر فی ٹکٹ کے حساب سے ٹکٹیں خریدیں۔ ایک کے پیچھے دوسری ٹرین آرہی تھی اور ہمیں سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس میں بیٹھیں۔ آخر ایک میں کم رش دیکھ کر گھس گئے۔ سامان رکھ کر پہلے سے بیٹھے مسافروں سے پوچھا کہ کیا یہ ٹرین روٹر ڈیم جائے گی تو کسی نے ہاں میں اور کسی نے ناں میں جواب دیا۔ ایک شخص جسے اچھی انگریزی آرہی تھی ہمیں سمجھایا کہ یہ ٹرین روٹر ڈیم جاتی ہے لیکن اب چونکہ راستے میں ایک سرنگ کی مرمت ہو رہی ہے اس لئے یہ صرف ہیگ (Hague) شہر تک جائے گی۔

سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ گھنٹہ بھر پہلے ہم ہوائی جہاز سے جو خوش خوش اترے تھے اور ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اب پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے کہ کیا کیا جائے۔ ابھی گاڑی کھڑی تھی اتر بھی سکتے تھے۔ معمولی سی غلطی کی وجہ سے ایک شہر سے دوسرے شہر جا نکلیں گے یعنی نوابشاہ سے کراچی کی طرف

چل پڑنے کی بجائے کہیں ملتان سے نہ جا نکلیں اور یہاں ریل کی پٹریاں پڑوسی ملکوں بیلجیم، جرمنی وغیرہ اے سے جا نکلتی ہیں جیسے کوئٹہ سے زاہدان تہران۔ ہم نے نے چے اترنے کا فیصلہ کیا لیکن اسی وقت میری نظر ہمارے ڈبے میں بیٹھے ایک ہم جے سے یعنی برصغیر سے تعلق رکھنے والے شخص پر پڑی۔ وہ شکل سے بڑا شریف لگ رہا تھا (یعنی ایسا نہیں تھا جیسے آج کل لندن کے ہیتھرو ائیرپورٹ پر ہمارے ہم وطن ملتے ہیں جو ہمدردی جتانے کے نام پر جیب کاٹ لے تے ہیں۔) اس نے ہمارا مسئلہ سن کر ہمیں اترنے سے روکا۔ "آپ فکر نہ کریں آپ صحیح ٹرین مین ہیں۔ ہیگ سے آپ کو فوراً ہی دوسری ٹرین مل جائے گی۔" اس نے انگریزی میں بتایا۔

"آپ کہاں تک جائیں گے؟" میں نے اب اسے سے اردو میں پوچھا۔

"میں ہیگ سے ایک اسٹیشن آگے لیڈن (Leiden) اتروں گا آپ چاہیں تو روٹرڈیم کے لئے دوسری ٹرین وہاں سے بھی لے سکتے ہیں۔ اس نے اردو اور ہندی مکس زبان میں جواب دیا مگر اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ تھوڑا سا سکون مل جائے تو اس سے پوچھوں کہ وہ کہاں کا ہے اور کیا کرتا ہے۔

ٹرین کے دروازے بند ہوئے اور ٹرین چل پڑی۔ ہالینڈ کی اس جیسی عجیب ٹرین میں نہیں سمجھتا کہ میں نے کہیں دیکھی ہو گی۔ ٹرین میں داخل ہونے کا دروازہ پلیٹ فارم کے لیول پر تھا۔ اس کے بعد اندر پہنچ کر ایک سیڑھی اوپر جا رہی تھی تو ایک نے چے یعنی ڈبل ڈیکر بس کی طرح تھی ہم سارے جہازراں اپنا سامان دروازے کے پاس رکھ کر وہیں کھڑے ہو گئے کیونکہ دو تین اسٹیشنوں کے بعد ہمیں ٹرین تبدیل کرنی تھی۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟" جب ٹرین چلی تو اس شخص نے جو شکل سے بھارتی یا پاکستانی لگ رہا تھا مجھ سے پوچھا۔

"اس وقت سوئیڈن کی جنوبی بندرگاہ مالمو سے آ رہے ہیں وے سے میرا تعلق پاکستان سے ہے۔" اس کے سوال کا جواب دے تے وقت میں اسے غور سے دیکھتا رہا۔ وہ جسامت اور رنگ سے بنگالی یا تامل لگ رہا تھا لیکن تامل اس لہجے میں ہرگز نہیں بولتے۔

"آپ کا تعلق بنگلہ دیش سے ہے؟" اب میں نے اس سے پوچھا۔

"جی نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے آپ کلکتہ کے بنگالی ہیں؟" میں نے ایک دم تصحیح کی۔

"نہیں میں تو ہالینڈ کا رہنے والا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"وے سے آپ آئے کہاں سے ہیں؟" میں نے پوچھا۔ میں اس حقیقت سے بھی آگاہ تھا کہ ہمارے ملکوں کے کئی لوگ جو یورپ میں رہتے ہیں اپنا اصلی ملک بتاتے ہوئے بڑی ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں۔ اگر رنگ سے مار نہ کھائیں تو وہ اپنا ایشیائی ملک کبھی نہ بتائیں۔ اس نے بھی جب اپنا ایشیائی ملک پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، برما یا سری لنکا نہیں بتایا

تو میں نے اسے نارمل سمجھا۔ لیکن اس کی دو باتوں نے مجھے بڑی حیرت میں ڈال دیا ایک اس کے بات کرنے کے اسٹائل اور دوسرا اس کی شخصیت نے۔ وہ بہت منکسر المزاج لگ رہا تھا اور اس میں کوئی بناوٹ یا رعونت نہیں تھی۔

مے رے دوبارہ پوچھنے پر کہ وہ یا اس کے والدین ہالینڈ میں آنے سے پہلے کس ملک کے باشندے تھے تو اس نے جواب میں سری لنکا یا جنوبی بھارت بتانے کی بجائی جنوبی امریکہ بتایا۔

ے ہ تو میرے لئے مزید استعجاب کی بات تھی۔

جنوبی امریکہ کی بجائے جنوبی افریقہ بھی کہتا تو اتنی حیرت نہیں ہوتی کیونکہ جنوبی افریقہ کے کئی شہروں میں ہمارے برصغیر کے مسلمان ہندو، عیسائی، گجراتی، گورکھے، بوہری خوجے وغیرہ ایک ڈیڑھ صدی سے بھی پہلے سے رہتے چلے آرہے ہیں۔ کرم چند گاندھی بھی تو جنوبی افریقہ میں پلے بڑھے، وہیں تعلیم حاصل کی اور وکیل بنے اس کے بعد آزادی کی تحریک چلانے کے لئے بھارت آیا میں نے اپنی تسلی کے لئے دوبارہ پوچھا تو اس نے وہی جواب دہرا دیا۔

"شکل میں ہمارے جیسا برصغیر کا رہنے والا لگ رہا ہے۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ "اردو، ہندی، بنگالی اور کچھ سنسکرت الفاظ کے ساتھ عجیب لہجے میں بولتا ہے۔ ڈچ زبان سے بھی واقف ہے تو انگریزی بھی اچھی جانتا ہے لیکن رہنے والا جنوبی امریکہ کا ہے۔ اس حساب سے اسے انگریزی نہیں ہسپانوی آنی چاہیے کیونکہ جنوبی امریکہ اور وسطی امریکہ کے سارے ملکوں برازیل، کولمبیا، ارجنٹائن سے لے کر میکسیکو، پانامہ اور کاسٹاریکا تک کے لوگ ہسپانوی زبان بولتے ہیں لیکن ے ہ کون ہو سکتا ہے!"

"آپ کو ہسپانوی زبان تو ضرور آتی ہو گی؟" میں نے بالآخر اس سے پوچھنا بہتر سمجھا۔

"نہیں، وہ تو نہیں آتی۔" اس نے بڑے آرام سے بتایا اور میں مزید حیرت میں پڑ گیا۔

"جنوبی امریکہ کے تو ہر ملک میں ہسپانوی زبان بولی جاتی ہے۔" میں نے اس سے کہا۔

"جی ہاں لیکن میں سری نام (Suriname) کا ہوں جہاں ڈچ اور انگریزی چلتی ہے۔"

"بالکل درست کہا۔" مجھے ایک دم یاد آیا۔ سری نام ایک چھوٹا سا ملک ہے جو برازیل اور وینزویلا کے قریب فرنچ گایانا اور گایانا (Guyana) کے درمیان میں واقع ہے۔ وی سی آر اور سیٹلائٹ چینل ایجاد ہونے سے پہلے ہم جہاز رانوں کے لئے دنیا بھر کے ریڈیو اسٹیشن ہی تفریح کا سامان تھے۔ بیچ سمندر میں تو صرف گراموفون ریکارڈ ہی سن سکتے تھے بعد میں 1970ء کے بعد آڈیو کیسٹ مشہور ہوئے لیکن ان کو بھی بار بار سن کر بور ہو جاتے تھے۔ جہاز والوں کو ہر وقت کنارے کے قریب آنے کا انتظار رہتا تھا، تاکہ جہاز کا ریڈیو اس ملک کے ریڈیو اسٹیشن پکڑ سکے۔ امریکہ جاتے ہوئے کیپ آف گڈ ہوپ کے پاس جنوبی افریقہ کے ریڈیو اسٹیشنوں سے انگریزی گانے سنتے تھے اس کے بعد بحر اوقیانوس پار کرتے وقت خاموشی رہتی تھی چھ سات دن کے بعد جیسے ہی جہاز جنوبی امریکہ کے کنارے کے قریب

پہنچتا تھا تو ہسپانوی گانے شروع ہو جاتے تھے اور پھر ایک آدھے دن کے بعد جے سے ہی سری نام کے قریب سے گزرنا شروع ہوتا تھا تو ہسپانوی گانوں کی بجائے انگریزی اور ہندی گانے شروع ہو جاتے تھے۔ اس لئے ہم لوگوں کو سری نام کا ہمیشہ انتظار رہتا تھا۔

"آپ نے سری نام دیکھا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"دیکھا نہیں ہے اس کے کنارے کے قریب سے کئی مرتبہ گزرے ضرور ہیں۔ آپ کے ملک کی جغرافیائی پوزیشن ایسی ہے کہ امریکہ یا کینیڈا جانے والے ہر جہاز کا وہاں سے گذر ہوتا ہے۔"

"سری نام میں آپ کا آنا کب ہوا؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ے ہ مجھے نہیں معلوم ہے کیونکہ مے رے والد سری نام میں پیدا ہوئے۔ میرا دادا یا شاید پر داداڈچوں یا انگریزوں کے ساتھ سری نام پہنچے تھے۔ میں 25 سال کا ہوا تو اعلیٰ تعلیم کے لئے یہاں ہالینڈ چلا آیا اس کے بعد یہیں پر رہائش اختیار کرلی۔ اس کو بھی تقریباً تیس سال ہو گئے ہیں۔ مے رے بچے اور ماں باپ بھی یہیں رہتے ہیں۔ میری ماں آج کل سخت بیمار ہے اور لیڈن کی اسپتال میں زیر علاج ہے۔ میں اس سے ملنے لیڈن جارہا ہوں۔"

"ہم لوگوں نے ایک دوسرے سے نام تو پوچھا نہیں۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"میرا نام کنہیا سنگھ ہے اور میں یہاں کے ٹیلیفون ڈپارٹمنٹ میں ملازم ہوں۔"

دو اسٹیشنوں کے بعد لیڈن آگیا جہاں سنگھ کو اترنا تھا۔ ہم بھی اس کے ساتھ ہی اترے۔ وہ ہمیں اس پلیٹ فارم پر لے آیا جہاں روٹر ڈیم جانے کے لئے ریل گاڑی تیار کھڑی تھی۔ ٹرین چلنے تک کنہیا سنگھ وہیں کھڑا رہا۔ ٹرین چلنے پر اس نے ہاتھ ہلا کر ہم کو الوداع کہا۔

سری نام- جنوبی امریکہ کا بھارت

جنوبی امریکہ کے نقشے پر نظر ڈالیں گے تو بالائی حصے میں دائیں طرف دو بڑے ممالک برازیل اور وینزویلا کے قریب تین چھوٹے ملک بھی نظر آئیں گے۔ ان تینوں ملکوں کا کافی عرصے تک ایک ہی نام "گایانا" تھا ایک پر فرانسیسیوں کی حکومت تھی اور آج تک فرنچ گیانا کہلاتا ہے دوسرے پر انگریزوں کی حکومت تھی اور انگلش گیانا یا صرف گیانا کہلاتا ہے اور تیسرا جو ان کے درمیان میں ہے ڈچ گیانا کہلاتا تھا لیکن گزشتہ نصف صدی سے یہ ملک سری نام (Suriname) کے نام سے مشہور ہے۔ اس پر کافی عرصہ ڈچوں کی حکومت رہی۔

سری نام کی سرزمین ہسپانوی جہازراں کرسٹوفر کولمبس کو پہلی مرتبہ سنہ 1478ء میں نظر آئی اس کے بعد دوسرے اور تیسرے سال بھی اسپین سے کئی جہازراں یہاں پہنچے۔ اس وقت یہاں پر ریڈ انڈین رہتے تھے۔ سترہویں صدی کی نصف تک ہسپانوی، ڈچ، انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اس زمین پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن مقامی لوگ (ریڈ انڈین) ان کے حملے پسپا کرتے رہے۔ آخر کار 1651ء میں ایک انگریز زمینداروں کا ٹولہ اپنے حبشی غلاموں کے ہمراہ یہاں رہنے میں کامیاب ہو گیا۔ جس کے بعد 1667ء میں ڈچوں نے ان پر حملہ کر کے اپنا قبضہ جما لیا۔ ان دنوں نیویارک اور برازیل پر بھی ڈچوں کا قبضہ تھا اور نیویارک ایک ملک کی حیثیت رکھتا تھا جس کا نام ڈچوں نے نیو ایمسٹرڈیم رکھا ہوا تھا۔ بعد میں یہ دونوں ملک برازیل اور نیو ایمسٹرڈیم (آج کا نیویارک) ڈچوں کے ہاتھ سے نکل گئے اور وہاں پر

رہنے والے ڈچ زمیندار، جاگیر دار اور کاشتکار سری نام آ گئے جو ان دونوں میں ڈچ گیانا کہلاتا تھا۔ انہوں نے سری نام کی سر زمین کو زراعت کے لئے استعمال کیا۔ یہاں کی اہم فصل گنا ہوتا تھا جس سے وہ چینی تیار کر کے یورپ بھیجتے تھے۔ اس کے بعد اٹھارویں صدی کے آغاز سے کافی اور کوکا (Cacoa) جو چاکلیٹ بنانے میں کام آتا ہے کی کاشت شروع کی گئی اور بعد میں کپاس، نیل (Indigo) اور دوسری چیزوں کی کاشت شروع کی گئی۔ انیسویں صدی کے نصف تک سری نام زرعی ملک بن گیا تھا یا پھر جنگلات میں گھرا ہوا تھا۔ چند یورپی گورے جو ڈچ تھے بندرگاہ کے قریبی علاقے میں رہتے تھے لیکن اکثریت حبشی غلاموں کی تھی۔ ان حبشیوں سے درختوں کی کٹائی اور کھیتی باڑی جے سے مشکل کام کرائے جاتے تھے۔ ابتدائی دنوں میں جنگلات کی کٹائی اور کاشتکاری جے سے کام بڑے کٹھن ہوتے تھے کیونکہ ہر وقت خونخوار جانوروں اور زہریلے کیڑے مکوڑوں کے کاٹنے کا خوف رہتا تھا۔ ان کاموں کے لئے یہ حبشی غلام افریقہ کے مغربی کنارے کے ممالک سینیگال، گیمبیا، اینگولا، گنی اور کانگو سے منگوائے جاتے تھے۔

1853ء سے کاشتکاری کے لئے چین سے مزدور بلائے گئے۔ انڈونیشیا پر ڈچوں کا قبضہ مکمل ہو چکا تھا اور ان کے جہاز اس طرف آتے جاتے رہتے تھے۔ ان دنوں چین میں بہت غربت تھی اور چینی لوگوں سے جہاز بھر بھر کر ملایا (ملائیشیا) اور انڈونیشیا آتے تھے یہ لوگ پانچ پانچ سال کے معاہدے پر آتے تھے۔ اپنا پانچ سال کا ایک ٹھیکہ مکمل کر کے دوسرا شروع کرتے تھے یا کمائے ہوئے پیسوں سے وہیں پر چھوٹا سا کاروبار شروع کرتے تھے۔ کچھ لوگوں نے پرچون کی دکانیں کھولیں، کچھ لوگ سائیکلوں پر کپڑا اور دوسری ضروریات زندگی کا سامان رکھ کر گھنے جنگلوں اور دیہاتوں میں بیچنے جاتے تھے جہاں حبشی غلام اور چینی مزدور کام کرتے تھے۔

1863ء میں سری نام میں غلاموں کی خرید و فروخت پر پابندی لگا دی گئی اور موجودہ غلاموں کو حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا تاکہ وہ مفت کام کرنے کے بجائے اجرت پر کام کر سکیں اور کمائی گئی رقم کو اپنی مرضی کے مطابق خرچ کر سکیں۔

غلامی پر پابندی لگنے کے بعد تنخواہ اور ٹھے کے پر کام کرنے کے لئے 1873ء سے 1916ء تک بھارت سے مزدور آتے رہے اور اس کے بعد 1890ء سے 1940ء تک جاوا (انڈونیشیا) سے لوگ آتے رہے۔ اردو اور ہندی بولنے والے جو لوگ سری نام میں رہتے ہیں اور یہاں ہالینڈ میں بھی نظر آتے ہیں نوے فیصد اس دور میں آنے والے بھارتی افراد کی اولاد ہیں۔

بیسویں صدی کے اوائل میں سری نام میں ہونے والی کاشت سے ملنے والی انکم کم ہو گئی۔ انہیں دنوں میں باکسائٹ دھات مل گئی جس سے ڈچوں نے بڑا پیسہ کمایا دوسری جنگ عظیم کے بعد جگہ جگہ آزادی کی باتیں ہونے لگیں اور سری نام کے لوگوں میں بھی سیاسی شعور پیدا ہونے لگا۔ 1948ء میں ڈچ حکومت کی جانب سے سری نام میں مذہب،

زبان اور قوم کی بنیاد پر سیاسی پارٹیاں بنائی گئیں۔ گوری چمڑی والے ڈچوں اور دوسرے یورپی افراد نے (جو مقامی لوگوں کو خود مختاری یا آزادی دینے کے حق میں نہیں تھے) "سری نام نیشنل پارٹی" بنائی۔ بھارتی اور انڈونیشی لوگوں نے مل کر پہلے ایک مشترکہ پارٹی بنائی لیکن بعد میں بھارتی لوگوں نے اپنی الگ پارٹی "یونائیٹڈ ہندو پارٹی" بنائی جو بعد میں "ہندو پروگریسو ریفارم پارٹی" کہلانے لگی 1954 میں ہالینڈ نے ان کو داخلی آزادی دی۔ 1958ء میں مختلف پارٹیوں نے مل کر مخلوط حکومت بنائی جس میں یونائیٹڈ ہندو پارٹی بھی شامل تھی جس کے چیئرمین جگر ناتھ لچھمن تھے۔ یہ حکومت 1967ء تک چلی اس کے بعد سیاسی پارٹیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس طرح ایک دوسرے سے سیاسی مخالفتیں بھی بڑھتی گئیں اور ملکی معیشت جوں جوں گرتی گئی۔ 1983ء میں ملک کا سیاسی نظام فوج نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کے بعد تو ملک کی آمدنی کم اور اخراجات بڑھتے گئے جن میں دفاعی اخراجات قابل ذکر ہیں۔ کمائی کے ذرائع دن بہ دن کم ہوتے گئے اور ملک کنگال ہو گیا۔ 1987ء میں فوج نے آخر کار لولے لنگڑے انتخابات کروا کر ملک کی باگ دوڑ سیاستدانوں کے حوالے کر دی۔ یونائیٹڈ ہندو پارٹی جو اب پروگریسو ریفارم پارٹی کے نام سے ابھرنے لگی تھی کے چیئرمین کو ملک کا صدر اور سری نام نیشنل پارٹی کے رہنما نائب صدر بنے۔

سری نام رقبے کے لحاظ سے 63 ہزار مربع میل پر محیط ہے۔ اس کے شمال میں بحر اوقیانوس ہے مشرق میں فرانسیسی گیانا، جنوب میں برازیل اور مغرب میں انگلش گیانا (جو اب صرف گیانا کہلاتا ہے)۔ سری نام کا دارالحکومت پارامار یبو (Paramaribo) ہے۔ سری نام کو 25 نومبر 1975ء کو ڈچ حکومت سے آزادی ملی۔ سری نام میں ایک تہائی آبادی بھارتیوں جبکہ باقی دو حصوں میں یورپی، افریقی، اور انڈونیشی اور مقامی ریڈ انڈین ہیں۔ کچھ چینی اور لبنانی عرب بھی ہیں۔ سری نام کی سرکاری زبان ڈچ ہے لیکن انگریزی، ہندی، اردو، ملائی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں اور اس کی کل آبادی 5 لاکھ ہے۔

نوکری نہ ملنے کے اسباب

اس رات ہماری ٹرین ہیگ ریلوے اسٹیشن پر کچھ دیر رکنے کے بعد دو تین اور اسٹیشنوں سے ہوتی ہوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد روٹرڈیم کے مرکزی اسٹیشن پر پہنچی۔ ہماری رہائش کا بندوبست روٹرڈیم کے سیمینز ہوٹل میں تھا جسے ڈچ زبان میں Zeemans-Huis کہتے ہیں۔ اے سے ہوٹلوں میں حاضر سروس، سابق جہاز رانوں اور ان کے اہل خانہ کے لئے رہائش بہت سستی ہوتی ہے۔ اے سے ہوٹل یورپ اور امریکہ کی کئی بندرگاہوں کے علاوہ ہانگ کانگ، سنگاپور اور جاپان کی بندرگاہوں میں بھی ہیں جہاں بحری جہاز سے اترنے والے لوگ چھٹی پر اپنے ملک جانے سے پہلے یا جہاز کے آنے کا انتظار کرنے کے لئے اے سے ہوٹلوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ روٹرڈیم کے رے لوے اسٹیشن سے اس ہوٹل تک ہم ٹیکسی کے ذرے ع پہنچے۔

ہوٹل کے باہر اور اندر استقبالیہ کے پاس کئی ایشیائی، افریقی اور یورپی جہازران افسر اور خلاصی ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ سب سے زیادہ فلپائن اور انڈونیشیا کے جہازراں تھے۔ انڈونیشیا کے لوگوں کے لئے تو روٹرڈیم اور ایمسٹرڈیم اے سے ہیں جے سے ہم پاکستانیوں کے لئے لندن اور بریڈفورڈ۔ ویسے ملہ ئی یا انڈونیشی باہر ولایت میں رہنے یا ملازمت کرنے میں کافی سست ہیں لیکن یورپ کے اس ملک ہالینڈ میں انڈونیشیا والے ضرور نظر آئیں گے کیوں کہ یہ

ملک ان کے لئے اپنے آبائی علاقے کے مانند ہے۔ سماترا میں سیاسی شور ہو، جاوا میں مذہبی اضطراب اور مارماراء آچیح اور ایریاں جایا میں آزادی کا ہلچل ہو یا بورنیو میں نسلی فسادات یہ لوگ انصاف، سلامتی اور خوشحالی کے حصول کے لئے ہالینڈ کا رخ اختیار کرتے ہیں جے سے الجیریا، تیونس اور مراکش کے لوگ فرانس جاتے ہیں یا لیبیا اور صومالیہ کے لوگ اٹلی کی طرف بھاگتے ہیں یا جے سے ہمارے سیاسی لوگ سکندر مرزا اور مجیب الرحمان سے لے کر بے نظیر اور الطاف حسین وغیرہ انگلینڈ میں سکونت اختیار کرنے میں زیادہ اپنائیت اور سلامتی محسوس کرتے ہیں۔ انڈونیشیا ایشیا میں ڈچ لوگوں کی سب سے بڑی کالونی ہے جو طویل عرصے تک رہی یہاں تک کہ انڈونیشیا کے لوگ اسکول اور کالجوں میں آج بھی ڈچ زبان پڑھتے ہیں جے سے ہمارے ملک میں دوسری زبان انگریزی ہے۔ جے سے پاکستان، بھارت، ملائیشیا، کینیا اور نائیجیریا کے لوگ اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ، امریکہ اور آسٹریلیا وغیرہ جاتے ہیں اسی طرح انڈونیشا کے لوگ ہالینڈ جاتے ہیں۔ ہالینڈ میں متعدد جہاز ران کمپنیاں اور جہاز ساز کارخانے ہیں جہاں دنیا بھر کے لوگ کام کرتے ہیں جن میں انڈونیشیا کے لوگوں کو زیادہ مواقع فراہم کئے جاتے ہیں۔

آج کل فلپائن کے لوگ بھی ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ دنیا بھر کے امیر گھروں، ہوٹلوں اور کارخانوں سے لے کر جہازوں پر کام کرنے کے لئے فلپائنی زیادہ کامیاب رہے ہیں۔ یہ لوگ کم تنخواہ پر بھی بغیر روئے دھوئے اور چھٹیاں کرنے کے بجائے کئی کئی گھنٹے کام کرتے اور خوش رہتے ہیں۔ بات بات پر جھگڑا نہیں کرتے اور بہت فرماں بردار ثابت ہوئے ہیں۔ ان خوبیوں کی وجہ سے ان کو ہر جگہ سعودی اور کویت سے لے کر سوئیڈن اور کینیڈا تک ہر قسم کی ملازمت اور مزدوری مل جاتی ہے۔ چھوٹے بچے کی دیکھ بھال، کھیتی باڑی اور کارخانے سے لے کر اسپتال اور جہاز رانی کے کاموں کے لئے جہاں پہلے چینی، بنگالی، پاکستانی یا افریقی تھے آج ہر جگہ فلپائنی ہی نظر آتے ہیں۔ سعودی عرب کی بندرگاہ دمام میں ایک سعودی ٹھیکیدار سے میں نے پوچھا۔

"آپ پاکستانی فورمین اور مزدور کیوں نہیں رکھتے؟"

"وہ ہر وقت کام سے غیر حاضر رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معمولی معمولی بات پر چھٹی مانگتے ہیں، کسی بھتیجے کی شادی ہو یا کسی بھانجے کا رسم ختنہ یا عقیقہ، سارے کام چھوڑ کر اپنے وطن بھاگتے ہیں۔" اس نے اسباب بتاتے ہوئے کہا۔

"پاکستانی خلاصیوں کو اپنے جہازوں پر نوکری کیوں نہیں دیتے؟" ایک دفعہ میں نے یونانی جہازوں کے مالک سے پوچھا۔

"کسی زمانے میں ہم پاکستان کے بہت سارے لوگ اپنے جہازوں پر ملازم رکھتے تھے خصوصاً پٹھان۔ اس کے بعد چینی آئے۔ آج کل جہاز رانی کی صنعت میں سب سے زیادہ فلپائنی خلاصی پسند کئے جاتے ہیں۔ پاکستانی چھوٹی چھوٹی بات پر

لڑنے جھگڑنے پر اتر آتے ہیں جس سے ہمارے لئے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسمگلنگ کرتے ہیں اور یورپ اور امریکہ کی بندرگاہوں میں جہاز چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔" اس نے بتایا۔

میں اپنے چاروں طرف فلپائنی اور دوسرے ممالک کے خلاصیوں کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ کاش! ان میں ہمارے ملک کے لوگ بھی ہوتے۔ چند لوگوں کی غلط کاریوں کی وجہ سے پوری قوم اور ملک بدنام ہو جاتا ہے۔ ہانگ کانگ میں رجسٹرڈ ایک جہاز ران کمپنی کے پاکستانی مالک ہے جب ان کے جہازوں پر پاکستانیوں کو ملازمت نہ دے نے کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا:

"جہاز پر پاکستانیوں کی موجودگی کی وجہ سے اس جہاز کو ہر بندرگاہ پر شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ان ممالک کی امیگریشن اور کسٹم سختی سے کام لیتی ہے اور جہاز کی روانگی میں تاخیر سے جہاز کے مالک کو نقصان ہوتا ہے۔"

بہر حال یہ ایسی باتیں ہیں جو کسی بھی صورت میں خوشی کا باعث نہیں ہیں۔ ہمارے ملک کے لوگوں کی اکثریت محنت کش اور اہل ثابت ہوئی ہے لیکن چند کالی بھیڑوں کی وجہ سے سب لوگوں کو مذکورہ بالا مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

جہازوں پر کے سے نظر رکھی جاتی ہے

ہالینڈ کی بندرگاہ روٹرڈیم میں ہمارے آنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہم دنیا کی مختلف کلاسیفکیشن سوسائٹیوں (Classification Societies) کا کام دے کھ سکیں۔

جہازوں کی دنیا میں کلاسیفکیشن سوسائٹی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ہر کلاسیفکیشن سوسائٹی کے پاس اپنے قابل میرین انجینئر، نیول آرکیٹیکٹ، قانونی مشیر، سروئیر اور اکنامسٹ ہوتے ہیں جو جہازوں کے بننے سے لے کر ختم (Scrap)

ہونے تک ان پر نظر رکھتے ہیں اور ان کے مالکان کو وقت بوقت ان کی ضروری مرمت کے سلسلے میں آگاہ کرتے ہیں۔ حادثے کے وقت انشورنس کمپنی سے نقصان کلیم کرنے کے لئے جہازوں کے مالکوں کے لئے ضروری ہے کہ کلاسیفکیشن سوسائٹی کے دیے گئے ہر مشورے پر عمل کرتے رہیں بلکہ جہاز کی انشورنس کرنے سے قبل انشورنس کمپنی بھی کلاسیفکیشن سوسائٹی سے مشورہ کرتی ہے جسے جہاز اور جہاز رانوں کا تفصیلی علم ہوتا ہے۔ یہ کلاسیفکیشن سوسائٹی ہی ہے جو جہاز کے کلاس کا تعین کرتی ہے کہ جہاز کتنا مضبوط بنا ہوا ہے اور اس کلاس کے مطابق انشورنس کمپنی جہاز کی انشورنس کرتی ہے اور پریمیم کا فیصلہ کرتی ہے۔

دنیا میں اس وقت تقریباً 30 کلاسیفکیشن سوسائٹیاں ہیں ان میں سے گیارہ بڑی اور اہم ہیں جے سے کہ انگلینڈ کی لندن لائڈ (London Lloyd) فرانس کی بیرو ویریتاس (B,V) جاپان کی نیپان کائجی کیو کی (NKK) وغیرہ۔ ان گیارہ سوسائٹیوں کی اپنی ایک ایسوسی ایشن ہے جس کا نام انٹرنیشنل ایسوسی ایشن آف کلاسیفکیشن سوسائٹیز (IACS) ہے۔ پاکستان کے زیادہ تر بحری جہاز لنڈن لائڈ کے تحت چلتے ہیں۔ ہر سوسائٹی کے اپنے قوانین ہیں جو جہاز کی سلامتی کو مد نظر رکھ کر بنائے گئے ہیں مثال کے طور پر ایک جہاز اگر اتنا طویل ہے تو اس کی لوہے کی مختلف چادروں (Plates) کی کم از کم موٹائی کتنی ہونی چاہیے۔ جہاز کا مالک اگر چاہے تو اس سے زیادہ موٹی پلیٹوں سے جہاز بنوا سکتا ہے لیکن اس سے پتلی پلیٹیں استعمال کرنے سے وہ جہاز سوسائٹی کے لئے قابل قبول نہیں ہوگا اور ایسی صورت میں اس جہاز کی انشورنس کرانے میں جہاز کے مالکان کو مشکل پیش آئے گی۔ ایک کار چاہے نئی ہو یا پرانی آسانی سے انشورنس کرائی جاسکتی ہے مگر جہاز کے انشورنس کے وقت انشورنس کمپنی کلاسیفکیشن سوسائٹی سے مشورہ کرتی ہے کہ وہ جہاز اس سوسائٹی کے قوانین کے مطابق بہتر حالت میں ہے یا نہیں۔ اس میں موجوہ ساری مشینیں معیاری اور صحیح طرح کام کرتی ہیں یا نہیں۔ اگر چہ جہاز پرانا ہے اور اس میں کوئی چیز خراب ہے تو اس کے مالک کو اس کی انشورنس میں دشواری پیش آئے گی۔ کبھی کبھی تو سوسائٹی بھی غیر معیاری ہونے کیوجہ سے نئے بحری جہازوں کو بھی پاس نہیں کرتی جس کے لئے جہاز کے مالک کو جہاز میں کئی تبدیلیاں لاکر سوسائٹی کو مطمئن کرنا پڑتا ہے اس کے بعد پانچ سال کے لئے جہاز کی انشورنس کی جاتی ہے۔ لیکن ان پورے پانچ برسوں میں سوسائٹی جہاز پر نظر رکھتی ہے اور ہر چھوٹی بڑی خرابی یا نقص ہونے پر سوسائٹی کے مشورے کے مطابق اسے دور کیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو جہاز رانوں کے مفاد میں ہے اور جہاز کا مالک خرچہ کرکے جہاز کو ٹھیک ٹھاک حالت میں رکھتا ہے ورنہ اس کی تو یہی کوشش ہوتی ہے کہ جہاز راں جہاز کو ہر حالت میں چلاتے رہیں چاہے وہ جہاز اس قابل ہو یا نہ ہو۔ مالک کو انشورنس حاصل کرنے سے سروکار ہے۔ لیکن کلاسیفکیشن سوسائٹی والے یہ چاہتے ہیں کہ جہاز ہر وقت ان کے معیار کے مطابق رہے اور اس معیار پر رہنے کے بعد اگر حادثہ ہو جائے تو پھر مالک کو جہاز کی رقم دی جائے۔ مثال کے طور پر سمندر کے کھارے

پانی میں چلنے کی وجہ سے جہاز کو زنگ لگ جاتا ہے اور اس کی لوہے کی پلیٹیں گلنے لگتی ہیں اور وقت کے ساتھ پتلی اور کمزور ہو جاتی ہیں۔ جہاز کو صحیح رکھنے کے لئے زیادہ زنگ آلود چادریں تبدیل کرنی چاہئیں لیکن جہاز کے مالک کی ہر وقت یہ کوشش رہتی ہے کہ جہاز کو ایسے ہی چلنے دیا جائے کیونکہ اے سے کاموں میں لاکھوں روپے کا خرچہ آتا ہے۔ لیکن انشورنس کمپنی والے بھی چالاک ہوتے ہیں انہوں نے کلاسیفکیشن سوسائٹی والوں کو اس کام پر لگایا ہوتا ہے جن کے قابل انجینئر اور آرکیٹیکٹ ہر بندرگاہ میں موجود ہوتے ہیں اور جہاز پر نظر رکھتے ہیں۔ مشکوک حالت میں وہ جہاز کی فولادی چادروں میں جگہ جگہ ڈرل مشین سے سوراخ کر کے ان چادروں کی موٹائی ناپتے رہتے ہیں۔ جب تک ان کی موٹائی معیار کے مطابق ہوتی ہے تو صحیح ہے، کم ہونے پر وہ جہاز کے مالک کو وہ چادریں تبدیل کرنے کے لئے کہتے ہیں۔ مالک کو ان کا مشورہ ہر حالت میں ماننا پڑتا ہے کیونکہ سوسائٹی کی نشاندہی کے باوجود اگر مالک نے وہ نقص دور نہیں کرایا اور جہاز کا اس وجہ سے حادثہ ہو گیا (جہاز ڈوب گیا وغیرہ) تو انشورنس کمپنی جوابدہ نہیں رہتی۔ اس طرح اور بھی کئی سینکڑوں چیزیں ہیں جو سوسائٹی کے مقرر کردہ انجینئر چیک کرتے رہتے ہیں۔ بہت سارے لوگ تو اپنے جہاز کسی نہ کسی سوسائٹی کے مشورہ پر بنواتے ہیں تاکہ بعد میں انشورنس کراتے وقت ان کے لئے مسئلے پیدا نہ ہوں۔

ایک دفعہ مجھے اے سے جہاز کے لئے بھیجا گیا تھا جو ابھی ٹوکیو (جاپان) کے ایک شپ یارڈ میں تیار ہو رہا تھا۔ جہاز پر ہر مشینری فٹ کرنے سے پہلے شپ یارڈ والے چیک کرتے تھے کہ صحیح ہے یا نہیں اس کے بعد کلاسیفکیشن سوسائٹی کے انجینئر کو بلا کر اسے دکھاتے تھے کہ وہ ان کی سوسائٹی کے معیار کے مطابق اس مشین سے مطمئن ہے یا نہیں پھر مجھے چلا کر دکھاتے تھے کیونکہ سمندر میں بہر حال اس سے میرا ہی واسطہ پڑنے والا تھا۔

بہر حال روٹرڈیم میں جو چند ہفتے ہم لوگوں نے گزارے اس میں کلاسیفکیشن سوسائٹی والوں کا کام دیکھتے رہے کہ ان کے انجینئر بندرگاہ مین آنے والے جہازوں کی کیسے جانچ پڑتال کرتے ہیں۔ میرا پورا وقت جاپان کی سوسائٹی "نپان کائجی کیوکی" (NKK) کے ساتھ گذرا۔

یہ کیسی آزادی

روٹر ڈیم کے جس ہوٹل میں میری رہائش تھی وہاں سے میرا دفتر تقریباً ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ دفتر جاتے وقت اگر بارش کے آثار نظر آتے تو ہوٹل کے پاس سے گزرنے والی 5 نمبر ٹرام میں سوار ہو جاتا تھا ورنہ اوور کوٹ پہن کر مفلر لپیٹے پیدل نکل پڑتا تھا۔ ہوٹل سے ساحل سمندر اور وہاں سے ہوتا ہوا Endrachwag روڈ تک آجاتا تھا وہاں سے West Blaak روڈ پار کر کے Muritzweeg روڈ سے آنکلتا جہاں پر 23 نمبر عمارت کی تیسری منزل پر جاپان کی کلاسفیکیشن سوسائٹی NKK (نپان کائجی کیوکی) کا دفتر ہے جہاں مجھے جانا ہوتا تھا۔

صبح کے وقت اندھیرے اور سردی میں ہوٹل سے دفتر تک چہل قدمی کرنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ فضا میں عجیب سی خوشبو اور خاموشی ہوتی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک بہت کم ہوتی تھی۔ فٹ پاتھ بھی خالی ہوتے تھے کوئی ایک دو جوان لڑکے یا لڑکیاں جاگنگ کرتے ہوئے اور بوڑھے لوگ اپنے کتوں کو واک کراتے ہوئے ملتے تھے۔ سوائے ایک دو چھوٹے چھوٹے کافی گھروں کے باقی ساری دکانیں اور دفاتر اس وقت بند رہتی تھیں۔ راستے میں ایک جگہ پر زور بار اور پیسفک نام جیسے تین چار نائٹ کلب اور عریاں رقص والے شراب خانے بھی آتے تھے۔ ان کے باہر شے شے کے فریموں میں تقریباً درجن بھر رقاصاؤں کی مختلف انداز کی نیم عریاں تصاویر چسپاں تھیں تاکہ اندر آنے والوں کو اندازہ ہو سکے کہ وہاں کس مال کا سودا ہو رہا ہے۔ کبھی کبھی دیر سے گھر جانے والی کچھ لڑکیاں ان کلبوں سے نکلتیں اور سڑک پار کرتی نظر آتیں۔ میک اپ میں ٹپ ٹپ ہونے کی بجائے اس وقت ان کے چہرے مرجھائے، بال بکھرے ہوئے اور ہونٹ بغیر سرخی کے ہوتے تھے۔ وہ ساری ساری رات ناچنے اور مہمانوں کی خدمت سرانجام دینے کے بعد اس وقت تھکی تھکی اپنے گھروں کی طرف آرام کرنے کے لئے جا رہی ہوتیں۔ جب ساری دنیا کے لئے دن شروع ہو رہا ہوتا تو یہ اپنی پوری رات کی تھکن مٹانے کے لئے آرام کے لئے اپنے گھروں کو روانہ ہو رہی ہوتیں۔ پہلے دن وہاں سے گزرتے ہوئے ان کلبوں کے باہر لگی ہوئی ان رقاصاؤں کی تصاویر کو ایک ایک کر کے میں نے بھی غور سے دیکھا۔ کچھ نائیجیریا اور گھانا کی افریقی کالی عورتیں تھیں باقی جنوب مشرقی ایشیا کے غریب ملکوں ویتنام، کمبوڈیا، لاؤس اور انڈونیشیا کے جزائر سماٹرا، جاوا، بالی اور مولاکو کی لگ رہی تھیں۔ ایک دو کے چہرے سری لنکا اور جنوبی بھارت کی عورتوں سے بھی مشابہت رکھتے تھے۔

1970ء میں جب میرا یورپ کی طرف پہلی مرتبہ آنا ہوا تو ان دنوں یورپ کی بے ہ بندرگاہیں عریانیت کے باعث خاصی بدنام تھیں، خصوصاً بندرگاہ والے علاقے جہاں ہمارے جہاز آکر لنگر انداز ہوتے تھے۔ لیکن ان میں کام کرنے والی عورتیں ڈچ، جرمن، ڈینش، پولش، اطالوی اور دوسری مقامی یورپ کی ہوا کرتی تھیں۔ وہ جسمانی نمائش کے ساتھ ساتھ سودے بازی بھی کرتی تھیں۔ اب یورپ کی معیشت اس خراب حالت میں نہیں رہی ہے جو دوسری جنگ عظیم کے بعد تقریباً دو ڈھائی عشرے تک رہی۔ یورپی افراد نے لڑنے جھگڑنے بند کر دیئے اور مل بیٹھ کر ایک

دوسرے کی خوشحالی کا سوچنے لگے گو آج بھی یورپ میں تیل اور دھات، اناج اور خام مال ایشیائی اور افریقی ممالک سے آتا ہے لیکن عقل اور ٹیکنالوجی ان کے پاس ہونے کی وجہ سے ہر چیز کا زیادہ سے زیادہ فائدہ یورپ کو حاصل ہوتا ہے۔ ہر ایک جانتا ہے کہ کافی اور چائے برازیل اور سری لنکا سے آتی ہے، تیل اور مچھلی عرب ملکوں سے، کپاس اور گندم پاکستان اور مصر میں اگائی جاتی ہے لیکن ان کے نرخ مقرر کرنے والے اور ان کو خرید کر مہنگا بیچنے والے یہی یورپی ہیں۔ عالمی منڈی میں آج بھی ان یورپیوں کی اجارہ داری ہے۔ دے کھتے ہی دے کھتے یہ لوگ دوسری جنگ عظیم میں ہونے والی تباہی اور بدحالی سے باہر آ گئے اور آہستہ آہستہ خوشحالی آنے لگی۔ جرمنی جیسا ملک جس کے نوٹوں کا یہ حال تھا کہ تھیلا بھر کر دے نے پر بھی مشکل سے ایک ڈبل روٹی ملتی تھی آج اس کا مارک، فرانس کا فرینک، ہالینڈ کا گلڈر، اٹلی کا' پیسیتو، انگلینڈ کا پاؤنڈ (سوائے بدقسمت روبیل ور پولینڈ کے زلوتے کے) یورپ کی کرنسی مضبوط سے مضبوط تر ہو گئی ہے اور دوسری طرف افریقہ اور ایشیا کے خوشحال ملک آزادی حاصل کرنے کے باوجود بھی اپنی خوشحالی برقرار نہیں رکھ سکے ہیں۔ سنگاپور، ملائیشیا، جاپان، کوریا جے سے چند ملکوں کو چھوڑ کر باقی ملکوں کے نام نہاد حکمران "ملک کے بہترین مفاد" کے نام پر ملک کو لوٹتے اور معیشت کا ستیاناس کرتے رہے ہیں۔ دوسری جانب یورپ جو ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کے سہارے چلتا تھا ترقی کر رہا ہے۔ آج یورپ کا غریب بھی خوشحال ہے۔ ہر ایک کے لئے روزگار اور دیگر سہولتیں میسر ہیں۔ جو بے روزگار ہیں ان کو حکومت کی طرف سے ہر مہینے اتنا سوشل مل جاتا ہے جس سے ان کی بنیادی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں۔ مجبوری اور غربت انسان کو چور اور بدکردار بنا دیتی ہے۔ بندرگاہوں والی گلیاں جو یورپی عورتوں کے بازارِ حسن اور مساج گھروں سے بھری رہتی تھیں آج وہاں دکانیں اور دفاتر ہیں جن میں یہاں کے لوگ بھاری تنخواہ پر کام کرتے ہیں۔ ناچ گانے اور فحاشی کے جو چند کلب رہ گئے ہیں ان میں شاید ہی کوئی یورپی عورت اپنا پیٹ پالنے کے لئے اپنے جسم کی نمائش کرتی ہو۔ کسی کو باعزت ملازمت اور دو وقت کی روٹی مل جائے تو وہ کیوں چاہے گا کہ معاشرے میں اس کی بدنامی ہو۔ بھوک اور مفلسی کئی برائیوں کو جنم دیتی ہے۔ تہذیب، آداب و اطوار یہ سب پیٹ سے آنے اور پیٹ بھرنے کے بعد ہی قائم رہ سکتے ہیں۔

خالی پیٹ پر آداب و اطوار، فیشن اور خوبصورتی جیسی چیز کا خیال رکھنا آسان کام نہیں۔ ساحر لدھایونی کی معروف نظم مادام کے دو اشعار پیش خدمت ہیں جن میں انہوں نے رویہ بیان کی جانے والی بات کو بخوبی شعری سانچے میں ڈھالا ہے۔

"نور سرمایہ سے ہے روئے تمدن کی جلا
ہم جہاں ہیں وہاں تہذیب نہیں پل سکتی
مفلسی حس لطافت کو مٹا دیتی ہے

بھوک آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی"

معروف بھارتی مصنف کرشن چندر کا ایک ناول پڑھا تھا جس میں کوئی شخص اپنی جنسی ہوس پوری کرنے کی خاطر کسی غریب لڑکی سے محبت کا ڈھونگ رچا کر اس سے ملنے کے لئے کہتا ہے۔ "آؤ میری جان! جہاں بھی تم چھپی ہوئی ہو آجاؤ، میں کب سے تمہاری محبت کا بھوکا ہوں۔"

جواب میں وہ کہتی ہے: "تم تو صرف محبت کے بھوکے ہو، یہاں ہم سب بھات (چاول) کے بھوکے ہیں۔ اناج دیوتا ہم سے روٹھ چکا ہے۔" تب اس کو معلوم ہوتا ہے کہ بھات (چاول) ایک روپے کا پاؤ ہو جائے تو سمجھو محبت، مامتا، دوستی، رشتے داری، عزت و آبرو سب ختم ہو جاتی ہے۔"

میں نے نائٹ کلبوں کے باہر نیم عریاں رقاصاؤں کی تصاویر ایک دفعہ پھر غور سے دیکھیں ان میں کوئی ایک بھی یورپی عورت نہیں تھی۔ فلپینو، چینی، تھائی، ویتنامی اور افریقی ملکوں کی تھیں۔ "کوئی عورت خوشی سے اپنا کردار داغدار نہیں کرتی"۔ انگلینڈ کے ایک اخبار میں ایک تھائی عورت کا خط چھپا تھا کہ اس کا شوہر اگر اس کے دے کھ بھال کرے، معاشرہ اس کے لئے باعزت روزگار فراہم کرے تو وہ اپنے جسم کا سودا ہرگز نہیں کرے گی۔"

اس طرح زمانے کی ستائی ہوئی عورتوں کی غم کی داستان اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ یورپ اور جاپان جے سے ممالک کی خوشحالی سے فیض حاصل کرنے کے لئے ہمارے غریب ملکوں کے کئی لوگ ملازمت کے حصول کے لئے ان ممالک کا رخ اختیار کرتے ہیں۔ اجازت نہ ملنے پر وہ غیر قانونی طرے قے اختیار کرکے دیار غیر میں پہنچ جاتے ہیں۔ گو پولیس اے سے لوگوں کی تلاش میں ہر وقت چوکنا رہتی ہے لیکن پیٹ پوجا کے لئے کئی غریب اور بے روزگار لوگ ان ممالک میں پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ پھر مقامی کارخانہ دار، دکاندار، ہوٹل والے، مے خانے والے ان غریب بے سہارا لوگوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر ان کو اپنے مقصد کے خاطر غلط دھندوں کے لئے اور کم تنخواہ پر استعمال کرتے ہیں۔

یہاں ہالینڈ میں آنے والے ایک انگریزی اخبار میں فرانس میں رہنے والی ایک تیونس کی عرب عورت کا بیان شائع ہوا تھا۔ "میں اپنے ملک تیونس میں نرس تھی۔ یورپی ممالک میں ملازمت دلانے والی ایک ایجنسی کے جھانسے میں آکر میں نے اپنی نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور ساری جمع پونجی ٹکٹ اور ویزا فیس کی مد میں ایجنٹ کے حوالے کرکے جب فرانس پہنچی تو معلوم ہوا کہ مجھے فرانس کے کسی اسپتال میں بڑی تنخواہ پر کام کرنے کی بجائے شہر کے ایک گندے علاقے کے مے خانے میں آنے والے گاہکوں کو خوش کرنے کے لئے مختلف خدمات سرانجام دینا پڑیں گی۔ میں نے بہت احتجاج کیا لیکن شراب خانے کا مالک کبھی پیار محبت سے تو کبھی ڈانٹ ڈپٹ سے مجھے اس قسم کی ملازمت کے لئے مجبور کرتا رہا۔ بھاگ نکلنے کی کوئی راہ نہیں تھی کیونکہ مجھے اس ملک میں غیر قانونی طرے قے سے لایا گیا تھا اور اس

کے علاوہ میرا پاسپورٹ مے رے حوالے کرنے کی بجائے مالک نے اپنے پاس ضبط کر رکھا تھا۔ پولیس میں جا کر شکایت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ ایسی صورت میں یہاں کی پولیس اپنے ملک کے باشندوں کی بات سنتی ہے اور ان کے ملک میں آئے ہوئے غیر قانونی لوگوں کو مجرم کی حیثیت سے جیل کے حوالے کر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے خالی ہاتھ وطن واپس جانے کا خوف الگ تھا۔ وہاں جو کچھ تھا بیچ کر مقروض ہو کر یہاں پہنچی تھی اس کے باوجود میں نے ایک دو مرتبہ بھاگ نکلنے کی کوشش بھی کی مگر پکڑے جانے پر مجھے بہت مارا پیٹا گیا۔ قابل اعتراض تصویریں لی گئیں اور اس کے بعد مجھے زبردستی نشے کا عادی بنا دیا گیا۔ اب میں اس لت میں ایسی مبتلا ہوئی ہوں کہ دن رات میرا صرف یہی مقصد رہ گیا ہے کہ بس نشہ ملنا چاہیے جس کے لئے چاہے کچھ بھی کرنا پڑے....“

اس قسم کی دکھیاری عورتوں کی کہانیوں سے ملائیشیا، سنگاپور، تھائی لینڈ، فلپائن کے اخبارات سے لے کر یورپ اور امریکہ کے مشہور ٹائم، نیوز ویک، ایشیا ویک جے سے رسالے بھرے ہوئے ہیں۔ ان عریاں تصویروں میں نجانے اس قسم کی کتنی عورتیں، بدنصیب اور مظلوم ہونگی جو اپنا وطن چھوڑ کر ان غیر ممالک میں ظلم و قید کے ماحول میں آ پھنسی ہیں۔ تصویروں میں دکھائی ہوئی ان عورتوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ضرور تھی مگر ان کی آنکھوں سے ان کے غموں کی داستان عیاں تھیں۔ صبح سوے رے جب وہاں سے گزرتے وقت ان تصویروں یا گھروں کو جاتی ہوئی ان جیتی جاگتی عورتوں کو مرجھائے ہوئے چہروں پر میری نظر پڑتی تھی تو مجھے ایسا محسوس ہونے لگتا تھا جے سے آج بھی ہمارے ملک یورپ کی کالونیاں ہیں۔ ہم آزاد ہو کر بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔

ہماری برآمدات

روٹر ڈیم میں جس عمارت میں میرا دفتر تھا اس سے چند بلاک پہلے ایک بڑی عمارت میں ترک قونصل خانہ تھا۔ اس عمارت کے باہر ہر وقت صبح سوے رے تقریباً بیس پچیس ترک مرد خواتین چہل قدمی کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ کچھ مردوں کے سر پر ترکی کی روایتی لال رنگ کی لمبی ٹوپی ہوتی تھی جس کے ایک طرف سے کالے رنگ کے مختلف دھاگوں سے بنایا گیا پھول لٹکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ترک لوگوں کی جسامت اور رنگ یورپی افراد سے کافی ملتا ہے۔ ان کے مرد اور خواتین مغربی لباس ہی پہنتے ہیں اس لئے پہلی نظر میں یہی گمان ہوتا ہے کہ یہ لوگ جرمنی، یونان، رومانیہ، بلغاریہ یا یہاں کے مقامی ڈچ ہیں لیکن ان کے کالے بالوں کی وجہ سے یہ لوگ ایشیائی مانے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ترکی کے اُس خطے کے لوگ بھی جو براعظم یورپ کا حصہ ہے۔

ترک قونصل خانے کے سامنے روزانہ اتنے سارے لوگوں کو جمع دیکھ کر ایک دن ان میں سے ایک ترک نوجوان سے جسے انگریزی آتی تھی میں نے اس کا سبب پوچھا۔

اس نے بتایا کہ ہم لوگ یہاں سے ترکی کا ویزا حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں۔ ہم لوگ نسلاً ترک ہیں۔۔ ہمارے آباءواجداد کسی زمانے میں وہاں سے نقل مکانی کرکے یہاں آبسے تھے اور بعد ازاں یہاں کی شہریت حاصل کرلی اس لئے ہمارے پاس ہالینڈ کا پاسپورٹ ہے۔ اپنے عزیزوں سے ملنے یا کاروبار کے سلسلے میں ترکی جانے کے لئے ہمیں یہاں سے اپنے ڈچ پاسپورٹ پر ویزا لگوانا پڑتا ہے۔

ترک کونسل خانے کے ساتھ "وطن" نام کی ایک دکان تھی جو یہاں کے مقامی ترک کی تھی۔ اس دکان میں زیادہ تر وہ چیزیں تھیں جو مسلمان خصوصاً ترک باشندے پسند کرتے ہیں۔ جے سے یہاں ایک پاکستانی کی دکان پر جانماز،

پاکستانی گیتوں کی کیسٹوں کے علاوہ کھانے پینے کی اشیاء میں مرچ مصالحے، گڑ اچار، چٹنیاں، کھوپرے اور سرسوں کا تیل وغیرہ ملتا تھا۔

ایک دن شام کو دفتر سے جلدی نکلا اور اس ترکوں کی دکان "وطن" میں چلا گیا۔ دکان اندر سے کافی بڑی تھی۔ کھانے پینے کی حلال اشیاء کے علاوہ چادریں، تولئے، تکیے، ترک اسٹائل میں سلی قمیصیں، ٹوپیاں اور کپڑوں کے تھان، مختلف برتن، آرائشی اشیائ، حاجیوں کی ضرورت کا سامان تھا جو زیادہ تر ترکی، مصر اور ایران کا بنا ہوا تھا۔ دکان کے ترک مالک سے علیک سلیک ہوئی تو اس نے بتایا کہ "میں ہر سال مختلف ممالک میں جاکر وہاں کی سستی اور اچھی مصنوعات خرید کر آتا ہوں۔" اس نے مجھ سے پاکستانی کی ٹیکسٹائل اشیاء کے بارے میں پوچھا کہ وہ کیسی ہیں۔

میں نے بتایا کہ پاکستان میں کپاس کی زیادہ پیداوار ہوتی ہے، اس لئے وہاں کپڑا یورپ کے مقابلے میں سستا ہے۔ روٹر ڈیم میں جو بنیان دس گلڈر میں ملتی ہے وہ کراچی میں صرف دو گلڈر (پچاس ساٹھ روپے) میں ملتی ہے۔ میں نے اپنے ملک کی تعریف کی۔

"ہاں یہ بات آپ کی درست ہے لیکن دوست افسوس کی بات ہے کہ پاکستانی کپڑا صفائی سے نہیں بنایا جاتا۔" دکاندار نے جواب دیا۔ اور پھر کونے میں رکھے ہوئے ایک کارٹن میں سے ایک پیک کی ہوئی بیڈ شیٹ نکال کر مجھے دکھائی۔

"دیکھیں یہ نمونہ میں نے لاہور سے منگوایا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قیمت مناسب ہے مگر فنشنگ بہتر نہیں ہے اور جس تھیلی میں پیک کیا ہے وہ بھی بہت ہی سستے قسم کی ہے اور جاذب نظر بھی نہیں ہے۔ پچھلی مرتبہ میں نے تولئے منگوائے تھے وہ بھی اے سے ہی نکلے۔ تھوڑی زیادہ قیمت پریشان نہیں کرتی لیکن فنشنگ اچھی ہونی چاہیے جو خریدنے والے کے لئے باعث کشش ثابت ہو۔"

"تمہاری بات سے میں بالکل متفق ہوں۔" میں نے اس کی تھیوری کو دل سے قبول کرتے ہوئے کہا۔ یہ کوئی ایسی شکایت نہیں تھی جو مے رے لئے نئی ہو۔ باہر کے ملکوں کے لوگوں کو ہمارے ملک کی بنی ہوئی چیزوں اور تاجروں سے اس قسم کی شکایات ہر وقت رہتی ہیں۔ مالمو (سوئیڈن) کے ایرانی دکاندار ہم پاکستانیوں سے حال ہی میں اس قسم کے مسئلے کی نشاندہی کر چکے تھے۔ سوئیڈن کے شہر مالمو میں عراق کے عربوں اور ایران کے لوگوں کی کریانہ کی دکانیں مشہور ہیں جن سے ہم آٹے دال چینی سے لے کر اچار تک لے تے ہیں۔ ایک ایرانی دکاندار بتا رہا تھا "ہم پاکستان سے جو چاول منگواتے تھے بلاشبہ دنیا کے بہترین چاولوں میں سے تھے مگر جن کپڑے کی تھیلیوں میں پیک ہو کر آتے تھے وہ اتنی خراب ہوا کرتی تھیں کہ باوجود کم قیمت کے یہاں کے لوگ ان کو ہاتھ تک نہیں لگاتے تھے۔ یہی حال پاکستان سے آئے ہوئے اچار اور چٹنیوں کا تھا۔ وہ بہت ہی سستی قسم کی بوتلوں اور ڈبوں میں بند ہو کر آنے کی وجہ سے یہاں بیچی نہیں جا سکتیں۔" اس نے بتایا کہ بھارت اس معاملے میں بہت چالاک ہے۔ ہماری غلطیوں سے

فائدہ اٹھا کر اس نے خصوصاً پیکنگ کا بڑا خیال رکھا ہے۔ آج ہمارے ملک کی یہ حالت ہو گئی ہے (جو کسی بھی صورت مین خوشی کا باعث نہیں ہے) کہ بھارت ہمارے ملک سے چاول خرید کر اپنی خوبصورت تھیلیوں میں ایک نئے طرے قے سے پیک کر کے، ان یورپی ممالک میں بھارتی چاول کے نام پر مہنگے داموں فروخت کر رہا ہے۔

جہازوں کا ایک ضروری ٹیسٹ

دو ہفتوں کے لئے مجھے اور مختلف ممالک سے آئے ہوئے میرے جہاز ران ساتھیوں کو، ناروے کے کچھ شہروں میں جا کر وہاں کی میری ٹائم ایڈمنسٹریشن کا کام دیکھنا تھا۔ میری ٹائم ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ بحری جہازوں پر کڑی نگاہ رکھتا ہے کہ وہ جہاز مقرر حد تک محفوظ ہیں کہ نہیں۔

اس سے پہلے ہمارا پورا گروپ ناروے کے دارالحکومت اوسلو جا چکا تھا لیکن اس مرتبہ سب کو ایک ہی گروپ کی صورت میں ایک جگہ جانے کے بجائے ہر ایک کو اکے لے اور مختلف بندر گاہ میں جا کر مقامی دفتر کے لوگوں کے ساتھ کام کرنا تھا۔ ناروے ایک بہت ہی وسیع سمندری علاقہ ہے اور اس میں چھوٹی بڑی کئی بندر گاہ ہیں۔ شمال قطب کے قریب ہونے کی وجہ سے یہاں شدید سردی اور برف باری ہوتی ہے۔ سال کے چند مہینوں یہ ں بعض جنوبی علاقوں میں تھوڑی بہت کھیتی باڑی ہوتی ہے ورنہ جاپانیوں کی طرح یہاں کے لوگوں کا گزر بسر سمندری اشیاء سے ہوتا ہے۔ اس لئے ملک کی وسیع آبادی ساحلی شہروں میں ہی رہتی ہے۔ ہمیں اسٹے وانگر، برگن، ہیگ سنڈ جیسی چھوٹی چھوٹی بندر گاہوں میں جانا تھا۔ مے رے حصے میں ناروے کے شمالی حصے کی الی سنڈ (Alesund) نامی ایک پہاڑی بندر گاہ آئی۔ ہم سارے دوست مالمو (سوئیڈن) سے بذریعہ فیری کوپن ہیگن آئے جہاں سے بین الاقوامی پرواز سے اوسلو

تک اکٹھے پہنچے۔ اوسلو کے ہوائی اڈے سے ہر ایک اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ موسم اچانک خراب ہونے کی وجہ سے مجھے جس پرواز سے آگے جانا تھا اس میں تاخیر تھی۔ تقریباً آٹھ گھنٹے کے انتظار کے بعد ایک چھوٹا سا جہاز ہمیں الی سنڈ لے جانے کے لئے پھڑ پھڑاتا ہوا روانہ ہوا۔ جہاز میں میرے علاوہ تقریباً بیس پچیس مسافر اور تھے جو اسی بندر گاہ مین رہنے والے مقامی لوگ تھے کیونکہ الی سنڈ پہنچنے پر پاسپورٹ کا حامل غیر ملکی میں ہی تھا باقی لوگ صرف اپنا اپنا شناختی کارڈ دکھا کر ہوائی اڈے سے باہر نکل گئے.... کوئی بس میں تو کوئی ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔ امیگریشن اور کسٹم چیکنگ کی مصیبت سے نجات پا کر میں باہر نکلا تو الی سنڈ کے ایئرپورٹ کے باہر میں نے خود کو بالکل تنہا پایا۔ مے رے علاوہ اگر کوئی چیز تھی تو وہ تھی سخت سردی اور جسم کو کاٹنے والی تیز ہوائیں۔ اگست کا مہینہ تھا، سورج کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جے سے دوپہر کے تین یا چار بجے ہوں لیکن گھڑی دے کھنے سے سمجھ گیا کہ دس بجے ہیں یعنی آدھی رات کا سماں ہے۔ لوگ اپنے اپنے بستر پر خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہوں گے تا کہ دوسرے دن آٹھ بجے ڈیوٹی پر جا سکیں۔ یہ الگ بات ہے کہ یہاں سورج دیر سے غروب ہوتا ہے اس لئے چاروں طرف سورج کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں کے لوگ گھڑی کی سوئیوں کے مطابق سوتے جاگتے اور کام کرتے ہیں۔ یہ اگر ہماری طرح دن کی روشنی میں جاگیں اور رات کا اندھیرا چھانے پر سونے لگیں تو انہیں جولائی اگست جے سے مہینوں میں بمشکل ایک دو گھنٹے سونے کو ملیں کیونکہ ان دنوں میں یہاں دن تقریباً بیس بائیس گھنٹے کا ہوتا ہے اور رات صرف دو تین گھنٹوں کی۔ اس وقت سورج کی روشنی کے باوجود رات ہو چکی تھی اور پبلک بس تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد آنے کے بجائے ایک ایک گھنٹے کے بعد آ رہی تھی اور ایئرپورٹ سے تمام ٹیکسیاں بھی روانہ ہو چکی تھیں۔ انہیں کیا معلوم کہ آج اس پرواز سے ان کے گاؤں نما بندر گاہ میں ایک غیر ملکی بھی آیا ہے جسے اپنی جان اور سامان آزاد کرانے میں ایک گھنٹہ لگ جائے گا۔ دوسری بس کے آنے کے لئے باہر سردی میں انتظار کرنے کے بجائے واپس ایئرپورٹ میں داخل ہو گیا۔

ایئرپورٹ کا مختصر عملہ ایک کونے میں جمع ہو کر گرم گرم کافی پی رہا تھا۔ عملے کے تمام ارکان مجھے دے کھتے ہی سمجھ گئے کہ مجھ سے بس چھوٹ گئی ہے لہٰذا انہوں نے مروتاً مجھے بھی ایک کپ کافی پے نے کی دعوت دی۔ کافی انتہائی کڑوی تھی لیکن گرم ہونے کی وجہ سے بڑا مزہ آیا۔ میری رہائش کا پتہ پڑھ کر انہوں نے بتایا کہ یہ ہوٹل اس ایئرپورٹ سے کافی دور بندر گاہ کے قریب ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد بس آئی۔ بندر گاہ شہر کے دوسرے حصے میں تھی۔ شہر کے چاروں طرف سمندر نظر آ رہا تھا بلکہ یہ پورا شہر چند جزیروں پر مشتمل ہے۔ بس ایئرپورٹ والے علاقے سے نکل کر ایک طویل پل پر سے ہوتی ہوئی ایک اور جزے رے پر پہنچی جہاں سے زیر سمندر ایک سرنگ سے گزر کر تے سرے جزے رے پر لے آئی جہاں شہر کی بندر گاہ ہے۔ یہاں میری رہائش رائل ہوٹل میں تھی۔

الی سنڈ میں پہلے دن ہمیں ایک چھوٹے سے جہاز کا Inclination Test لینا تھا جو تقریباً پانچ سال پرانا تھا۔ جہاز کے نئے مالک نے اس میں ایک دو مزید کمرے بنوائے تھے اور بین الاقوامی قوانین کے مطابق تعمیر کے کام کے بعد سمندر میں لے جانے کے لئے اسے میری ٹائم ایڈمنسٹریشن کے انجینئروں سے اس قسم کے ٹیسٹ کروا کر سیفٹی سرٹیفکیٹ لینا ضروری تھا۔ اس سلسلے میں مجھے یہاں کے شپ کنٹرول آفس کے سروے ئر مسٹر ڈرونین کے ساتھ جانا تھا۔ صبح کو ٹھیک 9 بجے پروگرام کے مطابق مسٹر ڈرونین مجھے ہوٹل سے لے نے آئے۔ ہم اس کی 25 سال پرانی فوکس ویگن کار مین بیٹھ کر اس شپ یارڈ کی طرف نکل پڑے جہاں اس جہاز میں تبدیلی لائی گئی تھی۔

پورے الی سنڈ شہر میں صرف ڈرونین کی کار پرانی تھی اور پورے شہر میں یہ واحد فوکس ویگن کار نظر آرہی تھی۔ کار اتنی پرانی اور ڈھانچہ بن چکی تھی کہ سوائے ہارن کے اس کے ہر حصے سے آوازیں نکل رہی تھیں۔ سیٹ بیلٹ کی کنڈی زنگ آلود ہو چکی تھی ہر دفعہ بڑی مشکل سے لاک ہوتی تھی اور اترتے وقت اس میں سے اپنے آپ کو آزاد کرنے کے لئے اس سے کشتی لڑنی پڑتی تھی اور کھلنے پر ڈرونین اور میرے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ آجاتی تھی جے سے کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہو۔ کبھی کبھی کھلنے میں دیر لگتی تو ڈرونین میری ہمت افزائی کے لئے کہتا تھا۔ "پرواہ نہیں کرو، کچھ ہو گیا (یعنی باوجود کوشش کے نہیں کھلا) تو مے رے پاس اس کا آخری علاج بھی ہے۔" اور پھر کار کے ڈیش بورڈ سے ایک زنگ آلودہ قینچی نکال کر مجھے دکھاتا تھا اور میں ہنس کر اسے جواب میں کہتا تھا۔ "سر مجھے اس قینچی پر بھی شک ہے کہ یہ اس بیلٹ کو کاٹ سکے گی یا نہیں۔"

مے رے باس سروئیر مسٹر ڈرونین زندگی کی 65 بہاریں دیکھ چکے تھے۔ ناروے اور وہ بھی شمالی ناروے میں کوئی بہار کیا خاک دے کھ سکتا ہے بس یہ سمجھیں کہ اتنی سخت سردیاں بھگت چکے تھے اور یقیناً ابھی بھی زندہ، صحت مند اور چاق و چوبند تھے۔ حالانکہ وہ ہم سب میں بوڑھے تھے لیکن سندھی کی ایک کہاوت کے مطابق بوڑھا اونٹ دو جوان اونٹوں برابر ہوتا ہے کہ مصداق کام میں وہ ہم سب سے طاقتور اور باہمت تھے۔ تیز ٹھنڈی ہوا، برف باری اور منفی درجہ حرارت میں تقریباً کوئی تین گھنٹے کھلے آسمان کے نے چے بحری جہاز کے عرشے پر کھڑے ہو کر کام کرنا پڑتا تھا۔ حے لے بہانے اس جہاز کا کپتان، چیف انجینئر، دوسرے نوجوان افسر اور میں کیبنوں میں جاتے رہے لیکن مسٹر ڈرونین وہیں کھڑے جہاز کی مختلف پیمائش اور مختلف حصوں پر بھاری وزن رکھنے سے پیدا ہونے والا جہاز کے جھکاؤ (Inclination) کو غور سے دے کھتے رہے۔ حالت یہ تھی کہ جیبوں میں ہاتھ ڈالنے کے باوجود بھی سن لگتے تھے۔ لوہے کی کسی چیز کو ہاتھ لگانے سے ایسا محسوس ہوتا تھا جے سے جلتا ہوا کوئلہ ہو۔ مسٹر ڈرونین کی حالت بھی کوئی اچھی نہیں تھی وہ گورے تو تھے ہی اوپر سے ٹھنڈ کی وجہ سے سرخ بھی ہو گئے تھے جے سے ان کا خون جم گیا ہو۔ قلم پکڑ کر پیمائش لکھنے کے بعد کچھ دیر ان کی انگلیوں کی حالت ایسی رہتی جے سے ابھی تک وہ پینسل پکڑے ہوئے ہوں۔ اس

کے باوجود وہ سارا وقت مسکراتے اور مذاق کرتے رہے حالانکہ ایسی سردی میں مسکرانے کے لئے منہ کو ٹیڑھا کرنا بھی خاصا تکلیف دہ عمل ہوتا ہے۔ انہوں نے کافی بھی کام ختم کرنے کے بعد ہی پی باقی ہم لوگ (جس میں جہاز کا کیپٹن، چیف انجینئر اور اس شپ یارڈ کا کنسلٹنٹ انجینئر بھی شامل تھا) بار بار جہاز کے باورچی خانے سے گرم گرم کافی منگواتے رہے۔ کافی چینی اور دودھ کے بغیر تھی۔ ان ممالک کی کافی انگلینڈ یا پاکستان میں استعمال ہونے والی Instant Coffee سے بہت کڑوی اور ہینگ کی طرح عجیب بو والی ہوتی ہے۔ کم از کم مجھے پینے سے زیادہ گرم مگ کو ہاتھ میں پکڑنے میں مزہ آرہا تھا۔ میں بار بار جہاز کے اسٹیورڈ کو یہی ہدایت دے رہا تھا کہ میرے لئے سب سے بڑا مگ لاؤ اور وہ سخت گرم کافی سے پورا بھرا ہونا چاہیے۔ اور پھر کافی آنے پر پینے سے پہلے اس مگ کو بڑی دیر تک ہم لوگ ہاتھ میں اسے سے پکڑ کر کھڑے رہتے تھے جسے گلاس پکڑتے ہیں تاکہ کافی کے گرم مگ سے نکلنے والی حرارت ہمارے ہاتھ میں جذب ہو جائے۔ بہر حال اس حرارت کا اثر اور مزہ چند منٹ کے لئے ہی ہوتا تھا۔

جہاز کے عرشے پر کچھ دیر کام کرنے کے بعد برف باری بھی شروع ہو گئی جو پہلے کپاس کے ذروں جیسی تھی۔ وقفے وقفے سے اولے بھی پڑنے لگے۔ ہمارے سروں پر رکھے ہوئے ہیلمٹ پر یہ برف کی چھوٹی چھوٹی گولیاں لگ لگ کر عجیب دھنیں پیدا کر رہی تھیں۔ کئی لوگ یہ سوچتے ہونگے کہ برف باری میں چھتری لے کر چلنے کی کیا ضرورت ہے جب برف باری سے کپڑے تو گیلے نہیں ہوتے۔

برف باری جب تک روئی کی طرح ہوتی ہے تب تک کوئی پریشانی کی بات نہیں ہوتی، ہاں البتہ اولے پڑنے کی صورت میں چھتری لازمی طور پر استعمال کرنی پڑتی ہے۔ مسٹر ڈرونین نے بتایا کہ کبھی کبھی اولے اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ لوگ اپنی گاڑیاں چھپانے کے چکر میں لگ جاتے ہیں کیونکہ ان اولوں کی وجہ سے کار کے چھت پر ڈینٹ پڑ جاتے ہیں۔

قصور کس کا ہے؟

سوئیڈن میں اس سال بھی جہازوں اور سمندروں سے وابستہ افراد کا انٹرنیشنل میری ٹائم ڈے بڑی دھوم دھام سے منایا گیا جس میں دنیا کے 100 سے زائد ملکوں کے تقریباً 200 نمائندوں نے شرکت کی۔

عشائیہ میں ایشیا کے ملکوں کے لئے لگائی گئی تمام میزیں پر ہو چکی تھیں شاید کچھ زیادہ ہی لوگ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ آ گئے تھے مجھے جس میز پر بٹھایا گیا وہ افریقی ملکوں کے لئے محفوظ تھی۔ بہر حال مجھے کوئی بوریت محسوس نہ ہوئی اور میں خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ آدھے سے زیادہ وہ افسر تھے جنہوں نے مے رے ساتھ سوئیڈن کی ورلڈ میری ٹائم یونیورسٹی، مالمو سے مختلف مضامین میں ایم ایس سی کیا تھا۔ اس لئے انہوں نے بھی مجھے کوئی اجنبی محسوس نہیں کیا۔ تقریباً سارے لوگ جہازراں یعنی چیف انجینئر اور کیپٹن تھے۔ دو تین خواتین اپنے ملک کی بندرگاہ کی ڈائریکٹریس یا کنٹرول افسر تھیں۔ مے رے دائیں ہاتھ والی کرسیوں پر کینیا، تنزانیہ اور موزمبیق کے نمائندے تھے سامنے کی کرسیوں پر سینیگال، اینگولا، نائیجیریا، گیمبیا، گھانا اور برقانہ فاسو کے تھے۔

ادھر ادھر کی ہنسی مذاق کی باتیں ہوتے ہوتے نسل پرستی کی بات آ نکلی کہ حبشی لوگوں کو (افریقہ کے باشندوں کو جن کے گھنگھریالے بال اور کالی جلد ہے) ہر کوئی گرا ہوا سمجھتا ہے۔ اس عنوان پر میں نے محسوس کیا کہ ے ہ لوگ جو باتیں کر رہے تھے وہ حقیقت پر مبنی تھیں اور جو دلائل پیش کر رہے تھے وہ بالکل درست تھے۔ اس رات اپنے دوستوں سے سنی ہوئی باتوں سے جو کچھ ابھی تک مے رے ذہن میں تازہ ہیں یہاں بیان کرنا چاہتا ہوں:

- فرعون سے لے کر موجودہ دور تک جو بھی تاریخ میں محفوظ ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ حاکم قوم جو خود کالی جلد سے بری تھی اس نے ہم کالوں کو ذلت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔
- امریکہ اور یورپ کے ترقی یافتہ ممالک ہر انسان کی برابری اور آزادی کی بات تو کرتے ہیں لیکن ے ہ بھی تو دیکھا جائے کہ ان کا اپنے ملک میں رہنے والے کالوں کے ساتھ کیا برتاؤ ہے؟ ہم افریقہ کے کالوں کو بھی چھوڑو صرف ان کالوں کا سوچو جو اب یورپ اور امریکہ کے باشندے ہیں، جن کے دادا پردادا غلاموں کی صورت میں پہنچے اور ان ملکوں کو خوبصورت بنایا۔
- کوئی یورپی، چاہے اٹلی کا غنڈہ ہو یا اسپین کا ٹھگ لیکن گوری جلد کی وجہ سے وہ امریکہ میں باعزت سمجھا جاتا ہے اور ایک کالا چاہے پڑھا لکھا شریف ہو پھر بھی شک کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔
- دوسرے ممالک تو چھوڑیں اپنے ہی براعظم افریقہ کے ممالک لیبیا، الجیریا، تیونس، مراکش وغیرہ میں یا عرب ممالک میں ایک کالے افریقی کو کم ذات سمجھا جاتا ہے اس کے مقابلے میں گورے کی عزت افزائی کی جاتی ہے۔
- انگلینڈ میں رہنے والے کالے شیدی کے لئے کوئی باعزت اور اچھی تنخواہ والی نوکری تلاش کرنا زمین پر جنت حاصل کرنے کے برابر ہے اور یہ کالا اگر افریقہ کا رہنے والا ہے تو پھر یہ کام اور بھی مشکل شکل اختیار کر لیتا ہے۔

u یورپ اور امریکہ کے علاوہ روس میں بھی یہی حال ہے۔ حالانکہ روس کا یہ نعرہ تھا کہ سوشلزم اور کمیونزم ہر انسان کو برابر بنا دیتی ہے لیکن یہ ساری کہنے کی باتیں ہیں۔ روس میں کئی اے سے واقعات ہوئے ہیں جن میں افریقہ کے کالے لوگوں کو ذلیل کیا گیا ہے۔ جے سے امریکی اپنی نفرت کا اظہار کرنے کے لئے ہمیں نیگرو کہتے ہیں اس طرح روس کے نوجوان افریقہ کے کالوں کو بندر کہتے ہیں۔ کئی روسی ٹیکسی ڈرائیور ہم شیدیوں سے نفرت کی وجہ سے ہمیں اپنی ٹیکسیوں میں نہیں بٹھاتے اور روس اور دوسرے ممالک میں پھیلنے والی ایڈز بیماری کا الزام افریقہ سے آئے ہوئے شاگردوں پر لگاتے ہیں۔ ہمارا اہم مسئلہ ہماری نااہل قیادت (Leadership) ہے۔ ہم اس کی پردہ پوشی نہیں کر سکتے کہ ہمیں تباہ کرنے اور ہماری ترقی کی راہیں بند کرنے میں سارا قصور ہمارے لالچی اور صرف اپنا پیٹ بھرنے والے سیاسی رہنماؤں کا ہے جو ہم سے ووٹ لے کر ہمیں تباہ کرتے ہیں۔

u کتنے ذلیل اور بے غیرت ہیں ان ملکوں کے رہنما جو ملک کو کنگال کر کے لوٹی ہوئی دولت سے یورپ اور امریکہ میں جا کر عیاشیاں کرتے ہیں اور خود کو سخی کہلاتے ہیں۔ کیا یہ ان کے باپ دادا کی دولت ہے جس سے انہوں نے ولایت میں جا کر محل بنائے ہیں اور پیچھے قوم کو بھوکا اور مقروض بنا دیا ہے۔

u جنوبی افریقہ مین رہنے والے انگریز برحق ہیں جب وہ یہ کہتے ہوئے ہنستے ہیں کہ "کالوں کو آزادی دینا ان پر ظلم کے مترادف ہے۔" آزادی کا مطلب اگر یہ ہے کہ ہمارے چند حبشی رہنماؤں کو کھلی عیاشی کرنے کی آزادی دی جائے تو ایسی آزادی سے تو پہلے والی غلامی بہتر تھی۔

u ہمیں اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا چاہیے کہ قصور کس کا ہے؟ جہاں غیروں کا ہے وہاں غیروں پر الزام تراشی کرنی چاہیے جہاں اپنوں کا ہے تو پہلے ان کو سدھارنا چاہیے۔

مجبوری کی شادی اور پرچم

روٹرڈیم میں، میں صبح نو بجے دفتر پہنچنا ہوتا تھا لیکن میں ساڑھے آٹھ بجے ہی پہنچ جاتا تھا کیونکہ جس دفتر سے میرا واسطہ تھا اس میں کام کرنے والے جاپانی تھے اور جاپانیوں کی عادت سے میں اچھی طرح واقف تھا کہ ایک تو وہاں چھٹی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اور دوسری بات یہ کہ دفتر پہنچنے کا وقت نو بجے کے معنی نو بجنے میں بھی پانچ منٹ سمجھنا چاہیے نہ کہ نو بج کر پانچ منٹ۔ میں جب ساڑھے آٹھ بجے دفتر پہنچتا تو سب لوگوں کو موجود پاتا تھا۔ کبھی کبھی دفتر کی مقامی ڈچ کلرک لڑکیاں پونے نو اور نو کے درمیان پہنچتی تھیں لیکن مے رے دونوں جاپانی باس ناکانشی اور تکانو سان وقت سے بہت پہلے وہاں موجود ہوتے تھے اور چھٹی کے وقت سب سے آخر میں نکلتے۔ مے رے لئے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ جاپان (ٹوکیو) میں کچھ عرصہ جاپانیوں کے ساتھ ان کے ایک جہاز ساز کارخانے IHI میں کام کرنے کے دوران یہ بات میں نے نوٹ کی تھی بہر حال وہ ان کا اپنا ملک تھا جہاں ان پر نظر رکھنے والے کئی صاحبان اور محکمے تھے لیکن یہاں اپنے ملک سے اتنا دور بیٹھ کر اسی چابکدستی اور ایمانداری سے ان جاپانیوں کو کام کرتے دے کھ کر کبھی کبھی متعجب ضرور ہوتا تھا۔ چلیں صبح کے وقت تو کبھی کبھی ٹوکیو ہیڈ آفس سے فون آجاتے تھے لیکن دوپہر بارہ بجے کے بعد یورپ میں بیٹھ کر کیوں فکر کی جائے جب جاپان کے سب لوگ دفتر کی بجائے کلب یا اپنے گھر میں ہوتے ہیں۔ (جاپان اور ہالینڈ کے وقت میں نو گھنٹے کا فرق ہے۔ روٹرڈیم میں جب دوپہر کے بارہ بجتے ہیں اس وقت ٹوکیو میں رات کے 9 بجتے ہیں) بہر حال جاپانی قوم ہر وقت محنت اور ایمانداری سے کام کرنے کی مثال پیش کرتی رہتی ہے اور یہی ان کے ملک کی ترقی کا راز ہے۔

مسٹر ناکانشی کو ہالینڈ میں کئی سال گزر چکے تھے آپ جاپانی کلاسیفکیشن سوسائٹی (NKK) کے اس ریجن کے جنرل مینجر تھے۔ ان کی عمر تقریباً 55 برس تھی۔ دوسرے جاپانی سروئیر تکانو 40 برس کے ہونگے اور ابھی حال ہی میں ٹوکیو سے یہاں آئے تھے۔ ان دو جاپانی سروئیرز کے علاوہ تیسرا یہاں کا ڈچ مقامی سروئیر مسٹر ہوگلینڈ تھا جو کوئی 60 برس کا تھا۔ آپ شروع میں میری طرح میرین انجینئر تھے اور 1980ء تک جہاز رانی کرتے رہے اس کے بعد انشورنس کمپنیوں کے لئے جہاز کا سروے شروع کیا۔ ابھی دو سال سے اس جاپانی کلاسیفکیشن سوسائٹی کی ملازمت اختیار کی تھی اور ان کی سوسائٹی کے جہاز سروے کرتے ہیں۔ کلرک لڑکیاں ٹائپنگ، کمپیوٹر اور فیکس وغیرہ کا کام کرنے کے علاوہ

سارے جہازوں کی فائلوں کو بھی ترتیب دیتی تھیں۔ ایک کا نام مائیون اور دوسری کا خیری (Gery) تھا۔ ڈچ اور جرمن زبان میں خ کا استعمال عام ہے جس کے لئے حرف "جی" استعمال ہوتا ہے۔

دفتر میں ایک کمرہ چائے اور کافی وغیرہ کے لئے وقف تھا۔ کافی بڑا دفتر تھا یعنی کمائی کے حساب سے لاکھوں ڈالروں کے سودے ہوتے تھے لیکن چائے بنانے یا پلانے کے لئے کوئی نوکر یا چپراسی نہیں تھا۔ جس کو چائے کی ضرورت پڑے وہ خود بنا کر پیئے اور آخر میں اپنا کپ صاف کر کے رکھے۔ سارا دن گزر جانے کے باوجود کسی کا کوئی مہمان نہیں آتا تھا یعنی اپنے دوست کو دفتر میں بلا کر اس دفتر کا وقت خراب نہیں کرتے تھے۔ دفتر کا فون نمبر صرف ان جہازوں کے مالکان اور جہازوں سے وابستہ ایجنسیوں کو دیا ہوا تھا جن سے ان کے کاروباری تعلقات تھے۔ ہر فون کے ساتھ ریکارڈنگ مشین (Answering Machine) لگا رکھی تھی (اس وقت آفس میں کوئی موجود نہیں ہے۔ beep کی آواز پر اپنا پیغام ریکارڈ کروالیں) یہ اس لئے کیا ہوا تھا کہ ڈائریکٹ بات کر کے مغزماری اور وقت کا ضیاع کرنے کی بجائے مختصر پیغام سن لیا جائے اور اہم کام ہو تو اسی وقت اسی فون سے یا دوسرے فون سے کام کی بات کی جائے۔ باہر سے کوئی دفتر میں آ کر ڈسٹرب نہیں کر سکتا تھا۔ دفتر تیسری منزل پر تھا جس کا باہر کا مین گیٹ (جو لکڑی کا تھا) اس طرح بند رہتا تھا کہ باہر والے کو پتہ نہیں چلتا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ دروازہ کھولنے کے لئے کوئی کنڈی یا ڈور بیل نہیں تھی۔ دفتر میں کام کرنے والے ہم لوگوں کے پاس ایک باریک سا الیکٹرانک کارڈ تھا جسے دروازے کے ایک Slot میں ڈالنے سے دروازہ کھل جاتا تھا۔

ہم لوگ پورا دن اس تاڑ میں رہتے تھے کہ بندرگاہ میں کونسے جہاز آنے والے ہیں اور ان میں ہماری کلاسیفکیشن سوسائٹی کے کتنے جہاز ہیں۔ کلرک لڑکیاں ان جہازوں کی فائلیں پہلے سے تیار کر کے رکھتی تھیں جن فائلوں میں جہازوں کی پوری معلومات ہوتی تھی۔ جہاز کے بندرگاہ میں داخل ہونے اور جیٹی پر لگنے پر ہم لوگ اس جہاز کا سروے کرنے پہنچ جاتے تھے۔ ان جہازوں میں سے کسی کا بوائلر چیک کرنا ہوتا تھا تو کسی کا جنریٹر وغیرہ۔ میں کبھی تاکانوسان کے ساتھ جاتا تھا تو کبھی ڈچ سروئیر ہوگلینڈ کے ساتھ۔ پہلے دن تاکانوسان کے ساتھ ایک بارہ سال پرانے جاپانی جہاز کی سروے کے لئے جانا پڑا۔ ایک یونانی مالک نے یہ جہاز اوساکا کے شپ یارڈ سے بنوا کر تقریباً دس بارہ سال چلایا تھا۔ اس نے جہاز کو اپنے ملک یونان میں رجسٹرڈ کرانے کی بجائے قبرص (Cyprus) میں کرایا تھا۔ اب وہ جہاز ایک ڈچ صنعتکار نے خرید کر جنوبی امریکہ کے ایک جزے رے بہاما میں رجسٹرڈ کرایا تھا جس کا پرچم جہاز کے پچھے کے حصے پر لہرا رہا تھا۔ دوسرے ملک میں اپنے جہاز کو رجسٹر کرانا اور اس ملک کا پرچم اپنے جہاز پر لہرانا ایک عام بات ہوتی جا رہی ہے۔ کئی ملکوں میں جہازوں کے رجسٹر کرانے کی فیس، سالانہ ٹیکس اور دوسرے قوانین اتنے سخت یا خراب ہیں کہ جہازوں کے مالکان کا کافی سرمایہ اور وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ اس سے بچنے کے لئے کئی ملکوں کے جہازوں کے خریدار

اپنے جہاز دوسرے ملکوں میں رجسٹر کرواتے ہیں۔ یہ ایک اچھی بات ہے کہ کئی حکومتیں جہازوں کے لئے کافی سہولتیں مہیا کرتی ہیں اور ظاہر ہے سرمایہ کار اس طرف کا رخ اختیار کرتا ہے جہاں اس کا فائدہ ہو۔ سنگاپور، ملائیشیا، دبئی، ہانگ کانگ اور کئی بندرگاہیں ان میں سے ہیں مگر کچھ اسے ملک بھی ہیں جو معلومات کے باوجود ناقص جہازوں کو بھی رجسٹر کرلے تے ہیں جو جہازرانوں کے لئے جان لیوا ثابت ہوتے ہیں۔ بہاما، لائبیریا، پانامہ اور قبرص وغیرہ ان ممالک میں سے ہیں جو رجسٹریشن فیس کمانے کے چکر میں ناکارہ جہاز بھی رجسٹر کرلے تے ہیں اور دنیا کے سمندروں پر کئی اسے سے جہاز جن کا چلنا خطرناک ہے اور جن کو مرمت کی انتہائی ضرورت ہوتی ہے بہاما، لائبیریا اور پانامہ جے سے ملکوں کے پرچم لہرائے ہوئے چلتے ہیں۔ اسے سے ممالک کوFlag of Convenienceکہتے ہیں جے سے ہمارے ایشیا اور افریقہ کے لوگ یورپ یا امریکہ میں رہنے کے لئے وہاں کی کسی مقامی عورت سے شادی کرتے ہیں اور ان بوڑھی، منشیات کی عادی اور بدکردار عورتوں سے پیار نہ ہوتے ہوئے بھی مجبوراً شادی کرتے ہیں تاکہ ان کو ان کے خوشحال ملک میں رہنے کی اجازت مل جائے اور ان عورتوں کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ شادی کرنے والا ان کو دل سے چاہتا نہیں ہے لیکن ان کی دیکھ بھال کرنے کے لئے کم از کم کچھ برسوں کے لئے شوہر کے روپ میں ایک عدد اچھا سا نوکر مل جاتا ہے۔ ایسی شادی کوMarriage of Convenienceکہتے ہیں اسی طرح جہازوں کی ایسی رجسٹریشن کوFlag of Convenienceکہتے ہیں۔

سترھویں صدی۔ڈچ تاریخ کا سنہری دور

نیدر لینڈ کے شمال اور مغرب میں سمندر ہے جو بحیرہ شمال(North Sea) کہلاتا ہے۔یہ سمندر بحر ہند یا بحر اوقیانوس کی طرح رقبے میں بڑا نہیں ہے لیکن سال کا بیشتر حصہ سخت سردی، طوفان، دھند اور کہر کی وجہ سے جہاز رانوں کے دماغ پر چھایا رہتا ہے۔(یہ اور بات ہے کہ ایسے خطرناک سمندروں نے ہمیشہ اچھے جہازران پیدا کئے ہیں)
اس ملک کے مشرق میں جرمنی ہے اور جنوب میں بلجیم ہے۔

نیدر لینڈ کو ہالینڈ بھی کہتے ہیں جو نام دسویں صدی کے بعد مشہور ہوا۔ہالینڈ کے لئے کہا جاتا ہے کہ یہ نام ہولٹ لینڈ سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے جنگلات کی زمین یعنی Wood Land ویسے ہالینڈ دراصل نیدر لینڈ کے سات صوبوں میں سے ایک صوبے کا نام ہے۔یہ ایسا ہے جیسے پوری برطانیہ کو ہم لوگ کبھی کبھی انگلینڈ کہتے ہیں حالانکہ انگلینڈ تو برطانیہ کا صرف ایک صوبہ (جنوبی حصہ) ہے (اور اس بات پر اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ کے لوگوں کو غصہ آتا ہے) بہر حال یہاں ہالینڈ کا نام انگلینڈ سے زیادہ مشہور ہو گیا ہے۔

نیدر لینڈ کا دارالحکومت ایمسٹرڈیم ہے جہاں اس ملک کی رانی رہتی ہے مگر سرکاری دفاتر ہیگ (Hague) میں ہیں۔
اسی وجہ سے کئی غیر ملکی لوگ نیدر لینڈز کا دارالحکومت ہیگ سمجھتے ہیں۔

سارے ہالینڈ (نیدر لینڈز) کا اس وقت رقبہ سولہ ہزار مربع میل ہے جس میں سے دھرتی (خشکی) تیرہ ہزار مربع میل ہے باقی دریا اور سمندر ہے جسے یہاں کے ڈچ لوگ مٹی سے بھر بھر کر خشکی کا رقبہ بڑھاتے جارہے ہیں۔سمندر بھرنے کے کام میں یہ لوگ ہر وقت لگے رہتے ہیں اور یہ حروف چھپنے تک سمندر کا مزید حصہ دھرتی بن چکا ہو گا۔

نیدر لینڈز کے پرچم میں تین پٹیاں: لال،سفید اور تیز نیلے رنگ کی ہیں۔

آج کل کے نیدر لینڈز میں گیارہ صوبے ہیں جن میں کوئی 957بلدیات ہیں سب سے زیادہ گنجان جنوبی ہالینڈ (Zuid Holland) ہے اور ڈرنتھی (Drenthe) صوبے میں سب سے کم لوگ رہتے ہیں۔نیدر لینڈز کے لوگوں کا ذریعہ معاش زراعت،ماہی گیری، گائیں پالنے اور دودھ مکھن پر ہے۔جہاز رانی اور صنعتکاری سے بھی کافی کمائی ہوتی ہے۔

نیدر لینڈز پر 1948ءسے 1980ءتک رانی جولیانا کی حکومت رہی ہے۔جولیانا نے شہزادہ پرنی ہارڈ سے شادی کی تھی جس سے اس کی چار بیٹیاں ہوئیں۔بیٹرکس سب سے بڑی بیٹی ہے اس کے بعد آئرن،مارگریٹ اور ماریا کرسٹینا ہے۔
1980ءمیں جولیانا اپنی بڑی بیٹی بیٹرکس کے حق میں تخت سے دستبردار ہو گئی۔

ہالینڈ (نیدرلینڈز) میں آئینی شہنشاہیت (Constitutional Monarchy) ہے۔ انتظامی حکومت کابینہ کے ہاتھ میں ہے جس کا بذریعہ اکثریت انتخاب ہوتا ہے۔ پارلیمنٹ (جسے یہاں کی زبان میں Staten General کہتے ہیں) کے دو حصے ہیں۔ ایوان بالا کو فرنٹ چیمبر اور زیریں حصے کو سیکنڈ چیمبر کہتے ہیں۔

پارلیمنٹ جو بل پاس کرتی ہے وہ رانی صاحبہ کے پاس دستخط کے لئے جاتا ہے۔ (1890ء سے ہالینڈ پر کسی نہ کسی رانی کی حکومت چلی آرہی ہے) تھیوری کے مطابق وہ چاہے تو کسی بھی بل کو پاس کرنے سے انکار کر سکتی ہے لیکن آج تک کسی بھی رانی نے پارلیمنٹ سے پاس کئے ہوئے بل کو مسترد نہیں کیا ہے۔

سترہویں صدی ڈچ تاریخ کا سنہرا دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں ہالینڈ نے معاشی ترقی کے علاوہ آرٹ اور فنون لطیفہ کی دنیا میں بہت ترقی کی۔ دنیا کے سمندروں پر ڈچ لوگوں کا راج رہا۔ ایک طرف ان کے جہاز افریقہ، ایشیا اور امریکہ کی طرف نکل پڑے جہاں سے وہ خوب دولت سے بھر بھر کر آتے تھے تو دوسری طرف یہاں کے امیر لوگ کمائی ہوئی دولت کا بڑا حصہ فن پر خرچ کرنے لگے۔ ملک کے آرٹسٹ، ہنر مند، عمارت سازی کے ماہر اور فنکاروں کا خوب نام پیدا ہوا۔

اس دور کی خوبصورت عمارتیں اور آرٹ کے بہترین نادر نمونے آج بھی ہالینڈ کے ہر بڑے شہر میں موجود ہیں۔ ریمبر انڈٹ (1606ء تا 1669ئ) اس دور کا مشہور آرٹسٹ تھا۔ اس کے علاوہ ہالس، اڈرین وان اوستاد، باتھ لومیوز اور دوسرے کئی آرٹسٹوں کا تعلق بھی ہالینڈ کے اس دور سے رہا ہے مزید برآں کئی موسیقار، سائنسدان اور فلسفی بھی اس دور میں پیدا ہوئے۔

ڈچ زبان

ڈچ زبان جو آج کل ہالینڈ میں بولی جاتی ہے جدید ڈچ زبان کہلاتی ہے۔ یہ دو ڈھائی سو سال قبل بولی جانے والی ڈچ زبان سے اتنی ہی مختلف ہے جتنی آج کی انگریزی اس وقت کی انگریزی زبان سے۔ سترہویں صدی کے معروف ڈچ شاعر جوسٹ وان ڈین ونڈل(Joost VanDen Vondel) نے جس زبان میں شاعری کی ہے وہ آج کے ڈچ باشندے کے لئے اتنی ہی مشکل ہے جتنی شیکسپیئر کی انگریزی آج کے انگریز کے لئے۔

جرمن اور انگریزی زبان کی طرح ڈچ بھی جرمنک فیملی سے ہے۔ ڈچ زبان میں کئی الفاظ اے سے ہیں جو انگریزی اور جرمن زبانوں میں ہیں لیکن ڈچ زبان جرمن کے مقابلے میں کافی آسان ہے۔ ڈچ لوگوں نے اپنی زبان کو مزید آسان بنانے کے لئے کئی الفاظ خاص طور اسم چھوٹے کر دے ئے ہیں اور ان کی اسپیلنگ بھی اچھی خاصی آسان ہے۔ ہالینڈ (نیدر لینڈز) میں ڈچ زبان کے علاوہ مختصر بولیاں(dialects) بھی بولی جاتی ہیں۔

جرمن یا انگریزی بولنے والوں کے لئے ڈچ سیکھنا مشکل کام نہیں ہے کیونکہ ڈچ زبان کی گرامر اور کئی الفاظ انگریزی اور جرمن سے کافی ملتے ہیں۔ کچھ ڈچ الفاظ جو روزمرہ کی زندگی میں سننے میں آتے ہیں وہ یہ ہیں۔

(Man (Man

(Drie (Three

(Warm (Warm

(IJs (Ice

(Melk (Milk

(Zuid (South

(School (School

کچھ الفاظ ان زبانوں سے بالکل مختلف ہیں جے سے کہ:

(Mooi (Beautiful

(Kwood (bad

(Fits (Bicycle

(Leuk (Nice

(Heus (Really

کچھ ڈچ حروف (Dipthongs) انگریزی جاننے والوں کے لئے نرالے ہیں جے سے کہ ڈچ "IJ" کو I کہتے ہیں، IU کو OU کہتے ہیں اور OUT کے لئے IUT لکھتے ہیں اور کچھ کونسوننٹ (Consonants) بھی انگریزوں کو بولتے ہوئے مشکل درپیش آتی ہے جے سے G جسے 'گ' کے بجائے 'خ' بولا جاتا ہے جیسے کہ پہلے بتا چکا ہوں کہ ہمارے آفس مین کام کرنے والی ڈچ لڑکی کا نام Gery تھا لیکن اسے خیری پکارا جاتا تھا۔

اپنے ملک نیدرلینڈز کے علاوہ ڈچ زبان اور بھی بعض ملکوں میں بولی جاتی ہے۔ انڈونیشیا پر ڈچ لوگوں کی حکومت ہونے کی وجہ سے وہاں کے اسکولوں کالجوں میں آج بھی ڈچ زبان کا اتنا اثر ہے جتنا ہمارے ملکوں پاکستان، بھارت، ملائیشیا میں انگریزی کا ہے۔ ہالینڈ کے پڑوسی ملک بیلجیم میں بھی تقریباً پچاس لاکھ ڈچ رہتے ہیں جو ڈچ زبان بولتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی ڈچ زبان میں تھوڑا سا فرق ہے جے سے ہمارے ہاں پاکستان کی سندھی اور پنجابی میں (جن میں عربی اور فارسی کے زیادہ حروف ہیں) اور بھارت میں بولی جانے والی سندھی اور پنجابی میں فرق ہے جو وہاں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ زیادہ بولے جاتے ہیں۔ بہرحال بیلجیم میں بولی جانے والی ڈچ زبان کو Flemish کہتے ہیں۔ سری لنکا میں کسی زمانے میں کافی ڈچ لوگ رہتے تھے آج بھی ان کی اولادیں اپنے گھروں میں ڈچ بولتے ہیں۔ امریکہ کی طرف سری نام اور بعض جزیروں (انٹیلیز وغیرہ) پر جو ڈچوں کے قبضے میں رہے، ڈچ بولی جاتی ہے۔

جنوبی افریقہ میں وہاں کے کافی مقامی حبشی لوگ ڈچ زبان بولتے ہیں جو ستر ہویں صدی میں ڈچ جہاز رانوں نے وہاں متعارف کرائی تھی۔ حالانکہ ڈچ لوگ ہمیشہ کے لئے وہاں پر رہائش پذیر نہیں ہوئے لیکن ان کی زبان خود بخود پھلتی پھولتی رہی۔ کہتے ہیں کہ جنوبی افریقہ میں جو ڈچ زبان بولی جاتی ہے وہ نیدرلینڈز کی جدید ڈچ سے بھی آسان ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آسان کرنے کے چکر میں جنوبی افریقہ والوں نے ڈچ زبان کے کئی الفاظ مشکل اور مضحکہ خیز بھی بنا دے ئے ہیں جنہوں نے آسانی کی بجائے کنفیوژن پیدا کی ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے روٹرڈیم کے دفتر کا ڈچ سرویئر

بتا رہا تھا کہ فرٹیلائزر (کھاد) لفظ کو آسان بنانے کے ارادہ سے اس کا نیا ڈچ نام جو تجویز کیا گیا ہے اس کا مطلب ہاتھ سے بنا ہوا فضلہ (Toilet) ہے کیونکہ گائے بھینسوں کا فضلہ، قدرتی کھاد ہوئی۔

ملائیشیا کی حکومت نے بھی کچھ عرصہ انگریزی لفظ ملے ئی زبان میں تبدیل کئے تھے جے سے کہ ریفریجریٹر کو ملے ئی بنانے کے لئے اس کا نام "پیٹی سجوک" یعنی ٹھنڈا صندوق رکھا لیکن زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اس سلسلے میں انگریزی الفاظ کو ہندی بنانے میں بھارت نے سب سے بڑی کوشش کی جے سے کہ پوسٹ میں ہندی میں پتر بکھیڑو ہو گیا اور خط ڈالنے کا ڈبہ یعنی لیٹر بکس پتھر گھسیٹرو بن گیا۔ ٹرین (ریل گاڑی) کو ہندی میں اب اگنی رتھ کہتے ہیں۔ اگنی کا مطلب آگ اور رتھ معنی پہیوں پر چلنے والی گاڑی۔ سب سے دلچسپ نام اس ریل گاڑی کو روکنے یا چلنے کا اشارہ کرنے والے سگنل کا ہے جو اس طرح ہے۔

"اگنی رتھ گامن اگامن سوچکا تانبا ورنا لوہا پاتکا" یعنی آگ گاڑی کے آنے جانے کا اشارہ کرنے والی تانبے کے رنگ کی پتری .... یعنی ریلوے سگنل۔

کسی نے کہا تب تک تو ریل گاڑی ریلوے اسٹیشن سے گزر جائے گی جب تک کوئی اسے روکنے کے لئے کسی کو حکم دے گا کہ "اگنی رتھ گامن اگامن سوچکا تانبا ورنہ لوہا پاتکا" اوپر کر دو۔

ڈچ انڈیز

بحر اوقیانوس کا وہ حصہ جو جنوبی اور شمالی امریکہ کے درمیان آتا ہے کیریبین سمندر (Caribean Sea) کہلاتا ہے۔ اس سمندر میں کئی چھوٹے بڑے جزائر ہیں جے سے کہ بہاماس، کیوبا، جمیکا، ہیتی، دومینکن ریپبلک، پورٹو ریکو، انٹیلیز، بار مودا، بارباڈوس، گریناڈا، ٹباگو، ٹرینیڈاڈ وغیرہ۔ جزیروں کی اس زنجیر کو ویسٹ انڈیز کہتے ہیں۔ انٹیلیز پر شروع سے ڈچوں کا قبضہ رہا اور اسے نیدرلینڈز انٹیلیز یا ڈچ انڈیز کہتے ہیں۔ انگریز ہندوستان، ملایا، برما، کینیا، نائیجیریا وغیرہ کو آزادی یا خود مختاری دے نے کے بعد اپنا بوریا بستر وغیرہ باندھ کر اپنے وطن لوٹ آئے۔ ان سے کوئی قانونی تعلق یا معاہدہ قائم نہیں رکھا۔ بعد میں دور بیٹھ کر دولت مشترکہ اور اس جیسی مسخریاں کرتے رہے جس کے ذرے عے ان ممالک سے ان کا آج تک تھوڑا بہت تعلق چلتا آ رہا ہے۔ مگر ڈچ حکومت سے یہ بے وقوفی ہو گئی بلکہ بقول ہمارے ہوٹل کے ڈچ مینجر کے نیدرلینڈ سے یہ غلطی ہو گئی کہ جنوبی امریکہ میں سری نام اور کیریبین سمندر میں انٹیلیز جزائر

کو 1954ء میں آزادی یا خود مختاری دے نے کے ساتھ ساتھ ان ملکوں سے یہ معاہدہ کر لیا کہ وہ نیدر لینڈ کے ساتھ ساتھ ایک ہی شہنشاہ کی رعیت بن کر رہیں گے اور ہر چیز میں مقامی ڈچ لوگوں کی طرح حصہ دار رہیں گے۔

اب یہ معاہدہ ڈچ حکومت کے گلے میں پڑ گیا ہے۔ اس مہنگائی اور بے روز گاری کے دور میں نیدر لینڈ تو یورپ کے بھی کئی ملکوں سے امیر اور خوشحال ہے مگر سری نام اور اینٹیلیز ہمارے ایشیائی ممالک سے بھی غریب اور بدحال ہیں۔ ایک دوسرے کے ملکوں میں آنے اور رہنے کی آزادی کی وجہ سے سری نام اور اینٹیلیز کے سینکڑوں لوگ ہر مہینے نیدر لینڈ میں آتے رہتے ہیں اور ہر وہ سہولت مانگتے ہیں جس پر مقامی ڈچ شہری کا حق ہے۔

پاپوانیوگنی اور ایریاں جایا

انڈونیشیا کے جزیروں کی قطار میں دائیں جانب اور آسٹریلیا کے شمال میں ایک بہت بڑا جزیرہ ہے جو کسی زمانے میں نیوگنی کے نام سے مشہور تھا اور اب اس کا آدھا حصہ پاپوانیوگنی کہلاتا ہے اور باقی آدھا حصہ ایریان جایا۔ اس جزیرے سے بھی ڈچوں کا کافی تعلق رہا ہے۔

نئی دنیا کی تلاش میں یہ جزیرہ پہلے پرتگالی اور ہسپانوی جہاز رانوں کو نظر آیا۔ یہاں کے رہنے والوں کے گھنگھریالے بال دیکھ کر پرتگالیوں نے اس جزے رے کا نام پاپوا رکھا جس کی معنی ہے گھنگھریالی بال اور ہسپانوی لوگوں نے نیوگنی نام رکھا۔ اس جزے رے کے مغربی حصے پر 1828ء میں ڈچوں نے قبضہ کیا اور 1880ء میں مشرقی حصے کو مزید دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک پر جرمنی نے قبضہ کیا جبکہ دوسرا حصہ انگریزوں کو ملا جنہوں نے اسے آسٹریلیا کے حوالے کر دیا۔ ایسا لگتا ہے جے سے یہ زمین نہیں بلکہ کیک یا چپاتی تھی جس کی یورپ جیسی دور دراز جگہوں سے آئے ہوئے لوگ آپس میں بندر بانٹ کرتے رہے اور جن کی ماتا بھومی تھی ان کا نام و نشان نہیں۔ بہر حال آسٹریلیا والوں نے اس پورے حصے کا نام پاپوانیوگنی قائم رکھا اور ڈچوں والا آدھا حصہ ایریاں جایا کہلانے لگا۔ 1963ء میں انڈونیشیا کو ڈچوں سے آزادی ملنے کے بعد یہ جزیرہ (ایریاں جایا) انڈونیشیا کی حکومت کو ملا۔ مقامی لوگ اسے آزاد رکھنے کے لئے جدوجہد جاری رکھتے رہے بالآخر 2000ء میں اسے آزادی نصیب ہوئی۔ آسٹریلیا والوں نے اپنے حصے پاپوانیوگنی کو 1975ء میں ہی ایک آزاد ریاست کے حقوق دے دیئے تھے۔

یورپ کی گلیوں میں مرنے دو

گزشتہ رات جرمنی کے RTL ٹی وی چینل پر ایک انگریزی فلم کا کچھ حصہ دے کھنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے جب یہ چینل کھولا تو فلم کا کچھ حصہ چل چکا تھا۔ یہ فلم بی بی سی نے ایشیا اور افریقہ کے غریب ممالک کے ان تارکین وطن پر بنائی ہے جو روزگار کی تلاش میں یورپ میں غیر قانونی طور پر داخل ہوتے ہیں۔ یہ فلم افریقہ کے غریب حبشی لوگوں پر تھی جو اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے ظاہراً یا چھپ کر یورپ کی سرزمین پر پہنچتے ہیں اور ملازمت یا مزدوری ڈھونڈتے ہیں۔ یورپی لوگ نہیں چاہتے ہیں کہ افریقہ کے یہ لوگ بن بلائے ان کے شہروں میں پہنچ جائیں لیکن افریقہ کے غریب اور بیروزگاری کی چکی میں پسے ہوئے لوگ آخر کیا کریں اور کدھر جائیں۔ جب ان کے ملک میں سب کچھ تھا تو وہ وہیں رہے۔ بلکہ یورپ کے لوگ کئی برسوں بلکہ صدیوں تک افریقہ اور ایشیا میں بیٹھے موج اڑاتے رہے اور مقامی لوگوں کی ہر چیز پر انہوں نے قبضہ جمالیا۔ حتیٰ کہ انسانوں کو بھی گائیں بکریوں کی طرح مارکیٹوں میں نیلام کر دیا اور اب یہ خوشحال یورپی لوگ ان افریقہ یوں کو مزدوری کے لئے بھی نہیں بلاتے جن کی انہوں نے دولت لوٹی، جن کے خون پسینے سے ان کے شہروں کو رونق ملی، جن سے ان کے ہی آباؤ اجداد کی زمینیں کاشت کروا کے فصل کو یورپ کی منڈیوں میں پہنچا کر دولت اپنی جیبوں میں ڈالی اور جن کی کانوں سے نکلی دھات اور ہیروں سے انہوں نے اپنے ملک (یورپ) میں صنعتیں قائم کر لیں۔

اس فلم نے مجھ جے سے تیسری دنیا کے دے کھنے والوں پر ضرور گہرا اثر چھوڑا ہو گا۔ فلم کی آخر میں فلم میں کام کرنے ولوں کے نام دکھاتے ہوئے ایک بار پھر فلم کا نام "دی مارچ" بتایا جو میں نے نوٹ کر لیا اور اس فلم کی تلاش میں ہوں کہ یہ کہیں سے مل جائے تو ایک دفعہ شروع سے ضرور دیکھ لی جائے۔

اس فلم "دی مارچ" میں دکھایا گیا ہے کہ براعظم افریقہ کے غریب لوگ سوڈان، صومالیہ، ایتھوپیا سے جمع ہو کر چاڈ، نائیجر، مالی، موریطانیہ، سینگال، جنوبی صحارا سے ہوتے ہوئے بحر اوقیانوس کے ملک مراکش (المغرب) میں پہنچتے ہیں جس کے آمنے سامنے پرتگال، اسپین جے سے یورپی ممالک ہیں۔ افریقہ کے ملک مراکش اور یورپ کے ان ملکوں کے بیچ میں سمندر کی گلی اتنی پتلی ہے کہ ایک چھوٹی سی کشتی سے بھی اسے عبور کیا جا سکتا ہے۔ یہ سمندری نالہ دنیا کے دو مشہور سمندروں بحر اوقیانوس اور بحر روم کو آپس میں ملاتا ہے۔ مراکش سے یہ سمندری نالہ پار کر کے طارق بن زیاد جس جزیرے پر پہنچے تھے اس کا نام آج بھی جبرالٹر (جبل الطارق) ان کے نام سے منسوب ہے۔ افریقہ کے یہ

لوگ بھوک، بیروزگاری اور بیماریوں سے بیزار ہو کر آج اس جگہ پر مہدی نام کے لیڈر کے ساتھ آ پہنچے تھے۔ وہ کشتیوں کے ذریعے بحر روم کا یہ پتلا حصہ پار کر کے یورپ پہنچنا چاہتے تھے۔ وہ یہ کہہ رہے تھے کہ ایسا کیوں ہے کہ یورپ کے لوگوں کے پاس تو سب کچھ ہے لیکن ہم لوگوں کے پاس زندگی کی بنیادی چیزیں بھی نہیں ہیں۔ وہ ہمارے پڑوسی، چند میل دور دریا کے اس پار (بحر روم کے دوسرے کنارے) پر رہتے ہیں مگر کتنا فرق ہے۔ ان کے پاس ہر چیز ضرورت سے زیادہ ہے اور ہم افریقیوں کے پاس کچھ بھی نہیں۔ نہ پیٹ میں روٹی ہے نہ پاؤں میں جوتے۔ وہاں تو کچرے میں بھی گندم (ڈبل روٹی) اور گوشت پھینکتے ہیں یہاں ہمیں اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے گاجر اور آلو تک میسر نہیں ہے۔ پینے کے لئے گدلا پانی بھی نہیں ہے۔

سوڈان سے شروع ہونے والا، پھٹے کپڑوں اور ننگے پاؤں والوں کا یہ قافلہ مراکش پہنچنے کے لئے کئی دن صحارا کا بیابان پار کرتا ہے۔ جہاں سے وہ گزرتے وہاں سے ان کے ساتھ اور بھی ان جے سے غریب لوگ شامل ہو جاتے۔ وہ بیابان، جنگل، مشکل راستے پکے عزم کے ساتھ پار کرتے جا رہے ہوتے ہیں۔ ان میں جوش اور جذبہ ہے اور دل میں پکا ارادہ ہے کہ ان کو آگے بڑھنا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت ان کو روک نہیں سکتی۔ راستے کی مشکلات انہیں دل شکستہ نہیں بنا سکتی ان کی یورپ کی طرف پیش قدمی کرنے کی خبریں یورپ میں بھی پہنچتی ہیں جہاں یورپی برداری کے ملکوں کے نمائندے پہلے اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے لیکن بعد میں وہ سوچتے ہیں کہ اس مارچ کو روکا جائے کیونکہ یورپ یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ ایک غریب براعظم کے ننگے، بھوکے، جاہل اور بیمار لوگ اس کی سرزمین پر پہنچ کر ان کا مزہ خراب کریں۔ یورپی یہ بھی سوچ کر پریشان ہو جاتے ہیں کہ ان کے ایک مرتبہ پہنچنے کے بعد اگر ان کو واپس بھیجنے کے لئے زبردستی کی جائے گی یا گولی چلائی جائے گی تو یقیناً دنیا بھر کے سامنے یورپ کی اصلیت ظاہر ہو جائے گی کہ یورپی صرف دکھاوے کے لئے انسانی ہمدری کی بات کرتے ہیں مگر حقیقت میں وہ بہت ظالم ہیں۔

اس مارچ کو روکنے کے لئے یورپ والے اپنے ایجنٹ اس قافلے کے رہنما مہدی کے پاس بھیجتے ہیں اور اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ آپ سمندر پار کر کے یورپ نہ آئیں بلکہ اپنی زمین افریقہ پر ہی رہیں۔ اس بات پر ان میں سے کوئی بھی راضی نہیں ہوتا ہے اور وہ اپنا مارچ جاری رکھتے ہیں۔ مراکش پہنچنے پر یورپ سے بھیجا ہوا ایک جاسوس اس قافلے کے رہنما مہدی پر گولی چلاتا ہے۔ مہدی بچ جاتا ہے اور وہ چیخ چیخ کر اس یورپی قاتل کو کہتا ہے۔

"اگر تم سمجھتے ہو کہ مجھے مارنے سے یہ قافلہ یورپ کی طرف بڑھنے سے رک جائے گا تو تم غلطی پر ہو۔ اس مارچ کو روکنا ہے تو مجھ سمیت ان ہزارہا لوگوں کو بھی ختم کرنا ہو گا۔ کیا تم اتنے سارے لوگوں کو قتل کر سکو گے؟ کیا تمہارے پستول میں اتنی گولیاں ہیں؟ اگر نہیں تو صرف مجھے مارنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

اس کے بعد افریقہ کے ان غریب حبشی لوگوں کا رہنما یورپ کی طرف منہ کر کے تقریر کرتا ہے۔

"اے یورپ والو! آپ نہیں چاہتے کہ ہم غریب لوگ آپ کے پاس آئیں۔ ہمارے آنے پر آپ یہی کہیں گے کہ کیوں آئے ہو؟ ہم آپ لوگوں کے لئے کچھ نہیں کرسکتے؟ تو ہم آپ کو بتانا چاہتے ہیں کہ اگر آپ ہمارے لئے کچھ نہیں کرسکتے اور آپ ہمیں مرنے پر مجبور کرتے ہو تو ہمیں آپ اپنے پاس یورپ میں ہی مرنے دو! اپنی گلیوں میں ہی مرنے دو تا کہ کل کا انسان کسی خوش فہمی میں نہ رہے اور وہ آپ لوگوں کی ہمدردی کی کھوکھلی باتیں سن کر یہ یاد کرے کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی آپ لوگوں نے ہماری مدد نہیں کی۔"

اس دوران یورپ کی ایک عورت جو شاید یورپی برادری کے کسی ملک کی وزیر یا مشیر ہے یورپی ملکوں کے نمائندہ وزراء کو سمجھاتی ہے کہ ہم یورپیوں کو سختی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ ہمیں ضرورت مندوں کی مدد کرنی چاہیے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ہمارے یورپ والوں کی حالت کا ذرا سوچو تو کتنی خراب ہوگئی تھی۔ لوگوں کے پاس کھانے کو نہیں تھا۔ امریکہ اگر ہماری مدد نہ کرتا تو آج ہماری حالت افریقہ سے بھی بدتر ہوتی۔ ہمیں بھی تو زندہ رہنے کا حق تھا۔ آج ہم ان غریب افریقہ یوں کی مدد کیوں نہ کریں جب یہ لوگ ہم سے زیادہ خوشحال تھے۔ براعظم افریقہ کے ملکوں اور لوگوں کو اس کسمپرسی کی حالت تک پہنچانے میں ہم لوگوں کا بھی ہاتھ ہے۔ زیادہ نہیں تو کم از کم ان غریب لوگوں کو یورپ میں آنے دیا جائے اور انہیں روزگار مہیا کیا جائے۔

اس کے ساتھی وزیر اس کے مشورے پر متفق نہیں ہوتے۔ سب کے سب یہی کہتے ہیں کہ امیگریشن قوانین توڑ کر افریقی یا کوئی اور غیر ملکی یورپ کے کسی بھی کنارے یعنی فرانس، اسپین، اٹلی یا پرتگال میں قدم رکھے گا تو اسے گولی مار دی جائے گی۔

یورپ کی خاتون وزیر نہیں چاہتی کہ انسان کا خون بہے۔ اس دوران ہزاروں افریقی عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے پھٹے پرانے کپڑوں میں کئی چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سوار ہو چکے ہوتے ہیں۔ ان کو یورپ کی طرف بڑھتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ یورپ کے کنارے کے قریب پہنچنے سے پہلے یہ وزیر عورت اسپیڈ بوٹ کے ذریعے یورپ سے بیچ سمندر میں اس قافلے کے پاس پھر آتی ہے۔ وہ ان کو یورپ آنے سے ایک مرتبہ پھر منع کرتی ہے۔ وہ ان کو سمجھاتی ہے کہ ایسا نہ کرو واپس افریقہ چلے جاؤ۔ اس طرح آنا غیر قانونی ہے۔ "ابھی بھی وقت ہے لوٹ جاؤ یہ یورپی لوگ جب تمہارا آنا پسند نہیں کرتے تو مت آؤ۔ ضد چھوڑو اور افریقہ واپس لوٹ جاؤ۔"

"تم ہمیں واپس جانے کا کس منہ سے کہتی ہو۔" قافلے کے رہنما مہدی نے جواب دیا۔ "ایک دو صدیاں پیشتر جب یورپ کی حالت خراب تھی تو یورپ کا ایک ایک ملک ہمیں لوٹنے کے لئے افریقہ پہنچ گیا تھا۔ ہماری زمین کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے اپنی جاگیر بنالی تھی اور ہر چیز کے مالک بن کر بیٹھ گئے تھے۔ آج جب ہماری ضرورت ہے تو آپ لوگ ہمیں نوکر کی طرح رکھنے کے لئے بھی راضی نہیں ہیں۔ "میری بات سمجھنے کی کوشش کرو اور واپس لوٹ جاؤ۔"

یورپ کی خاتون وزیر ان کو سمجھانے کی کوشش کرتی رہی لیکن غریب حبشی لوگ اس کی بات نہ مانے۔ پورا سمندر کشتیوں سے بھرا ہوا نظر آتا ہے اور ہر کشتی کا رخ یورپ کی طرف ہے۔ قافلے کا رہنما جواب میں اس یورپی عورت سے کہتا ہے۔

"ہم لوگ اتنا آگے بڑھ چکے ہیں کہ واپس لوٹنا ناممکن ہے۔ ہمیں غربت کا رخ دکھانے کی بجائے یورپ میں ہی رہنے دیں۔"

"آپ لوگوں کا اس طرح ضد کرنے سے یورپ کی فوج آپ کو روکنے کے لئے کوئی سخت قدم اٹھانے کے لئے مجبور ہو جائے گی اور پھر ان پر میرا بھی بس نہیں چل سکے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ دنیا خون خرابے کی خبریں سنے۔ تم لوگوں کو ہم یورپ میں بلاتے رہیں گے لیکن تھوڑے تھوڑے کر کے، ضرورت کے مطابق۔ جتنی تم غریب افریقہ یوں کو ہم امیروں کے پیسے کی ضرورت ہے اتنی ہم لوگوں کو آپ کے کام اور محنت مزدوری کی ضرورت ہے مگر اتنے بڑے قافلے کو ہم لوگ ایک ہی وقت میں نہیں بلا سکتے۔ لوٹ جاؤ، برائے مہربانی لوٹ جاؤ۔"

"ہمارے لئے اب واپس لوٹنا ناممکن بات ہے۔" افریقی لوگ جواب دے تے ہیں۔

"میری بات مانو لوٹ جاؤ۔ یورپ میں آنے سے گریز کرو۔ اگر واپس نہیں جاؤ گے تو یورپ کی زمین پر قدم رکھتے ہی یورپ کی ظالم پولیس تم پر گولیاں برسانا شروع کر دے گی۔"

"بالکل برسائیں ہم مرنے کے لئے تیار ہیں۔ وے سے ہی ہم زندہ در گور ہیں۔" قافلے کے رہنما مہدی نے جواب دیا۔ یورپی خاتون نے اسے ایک بار ٹھنڈے دماغ سے سوچنے کے لئے پھر کہا۔

"مجھے اپنا دوست سمجھ کر اس ارادے سے باز آجاؤ۔ تمہاری موت پر تمہاری آنے والی نسلوں کو فائدے کی بجائے نقصان ہو گا۔"

"وہ کیسے؟" مہدی نے پوچھا۔

"اتنے بڑے خون خرابے کے بعد یورپ کی حکومتیں تم افریقہ یوں کے لئے اپنے ملک میں آنے کی تمام راہیں مسدود کر دیں گی۔ اس وقت ہم لوگ اپنی ضرورت کے مطابق آپ لوگوں یہ ں سے تھوڑے تھوڑے کر کے بلاتے رہیں گے۔ خونریزی کے بعد یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے گا۔ یورپ ڈر، خوف، نفرت اور لاتعلقی کی دیواریں کھڑی کر دے گا اور تم لوگ ہمیشہ کے لئے ان دیواروں کے پیچھے رہ جاؤ گے۔ ہم یورپی لوگ خود کو اس قلع میں قید کر لیں گے اور پھر اس کے بعد یہ تمہاری تھوڑی بہت آمد و رفت بھی بند ہو جائے گی۔

قافلے کے لوگ اور ان کا رہنما ان کی کوئی بات بھی ماننے کے لے تیار نہیں ہوتا اور اپنی کشتیاں یورپ کی طرف بڑھاتے جاتے ہیں۔ حتیٰ کی کشتیاں سمندر پار کر کے یورپ کے کنارے پر پہنچ جاتی ہیں۔ قافلے میں موجود لوگوں میں

سے ایک چھوٹا سا بچہ خوشی میں آکر پستول سے ہوائی فائر کرتا ہے۔ یہ پستول یورپی جاسوس کا پھینکا ہوا تھا اور بچے نے اس کو کھلونا سمجھ رکھا تھا۔ پستول کے فائر پر کنارے پر کھڑا یورپی برادری کا سپاہی اپنی بندوق کی لبلبی چلاتا ہے۔ بچہ اسی وقت زخمی ہو کر گر جاتا ہے۔ چاروں طرف چھپے ہوئے یورپی سپاہی ظاہر ہو جاتے ہیں اور ان افریقیوں کو آگے بڑھنے سے روکتے ہیں۔ اس نقطے پر پہنچ کر فلم ختم ہو جاتی ہے۔

ناروجین کا ایرانی بیٹا

ناروے کے سروئیر مسٹر ڈرونین کے ساتھ جہاز کی انسپکشن کا کام ختم کرکے کوئی دو بجے اس شپ یارڈ سے ہم نکلے۔ یہ شپ یارڈ فرسک اسٹیڈ (Firskstad) نام کے جزے رے پر تھا جہاں پہنچنے کے لئے ہمیں دو تین جزیروں سے گزرنا پڑا تھا۔ بیچ میں سمندر والا حصہ پار کرنے کے لئے جزیروں کے درمیان لمبا سا پل تھا یا زمین دوز سرنگ (Tunnel) جس کے اوپر سمندر تھا جہاں سے جہاز گزر رہے تھے۔ واپسی پر بھی ہم انہی جزیروں سے ہوتے ہوئے الد یسنڈ جزے رے کی بندرگاہ میں پہنچے۔ تین چار جزیروں اور سمندر کو پار کرنے میں تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا۔ ہر جزے رے پر (اور سمندر کے کئی حصوں میں بھی) پہاڑوں کے سلسلے تھے جن کی چوٹیاں دودھ جیسی سفید برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ہر جزے رے اور ناروے کے کنارے پر بے شمار سمندری کینال نظر آئیں گے یعنی سمندر کا پانی ان نہروں کے ذریعے اندر تک آ جاتا ہے۔ ان نہروں کو یہاں کی زبان میں فیورڈ (Fjord) کہتے ہیں۔ ناروے فیورڈوں کا ملک کہلاتا ہے۔

مسٹر ڈرونین نے بتایا کہ وہ کسی زمانے میں میری طرح میرین انجینئر تھا اور جہاز چلاتا تھا۔ اس کے بعد اوسلو کے شپ یارڈ میں نیول آرکیٹیکٹ کی حیثیت سے جہاز سازی کا کام کیا اور اب اس سرکاری ادارے میں جہازوں کے سروے اور انسپکشن کا کام کرتا ہے۔ ”ناروے میں آئے ہوئے ملکی اور غیر ملکی جہازوں کا سلامتی کے نقطہ نگاہ سے چیک کرتا ہوں تاکہ جہاز کا مالک اپنے جہاز کو غیر محفوظ طریقے سے نہ چلائے اور مسافروں، جہاز رانوں اور سامان کو نقصان نہ پہنچے۔“

ڈرونین کو ایشیائی اور افریقی ممالک سے متعلق خاصی معلومات تھیں اور لگتا تھا کہ اس نے ان ملکوں کی طرف بہت Sail کیا ہے۔

”تمہیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ میرا بیٹا ایرانی ہے۔“ واپس آتے ہوئے راستے میں ایک جگہ ڈرونین نے بتایا۔

”سمجھ گیا۔ آپ نے کسی ایرانی بچے کو پالا ہے۔“ میں نے کہا۔

”جی ہاں۔ چار مہینے کا تھا اس وقت سے میرے پاس ہے۔“

ناروے اور سوئیڈن میں لوگوں کے بچے بہت کم ہوتے ہیں۔ ایک بچہ یا بہت زیادہ دو بچے۔ کئی لوگوں کی تو کوئی اولاد ہی نہیں ہے۔ بہت سارے لوگوں کو بچہ پالنے کا شوق ہوتا ہے تو اپنا پیدا کرنے کی بجائے فلپائن، ساؤتھ انڈیا، بنگلہ دیش، تھائی لینڈ جیسے ملکوں سے بچے لے آتے ہیں جہاں کے غریب ماں باپ زیادہ بچوں کی وجہ سے یا بیروزگاری

اور غربت کی وجہ سے اپنا بچہ ان امیر لوگوں کو یہ سوچ کر دے دیتے ہیں کہ کم از کم ان کی اولاد سکھ کی زندگی گزار سکے گی۔ ویتنام جے سے کئی ممالک میں جنگ کی وجہ سے یتیم ہونے والے بچوں کو ان ملکوں کی حکومت یا عالمی فلاحی ادارے ناروے اور سوئیڈن جے سے امیر ملکوں کے لوگوں کے حوالے کر دیتے ہیں کیونکہ ان ملکوں میں پالنے والے لوگوں سے زیادہ ذمہ داری وہاں کی حکومتوں کی رہتی ہے۔

غریب ملکوں کے لوگوں کا ان امیر لوگوں کو اپنے بچے دینے کی آفر اور اشتہار وغیرہ خطوط کی صورت میں یہاں کے دفاتر، کارخانوں اور ڈپارٹمنٹل اسٹوروں وغیرہ میں عموماً آتے رہتے ہیں۔ جس شپ یارڈ میں ہم پورا دن کام کر کے آئے تھے وہاں کے کینٹین کے نوٹس بورڈ پر بھی بھارت کے صوبے تامل ناڈو سے دو تین خط چسپاں تھے جن میں وہاں کے لوگوں نے ناروے کے امیر لوگوں کو ان سے بچے لینے کے لئے لکھا ہے۔ کچھ سال پہلے تھائی لینڈ کے محکمہ سیاحت کے حکام نے یورپ کے امیر لوگوں کے لئے یہ بھی آفر دی تھی کہ وہ تھائی لینڈ گھومنے آئیں اور شادی کے لئے کوئی لڑکی پسند آئے تو اپنے ساتھ لے جائیں اور اسے اپنے ملک کی قومیت دلوادیں۔ اس اسکیم کے تحت اسکینڈینیویا کے کئی لوگوں نے تھائی عورتوں سے شادی کی اور اسٹاک ہوم، کوپن ہیگن، مالمو، اوسلو جے سے شہروں میں آپ کو کئی مقامی مردوں کے ساتھ تھائی عورتیں نظر آئیں گی۔ اس طرح ایشیائی ملکوں کے بچے تو کئی شہروں میں نظر آئیں گے جن کو مقامی لوگوں نے پالا ہے اور چھوٹی عمر میں یہاں آنے کی وجہ سے وہ مقامی زبان بولتے ہیں اور اپنے پالنے والوں کو ہی اصل والدین سمجھتے ہیں۔

"میرا بیٹا شہنشاہ ایران کے دور حکومت میں مجھے ملا تھا۔" ڈرونین نے بتایا۔ "آج وہ 25 سال کا ہے اور ڈاکٹر بننے والا ہے۔ اسے مذہب سے بہت ہی لگاؤ ہے وہ بہت اچھا عیسائی ثابت ہوا ہے۔ گاؤں کے گرجا گھر کا اہم رکن ہے لیکن آج کل زیادہ پڑھائی کی وجہ سے دیگر چیزوں کو وقت نہیں دے پاتا۔"

"کیا آپ ایران میں رہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، میری سالی ایران کے کسی ہسپتال میں کام کرتی تھی اسے یہ بچہ کسی ریلوے اسٹیشن پر ملا تھا۔ یہ کسی غیر شادی شدہ لڑکی کو ہوا تھا اور وہ خوف اور بدنامی کی ڈر سے اسے اپنے گھر رکھنے کے بجائے صبح کی خاموشی میں ریلوے اسٹیشن پر چھوڑ گئی۔ میری سالی کو جے سے ہی اس لاوارث بچے کا پتہ چلا تو وہ بہت خوش ہوئی اور اس نے مے رے لئے قبول کر لیا۔ اسے معلوم تھا کہ ہمارے ہاں کوئی اولاد نہیں ہے۔ تقریباً چار مہینے یہ بچہ اس کے پاس ایران میں ہی رہا اس کے بعد جے سے ہی اس کا ناروے آنا ہوا تو بچے کو ہمارے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد آج تک وہ ہمارے ساتھ ہے۔ ایران میں شروع کے چند مہے نے رہائش کے دوران سب لوگ اسے رضا کہتے تھے لیکن یہاں آنے کے بعد ہم نے

اس کے اس نام کے آگے یہاں کا نام اولے (Ole) بھی لگا دیا ہے یعنی اب اس کا آدھا نام نارویجن ہے تو آدھا ایرانی زبان کا۔ اس طرح اب اس کا عیسائی نام "اولے رضا" ہے جو مسلم علی رضا سے کافی ملتا جلتا ہے۔"

ناروے میں تھائی اور فلپینو عورتیں

ناروے کا یہ شہر "الی سنڈ" بذات خود ایک چھوٹا سا گاؤں ہے اور ناروے کے تقریباً سارے پرانے گاؤں سمندر کے کنارے پر چھوٹی یا بڑی بندر گاہیں ہیں۔ خط استوا کے قریب والے سارے ایشیائی یا افریقی ممالک کی آبادی اور تہذیب دریاوں کے کنارے پر ملیں گی چاہے وہ دریائے نیل ہو یا دجلہ فرات، یا دریائے سندھ، کیونکہ انسان کو پانی کی تلاش میں دریاؤں کے پاس رہنا پڑا، وہیں پر جانوروں کو بھی آنا پڑتا تھا جن کا وہ شکار کر کے اپنا پیٹ بھرتے تھے اور وہیں پر کھیتی باڑی کرنا بھی ممکن تھا۔ سوئیڈن اور ناروے جے سے قطبی ممالک میں بارش کی وجہ سے انسان کہیں بھی رہ سکتا ہے لیکن سخت سردی کی وجہ سے کاشت کاری نہیں ہو سکتی اس لئے یہاں کے لوگوں کو مجبوراً سمندر کے کنارے پر رہنا پڑا تا کہ وہ خوراک کے لئے سمندر سے مچھلی پکڑ سکیں۔

ناروے کا کنارہ جزیروں اور سمندری کینال سے بھرا ہوا ہے جس کی وجہ سے جگہ جگہ پر چھوٹی بڑی قدرتی بندر گاہیں بن گئی ہیں۔ یہاں کے لوگ صدیوں سے اپنی چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سمندر میں دور تک مچھلی کا شکار کرنے کے لئے نکلتے رہے ہیں اور واپسی پر ان سمندری کینالوں کے ذریعے کنارے تک پہنچ جاتے ہیں۔

اس شہر الی سنڈ سے ذرا سا دور گہرے سمندر میں ہری عید (Hareid) نام کا ایک جزیرہ ہے۔ دور ہونے کی وجہ سے وہ الی سنڈ (Alesund) سے پل کے ذریعے نہیں ملا ہوا ہے۔ لوگ الی سنڈ سے اس جزیرے (ہری عید) تک فیریوں (چھوٹے بحری جہازوں) میں جاتے ہیں یا سمندر کے نیچے بنی ہوئی سرنگ (Tunnel) سے کار یا بس کے ذریعے جاتے ہیں۔ فیری یا بس دن میں پانچ چھ مرتبہ آتی جاتی ہے۔ ایک روز مجھے بھی فیری پر ہری عید جزیرے پر جانا پڑا جہاں سے مجھے براستہ سڑک قریب کے دو جزیروں گرسکن اورا لسٹن جانا تھا جہاں جہاز سازی کے کارخانے (Shipyard) ہیں۔ ان کارخانوں میں ایک ایک نیا جہاز بنا تھا جس کی کچھ مشینری چیک کرنی تھی۔

ساڑھے آٹھ بجے والی فیری سے میں الی سنڈ سے روانہ ہوا۔ بحری جہاز سمندر میں ابھرے ہوئے پہاڑوں اور جزیروں سے خود کو بچاتا ہوا آدھے گھنٹے کے بعد ہری عید جزیرے پر پہنچا جہاں پر پروگرام کے مطابق اس علاقے کے جہازوں

کا سرویئر اور نیول آرکیٹکٹ مسٹر نیریم میرا انتظار کر رہا تھا۔ خیر عافیت معلوم کرنے کے بعد وہ مجھے کار سے ان دو شپ یارڈز میں لے آیا جہاں مجھے نئے جہازوں کی مشینری کا معائنہ کرنا تھا۔ یہ دونوں شپ یارڈ الگ الگ جزیروں پر تھے اور ہری عید جزے رے کے قریب ہونے کی وجہ سے وہ سرنگ (Tunnel) کے ذرے ے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور ہمارے ساتھی میزبان مسٹر نیریم کا گھر ایک تیسرے جزے رے Fosnavag پر تھا جہاں پر وہ آخر میں چائے کے لئے لے گئے تھے۔

"یہاں جہازوں کا کام اتنا ہے کہ نہ میں چھٹی کرتا ہوں نہ ملک سے باہر گھومنے جاتا ہوں" نیریم نے بتایا۔ "لیکن اس سال، دو ہفتے کی چھٹی بیوی کے ساتھ ترکی میں گزارنا چاہتا ہوں۔"

اور پھر سگریٹ کا لمبا کش لگا کر بتایا۔ "ہم لوگ اپنی شادی کی پچیسویں سالگرہ منانے کے لئے جا رہے ہیں۔"

"پچیسویں؟" میں نے تعریف اور تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ نیریم نے ہنس کر جواب دیا۔ "جی ہاں' پچیسویں۔ واقعی بڑی بات ہے اس ملک میں ایک ہی بیوی کے ساتھ اتنا عرصہ گزارتا۔"

"آپ نے بالکل درست کہا۔" میں نے دادا دے نے کی خاطر اس کی پیٹھ ٹھونکی۔ "آپ کے ملک میں تو کسی کی ایک سال شادی چلتی ہے تو بھی بڑی بات سمجھی جاتی ہے۔ سوئیڈن کے جس شہر مالمو سے میرا تعلق ہے وہاں گزشتہ سال جتنی شادیاں ہوئیں اس سے زیادہ طلاق کے کیس رجسٹرڈ ہوئے۔"

نیریم کی کار میں ایک جزے رے پر سے گزر رہے تھے تو ایک کالے رنگ کی ایشیائی عورت کو ہاتھ میں پتیلا تھامے سڑک پار کرتے ہوئے دیکھا۔ گوروں کے ملک میں وہ بھی ایک چھوٹے خاموش اور دور دراز جزے رے پر ایک اپنے جے سے ایشیائی کالے کو دیکھ کر بہت تعجب ہوا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے شاہ پنجو یا چوہڑ جمالی جے سے سندھ کے گاؤں میں کوئی انگریز عورت کو لکڑیاں کاٹتے یا بھینسیں چراتے دیکھ لے۔ نیریم نے بتایا کہ یہ عورت سری لنکا کی تامل ہے۔

"یہاں اس جزیرے پر پچاس کے قریب تامل اور کچھ کرد خاندان آباد ہیں۔ یہ لوگ چوری چھپے کشتیوں کے ذرے ے ناروے پہنچے تھے۔ ایک آدھ سال کافی ہنگامہ رہا مگر بعد میں حکومت نے ان کو اس ایک جزیرے پر لا چھوڑا۔ بڑے شہروں میں ہمارے نارویجن لوگ دوسرے ملکوں خصوصاً ایشیا اور افریقہ کے مہاجرین کو برداشت نہیں کرتے۔ ان تامل اور کرد لوگوں کو اس جزیرے پر آئے ہوئے کوئی پانچ سال ہو چکے ہیں مگر اس کے باوجود اس جزے رے کے چند لوفر نارویجن لڑکے چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے ہیں۔ ایک دن تو ایک مہاجر کے گھر میں کسی نے آگ تک لگا دی تھی لیکن اے سے خراب لوگ بہت کم ہیں، زیادہ تر اچھے لوگ ہیں جو ان پر دیسیوں کی مدد کرتے رہتے ہیں۔"

ایک دوسرے جزیرے پر سے گزرتے ہوئے ایک گھر کے باہر لگے ہوئے بورڈ پر "Asian Food" لکھا ہوا تھا۔ مے رے ساتھی نیریم نے بتایا کہ اس گھر میں ایک فلپینہ نو عورت رہتی ہے جو ایشیا کے کھانے مثلاً چاول، نوڈل، می (Mee) مچھلی وغیرہ پکا کر فروخت کرتی ہے۔ وہ یہ چیزیں اتنی لذیذ بناتی ہے کہ یہاں رہنے والے ایشیا کے لوگوں کے علاوہ ہم نارویجن بھی خرید کر کھاتے ہیں۔"

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" میں نے نیریم سے کہا۔ "کرد، تامل، عراقی، ایرانی وغیرہ تو اپنے ملکوں میں سیاسی ہنگاموں اور ظلم کی وجہ سے بھاگ کر یہاں آئے اور سیاسی پناہ حاصل کی ہے مگر یہ فلپائن کے لوگ جو سارے سوئیڈن اور ناروے میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں، یہاں پر کس بنیاد پر آئے اور قومیت حاصل کی؟"

"ہمارے لوگ فلپائن میں جا کر ان سے شادی رچا کر یہاں لے آئے ہیں۔ یہاں ناروے میں یہ مشہور ہے کہ فلپائن اور تھائی لینڈ جے سے ملکوں کی عورتیں غریب، محنتی، حکم ماننے والی ہوتی ہیں اور جلدی ہی ہماری ثقافت اور مذہب میں رچ بس جاتی ہیں اور ہمارے زیادہ تر لوگ ان کے ساتھ خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

"مہمان۔ پرندوں" کو کھا جاتے ہیں

ناروے میں مقامی سرویئر مسٹر نیریم کے ساتھ جہاز کے عرشے پر جہاز کی مختلف چیزوں کے معائنے کے دوران میری خیریت دریافت کی۔

"چیف صاحب! ناروے کی سردی کیسی محسوس ہو رہی ہے؟"

مسٹر نیریم کے سوال کا جواب دینے کے لئے میں نے منہ سے مفلر ہٹایا اور کہا۔ "نیریم آپ کا سوال اگر رسمی ہے تو اس کا جواب یہی ہے کہ بھئی بہت سردی ہے آپ کے ناروے میں۔ اگر آپ یہ سوال معلومات حاصل کرنے کے لئے کر رہے ہیں تو آپ کو میں اتنا بتادوں کہ جتنی یہاں ناروے میں سردی ہونی چاہیے اتنی نہیں ہے۔ آپ ہر سال یہیں گزارتے ہیں اس لئے ہو سکتا ہے آپ وہ فرق محسوس نہ کرتے ہوں جو مجھے دس پندرہ برس بعد یہاں آنے پر محسوس ہو رہا ہے۔ 70ء کے عشرے میں جب ہم لوگ جہازوں کو اس عرض بلد (Latitude) کی بندرگاہوں میں لے کر آتے تھے تو مارے سردی کے ہمارا برا حشر ہو جاتا تھا حالانکہ ان دنوں مین ہم جوان تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ زمین کا یہ گولا واقعی گرم ہو رہا ہے؟ یہ دنیا Global Warming کے لپیٹ میں آرہی ہو!"

"کچھ کہا نہیں جاسکتا۔" نیریم نے کہا۔ "پچھلے ایک دو برس سے موسم کی یہ تبدیلی ہم بھی محسوس کر رہے ہیں۔"

"پاکستان میں موسم گرم میں دن میں بہت گرمی پڑتی ہے۔" میں نے نارویجن سرویئر نیریم کو بتایا۔ "مگر پچھلے سال اور بھی شدید گرمی پڑی تھی اور اس دفع موسم خزاں بھی کوئی خاص نہیں رہا۔ اللہ خیر کرے۔" میں نے تشویش کا اظہار کیا۔

"یہاں بھی پچھلے سال اور اس سال کوئی خاص سردی نہیں رہی۔" نیریم نے کہا۔ پھر سگریٹ کا ایک لمبا سا کش لگا کر کہا۔ "سردی کی کمی کی وجہ سے ہم ناروے کے لوگ بہت خوش رہے۔" جملہ پورا کرتے ہی اس کے ذہن میں بات آگئی کہ وہ اس سے مخاطب ہے جس کا تعلق قطب شمال کے ٹھنڈے ملکوں کی بجائے خط استوا کے گرم ممالک سے ہے۔ اس نے مجھے ایکدم گلے لگا کر کہا۔ "اوہ نو! نو! آئی ایم سوری! یہاں بے شک سخت سردی رہے ورنہ آپ کے

پاکستان جے سے ملکوں میں موسم خزاں میں بھی گرمی ہو گی۔ سردی کے بڑھ جانے کا مقابلہ ایک مزید سویٹر پہن کر کیا جاسکتا ہے مگر گرمی کے بڑھنے کا مقابلہ انسان کے سے کر سکتا ہے؟"

بہر حال اس کی اس نیک سوچ پر میں نے اس کا شکریہ ادا کیا مگر مے رے دل میں یہ احساس پیدا ہوا کہ یہاں کے لوگوں کو زمین کے گرم ہونے کی کیا پرواہ، ان کے لئے تو اچھا ہی ہے۔ اس کے باوجود ان لوگوں کی سوچ قابل تعریف ہے کہ زمین کے گرم ہونے کی ان لوگوں کو ہم سے بھی زیادہ فکر ہے بلکہ آنے والے خدشات سے یہی لوگ ہمیں خبر دار کر رہے ہیں کہ درختوں کی کٹائی بند کرو۔ دھواں پیدا کرنے والی چیزوں کو استعمال مین نہ لاؤ، صفائی کا خیال رکھو زیادہ سے زیادہ درخت اگاؤ۔ لیکن ہم لوگ ابھی تک درختوں کی کٹائی کرتے چلے آرہے ہیں۔

ناروے کی اہم چیز یہاں کے پہاڑ ہیں جہاں پر ان دنوں میں افریقہ اور جنوبی یورپ سے نقل مکانی کرنے والے ہزاروں خوبصورت پرندے انڈے دے تے اور بچے پیدا کرتے ہیں۔ ایک اے سے پہاڑ کے پاس نیریم کشتی میں لے آیا۔ لاکھوں کی تعداد میں پرندے پہاڑ کے قدموں سے لے کر چوٹی تک چپکے ہوئے تھے اور ان کے بولنے کی آوازیں دور دور تک پہنچ رہی تھی۔ تقریباً ہر پرندے کا منہ کھلا ہوا تھا اور زور زور سے چیخ رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ اپنی باتیں کس کو سنا رہے تھے شاید ہم جے سے آئے ہوئے کئی سیاحوں کو جو اُن کی تصاویر بنانے میں مشغول تھے۔

نیریم نے کہا۔ "یہ نقل مکانی کرنے والے (Migratory) پرندے ہمارے مہمان ہیں جنہیں ہم عزت کی نگاہ سے دے کھتے ہیں۔ یہ ہمارے ملک میں ہر سال صرف چند مہے نے ٹھہر کر چلے جاتے ہیں۔ ہم ان کو مختلف قسم کے دانے کھلاتے رہتے ہیں تا کہ یہ خود اور ان کے ننھے ننھے بچے بھوک سے نہ مریں۔" یہ کہہ کر اس نے سگریٹ کا کش لگایا اور مجھ سے پوچھا۔ "آپ کے پاس کسی اور ملک کے پرندے آتے ہیں؟"

"جی ہاں۔ موسم خزاں میں روس اور وسط ایشیا سے ہمارے ملک میں کونجیں، تلور اور کئی قسموں کی بطخیں آتی رہتی ہیں۔" میں نے نیریم کو بتایا اور پھر دل ہی دل میں کہا۔ "اور ہم لوگ ان کو مختلف دانے کھلانے کے بجائے مختلف طریقوں سے ان کو پکڑ کر خود کھالے تے ہیں یا بڑے افسران اور عرب شیوخ کی خوشامد کے لئے ان کو شکار کی دعوت دے تے ہیں۔"

ناروے

ناروے شاید انگریزی کے لفظ Way Northern سے نکلا ہے۔ ناروے سارے ممالک کے شمال میں واقع ہے۔ یہاں کی نارویجن زبان میں ناروے کو Norge کہتے ہیں جیسے جاپان کو مقامی لوگ نپان اور جارڈن کو اردن کہتے ہیں۔ ناروے کا رقبہ تقریباً سوا لاکھ مربع میل ہے۔ (یعنی تین لاکھ مربع کلومیٹر) پاکستان کا رقبہ تقریباً ساڑھے سات لاکھ مربع کلومیٹر ہے۔ پاکستان کو اس وقت مردم شماری تقریباً 125 ملین ہے اور ناروے کی صرف پانچ ملین ہے۔ پورا ناروے پہاڑی علاقہ ہے۔ چاروں طرف سمندر ہے سوائے مشرق کے جہاں سوئیڈن اور فن لینڈ ہے۔ یہ تینوں ممالک اور ڈنمارک اسکینڈی نیویا کے ممالک کہلاتے ہیں۔

ناروے کی نصف آبادی اس کی دارالحکومت اوسلو کے ارد گرد رہتی ہے جو کافی جنوب میں ہے۔ ناروے کے شمالی حصوں میں تو جون جولائی کے مہینوں میں بھی سخت سردی ہوتی ہے۔ ساحل سمندر ہموار ہونے کی بجائے جگہ جگہ ڈیلٹا کی طرح ہے۔ کوئی بھی دریا جب سمندر میں جا کر گرتا ہے تو اس کا آخری حصہ کئی حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ دریا کی یہ شاخیں ڈیلٹا کہلاتی ہیں۔ یہاں ناروے میں دریا کی بجائے سمندر سے چینل نکل کر اندر زمین کی طرف چلے جاتے ہیں جن میں سمندر کا کھارا پانی رہتا ہے۔ ان چینلوں کو فیورڈ (Fjord) کہتے ہیں۔ نارویجن زبان میں انگریزی کے حروف j کو Y پڑھا جاتا ہے اس لئے ناروے کے لوگ جانسن کو یانسن پڑھتے ہیں۔ جاپان کو یاپان اور لکھتے وقت

یوگوسلاویا کو جوگوسلاویا لکھتے ہیں۔ بہر حال پورا ناروے فیورڈوں سے بھرا ہوا ہے اور ان سمندری کینالوں کی وجہ سے کئی جزیرے بن گئے ہیں۔ انڈونیشیا اور فلپائن میں تو ہزار دو ہزار جزے رے ہیں لیکن یہاں پچاس ہزار سے زیادہ ہیں اور یہ سب کے سب دنیا کے نقشے میں موجود ہیں اور پیائش کردہ ہیں تاکہ جہاز یا کشتی والوں کو آسانی رہے (باقی پٹواری اور مختیار کار یا تحصیلدار اپنا سر پیٹتے ہوں گے)

ناروے، رہنے والوں کے لئے کوئی جنت نہیں ہے۔ کم از کم ایک صدی قبل تک تو بالکل نہیں تھا۔ پورا ملک پہاڑوں کا علاقہ ہونے کی وجہ سے گھر میں کوئی پودا رکھنے کے لئے گملے کے ساتھ مٹی بھی سپر مارکیٹ سے کلو کے حساب سے خریدنی پڑتی ہے۔ پورا سال سخت سردی رہتی ہے۔ سال کا آدھا حصہ لمبی راتیں ہونے کی وجہ سے اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ ایسے حالات میں کیا کھیتی باڑی ہو سکتی ہے، کونسی گائے بکری دودھ کے لئے پالی جا سکتی ہے۔ اس لئے ناروے والوں کا انحصار دوسرے ممالک پر ہوتا ہے۔ شروع کے زمانے میں تو یہاں کے جہازراں جو وائیکنگ (Vikings) کہلاتے تھے اپنی کشتیوں میں انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ اور یورپ کے دوسرے جنوبی ملکوں میں جا کر لوٹ کھسوٹ کر آتے تھے۔ یعنی ڈاکے ڈالنا یا چوری کرنا ان کا پیشہ تھا۔ لڑکا تب جوان اور شادی کے قابل سمجھا جاتا تھا جب وہ اکے لے یا دوستوں کے ساتھ جرمنی یا فرانس کے ساحل پر جا کر وہاں کے لوگوں سے لڑ جھگڑ کر کھانے پینے اور پہننے کی چیزیں لوٹ لاتا۔ فرانس، جرمنی، اسپین تو کیا یہ لوگ کینیڈا، امریکہ تک جا پہنچتے تھے۔ کولمبس غریب تو پانچ سو سال بعد میں امریکہ پہنچا تھا، وہ بھی راستہ بھول کر (جانا اسے انڈونیشیا کی طرف تھا) پرانے وقتوں میں ہر چیز اچھی لگتی تھی اور انسان کو غلطیاں بھی ہیرو بنا دیتی تھیں۔ آج کے دور میں مقررہ بندرگاہ تک پہنچنے میں بارہ دن کے سفر میں دو گھنٹے کی تاخیر ہوتی ہے تو اس کے لئے بھی ہیڈ آفس سے اظہار وجوہ کا نوٹس جاری ہو جاتا ہے اور آدمی پوری مرچنٹ مین بدنام ہو جاتا ہے۔

بہر حال بات ناروے کے ان جہاز رانوں Vikings کی ہو رہی تھی جن کو یہاں کے مقامی لوگ تو آج بھی فخر سے ہیرو اور بہترین نیوی گیٹر کہتے ہیں لیکن انگریز، اسکاٹ، جرمن، فرانسیسی وغیرہ ان کو ڈاکو (Plunderer) کہتے ہیں۔ جرمن لوگ صدیوں تک دعاؤں میں ان کے حملے سے پناہ مانگتے رہے۔ عورتیں اپنے شریر بچوں کو جن بھوتوں کی بجائے ان وائیکنگ کا نام لے کر ڈراتی تھیں۔ آج بھی ناروے والوں کا گزر بسر ماہی گیری پر ہے۔

مچھلی کے علاوہ ناروے کے لوگوں کی کمائی جہاز سازی اور مشینری سے ہے۔ برگن (Bergen) انجن اور Jotun جیسی رنگ کی دنیا بھر میں مشہور کمپنیاں ناروے کی ہیں۔ کچھ عرصے سے ناروے میں تیل نکل آنے کی وجہ سے بھی بڑی خوشحالی آگئی ہے۔

یورپ کے خانہ بدوش کون ہیں؟

ناروے کے دارالحکومت اوسلو میں کچھ دن گزارنے کے بعد اب مجھے بذریعہ ریل گاڑی اسٹاک ہوم (سوئیڈن) واپس جانا تھا۔ اوسلو کے ریلوے اسٹیشن پر میں وقت سے کافی پہلے پہنچ گیا تھا۔ پلیٹ فارم پر بڑی تعداد ناروے اور سوئیڈن کے لوگوں کی تھی۔ کچھ افریقی ملکوں کے حبشی، عرب اور کئی ایشیائی لوگ بھی تھے جن میں کچھ تو یہاں کی مقامی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طالب علم تھے جب کہ باقی لوگ پناہ گزین تھے جنہوں نے مختلف ادوار میں یہاں آکر سیاسی پناہ حاصل کی تھی یا کام کے بہانے یہاں آکر یہاں کی شہریت حاصل کرلی تھی۔ یہ کہنا تو بعید از قیاس ہو گا کہ ان میں کوئی سیاح بھی تھے۔ افریقہ اور ایشیا کا کون ایسا بے وقوف ہو گا جو سیر و سیاحت کے لئے ایشیائی، افریقی یا یورپ کے فرانس، اسپین، اٹلی، انگلینڈ جے سے ممالک چھوڑ کر ناروے، سوئیڈن یا فن لینڈ

جے سے سرد ممالک میں گھومنے کے لئے آئے گا جہاں سخت سردی اور مقامی لوگوں کی حد سے زیادہ احساس برتری کی وجہ سے افریقہ اور ایشیا کے لوگ ہر وقت نزلہ، زکام اور نفسیاتی امراض میں مبتلا رہتے ہیں۔

میں وقت گزارنے کی خاطر رے لوے اسٹیشن میں موجود ایک دکان سے چائے لے کر پینے لگا۔ گاڑی آنے میں ابھی بھی ایک گھنٹے سے زیادہ وقت باقی تھا۔ مجھے اپنے نارویجن جہاز ران دوست کا بھی انتظار تھا جسے میرے ساتھ اسٹاک ہوم جانا تھا۔ جب تک وہ آئے اور ہم دنیا بھر کے بحری جہازوں اور سمندروں کی بور باتیں شروع کریں تب تک میں رے لوے اسٹیشن پر موجود لوگوں کے چہرے اور ان کے رنگارنگ کپڑے دیکھنے اور ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ ناروے اور ڈنمارک میں ایک بات مشترکہ ہے کہ ان ملکوں کے ہوائی اڈوں اور بڑے بڑے رے لوے اسٹیشنوں پر جھاڑو دینے اور ٹوائلٹ صاف کرنے والے آپ کو اکثر پاکستانی نظر آئیں گے۔ اے سے ایک عدد مرد اور عورت سے مختصر سا انٹرویو لے کر چائے والے عرب دکاندار سے ناروے کی بچی ہوی کرنسی تبدیل کرائی۔ اتنے میں کچھ نوجوان عورتیں جن کے بال کھلے ہوئے تھے اور جسم پر راجستھانی طرز کی پوشاک تھی (ایک دو جینز اور اسکرٹس میں بھی تھیں) آکر مے رے قریب والے صوفوں پر بیٹھ گئیں۔ یہ عورتیں اوسلو کی کسی یونیورسٹی کی طالبات تھیں جن کا تعلق بنگلہ دیش اور بھارت سے تھا اور اس وقت قریب کے کسی شہر میں ہونے والے ثقافتی شو میں حصہ لینے کے لئے ٹرین سے جارہی تھیں۔ میں ان سے باتوں میں مصروف تھا کہ اتنے میں میرا نارویجن ساتھی آپہنچا اور میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

"کیا یہ عورتیں خانہ بدوش ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں بھائی یہ خانہ بدوش نہیں بلکہ تعلیم یافتہ ہیں،" میں نے اپنے مقامی نارویجن ساتھی کو بتایا، "ان میں سے کچھ بنگلہ دیش کی ہیں تو کچھ بھارت کی۔ آپ نے ان کو خانہ بدوش کے سے سمجھ لیا؟"

"ان کے لمبے اور بکھرے بالوں، چہرے کے خدوخال اور رنگ سے۔" اس نے جواب دیا۔

سوئیڈن میں جہاں ہم رہتے تھے اس محلے کے پارک میں کبھی کبھی اتوار کو کچھ موٹی عورتیں اور لڑکیاں جمع ہو جاتی تھیں اور ڈھولک پر اپنی مخصوص زبان میں گانے گا کر بھیک مانگتی تھیں۔ وہاں رہنے والے ایک مقامی سوئیڈش باشندے نے بتایا کہ یہ لوگ خانہ بدوش ہیں جو رومانیہ، بلغاریہ اور ہنگری جے سے غریب ممالک سے یہاں آتے ہیں اور پھر رازدارانہ انداز میں کہا۔ "ان سے خبردار رہنا یہ لوگ چوریاں بھی کرتے ہیں"

یہ لوگ نہ ہم جے سے زیادہ کالے تھے نہ شمالی یورپ کے مقامی لوگوں کی طرح گورے تھے، بس الجیرین، ٹونیشین یا اطالوی لوگوں جیسا ان کا رنگ تھا۔ کچھ کچھ ہنزا اور گلگت جے سے علاقوں کے دیہاتی لوگوں سے بھی مل رہے تھے۔ کپڑے اور بالوں کا انداز بھی ان سے کافی مل رہا تھا۔

سوئیڈن وہ ملک ہے جہاں آپ ذاتی نوکر نہیں رکھ سکتے۔ آپ بیمار ہیں تو اسپتال داخل ہو جائیں جہاں اسپتال کی نرسیں آپ کی خدمت کریں گی۔ آپ بوڑھے اور اکے لے ہیں تو بوڑھے لوگوں کے ہاسٹل میں رہائش اختیار کر لیں جہاں اسپتال کی طرح حکومت کی طرف سے ضروریات زندگی یعنی کھانا پینا، رہائش اور پہننے کو کپڑے مفت میں ملتے رہیں گے۔ ہمارے ایک عرب دوست جو ان دنوں سوئیڈن مین تھے اس کے پانچ بچے تھے۔ گھر کے کام میں مدد کرنے کے لئے اس کی بیوی اپنے ملک سے ایک عدد نوکرانی لے آئی تھی لیکن آخر تک سب کو یہی بتاتے رہے کہ وہ اس کی بہن ہے۔

اس طرح سوئیڈن میں ایک مراکش کے دوست کے گھر میں ایک لمبے بالوں والی عورت ہر اتوار کو آکر صفائی اور کپڑے دھونے کا کام کرتی تھی۔ مراکشی دوست کی بیوی پولش (پولینڈ کی رہنے والی) تھی جس سے یہ گھر کی صفائی کرنے والی عورت پولش زبان میں بات کرتی تھی۔ ایک دن مے رے پوچھنے پر مے رے مراکشی دوست نے بتایا کہ یہ کام کرنے والی غریب عورت جپسی ہے۔ پولینڈ سے نقل مکانی کر کے یہاں سوئیڈن میں رہائش اختیار کی ہے مگر غیر قانونی طرح آنے کی وجہ سے اس کے کاغذات تیار نہیں ہو پا رہے ہیں اس لئے اس کو کسی دفتر یا کارخانے میں نوکری مل سکتی ہے اور نہ ہی بیروزگاری الاؤنس۔ یہاں جو اس کے ہم وطن (پولش) رہتے ہیں ان کے گھروں میں چوری چھپے کام کر کے گزارا کرتی ہے۔

"جپسی لوگ اصل میں کس ملک کے ہیں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم لیکن سارے یورپ میں نظر آتے ہیں۔ بدوؤں کی طرح روزگار کی تلاش میں ادھر ادھر پھرتے نظر آتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں۔ ہر ایک ان کو چور سمجھتا ہے۔ غریب بیچارے!" اس نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

سوئیڈن میں ہمارے اوپر والے فلیٹ مین ایک پولش خاتون رہتی تھی جو کسی امپورٹ ایکسپورٹ کے دفتر میں کام کرتی تھی۔ ایک دن اس کے دفتر کا ایک آدمی اس کے فلیٹ کے بجائے ہمارے فلیٹ میں پہنچ گیا۔ شکل سے ہم جیسا پاکستانی یا بھارتی لگ رہا تھا۔ سوئیڈش زبان میں غلطی کا اظہار کر کے جانے والا تھا تو میں نے اس سے اس کی شناخت پوچھی۔

"بھارتی سکھ ہوں۔" اس نے بتایا۔

"پھر تو آپ کو ہندی اور پنجابی ضرور آتی ہو گی؟" میں نے سوال کیا۔

اس کے انکار کرنے پر مجھے کافی حیرت ہوئی اور اس بات پر بھی تعجب ہوا کہ یہ بغیر داڑھی کے تھے۔

"آپ کے سے سکھ ہیں؟" میرے منہ سے نکل گیا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ میرے دادا پر دادا ہزاروں سال قبل بھارت سے یہاں آئے تھے" اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بتایا کیونکہ وہ صرف سوئیڈش زبان سے واقف تھا۔

"کمال ہے!" میں حیرت میں پڑ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ کون ہے اور کیا اوٹ پٹانگ بات کر رہا ہے۔ برصغیر کے لوگوں کا یورپ سے واسطہ انگریزوں کے آنے کے بعد ہوا ہے۔ اس سے پہلے چند گجراتی اور سندھ سے سندھی ہندو (سیٹھ ناؤں مل جے سے) جن کا بیوپار سے تعلق تھا باہر نکلے تھے لیکن وہ بھی مغرب میں بغداد، بصرے تک اور مشرق میں جاوا، سماٹرا تک۔ نہ جانے یہ کن ایشیائی لوگوں کی بات کر رہا ہے جو آج سے کوئی ہزار سال قبل یورپ پہنچے تھے!

مجھے تعجب میں دے کھ کر اس نے کہا:

"میں جپسی ہوں۔ تمہیں معلوم ہے جپسی کون ہوتے ہیں؟"

اس کے بعد وہ کچھ الفاظ بتانے لگا جن میں سے کوئی ایک دو پنجابی یا ہندی کے لگ رہے تھے یا شاید سنسکرت کے ہوں۔ میں ایک بھی سمجھ نہ پایا۔ میں تو یہی سوچتا رہا کہ یہ مخلوق کہاں کی ہے۔

اسی طرح ایک دفعہ کوپن ہیگن کی سپر مارکیٹ میں دو نوجوان ملے جو شکل و صورت سے ہمارے ہی علاقے کے لگ رہے تھے "Are you Indians?" میں نے پوچھا۔

"Yes. But we are Gypsies." انہوں نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

اس پر ان میں سے ایک گنتی سنانے لگا جو کچھ پنجابی یا سرائیکی اسٹائل میں تھی۔ ایک دو الفاظ سندھی سے بھی مل رہے تھے یا شاید کسی اور زبان کے ہوں اور ان کا مطلب کچھ اور ہو۔

"آپ اُردو یا ہندی میں بات کر سکتے ہیں؟" میں نے ان سے انگریزی میں پوچھا۔

"سینکڑوں سال گذرنے کی وجہ سے ہماری زبان میں تبدیلی آچکی ہے لیکن اور یخنلی ہم انڈین ہیں۔" انہوں نے بتایا۔

میرے لئے یہ بیحد عجیب سے باتیں تھیں۔ پچھلی چوتھائی صدی سے زیادہ یورپ کے کئی شہروں میں، میں ان جپسی مرد اور عورتوں کو مجمع لگا کر ناچتے یا بھیک مانگتے دے کھتا چلا آرہا تھا میں ان کو یورپ کے دور دراز دیہات کے لوگ سمجھتا تھا۔ جے سے سندھ میں ہندو عورتیں لمبے اور شوخ رنگوں کے اسکرٹ پہن کر شہروں میں بھیک مانگتی ہیں یا ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں بیچتی ہیں۔ لیکن اب سوئیڈن میں مستقل رہائش کے دوران ان جپسی سے یہ سن کر تعجب ہوا کہ ان کا تعلق برصغیر سے ہے۔ لیکن کوئی بھی اطمینان بخش جواب نہیں دے پا رہا تھا کہ یہ جپسی (جن کو Roma بھی کہتے ہیں) کہاں سے اور کب یورپ آئے اور یہ لوگ یورپ کے تو تقریباً ہر ملک میں نظر آتے ہیں لیکن ترکی سے لے کر تائیوان تک کہیں بھی نظر نہیں آئے۔

کچھ دن ہوئے یورپ کے ان خانہ بدوشوں پر نیوز ویک میں ایک بہت دلچسپ اور تحقیقی مضمون آیا جس سے معلوم ہوا کہ یورپ کے یہ جپسی (روما) واقعی تقریباً ایک ہزار برس قبل بھارتی پنجاب سے نقل مکانی کر کے یورپ تک پہنچے تھے۔ ان لوگوں کا تعلق کسی نچلی ذات سے تھا۔ بھارت سے نکلنے کے بعد یہ لوگ تقریباً چار سو برس وسط روس اور بلقانی ریاستوں میں دربدر بھٹکتے رہے۔ اس کے بعد جب یہ یورپ کی سرزمین پر پہنچے تو یہاں کے لوگ انہیں مصری سمجھ کر ایجپشن (Egyptian) کہنے لگے جو لفظ بعد میں جپسی (Gypsy) بن گیا۔ ان جپسیوں کی بڑی تعداد نے شروع شروع میں رومانیہ میں رہائش اختیار کی اس لئے یہ لوگ یورپ میں رومانی یا صرف روما (Roma) بھی کہلانے لگے۔

ان جپسیوں کی شکل ہم ایشیائی باشندوں سے کافی ملتی جلتی ہے مگر رنگ میں کئی لوگ ہم سے گورے ہیں شاید اتنی صدیاں یورپ کے سرد ملکوں میں رہنے سے ان کا رنگ نکھر آیا ہے یا ہو سکتا ہے یہ لوگ شروع سے گورے ہوں آخر آج بھی تو ہمارے شمالی علاقہ جات کے لوگ (پٹھان، افغان) بھی تو یورپی لوگوں کی طرح گورے ہیں۔ ان جپسیوں میں کچھ لوگوں کا چہرہ سردے کی طرح لمبا ہے۔ کچھ جپسی تو بہت خوبصورت ہیں خصوصاً ان کی لڑکیاں۔

جپسیوں کے لئے کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ رومانیہ میں امیر زمینداروں کے پاس غلاموں کی صورت میں رہے جن کے پاس انہوں نے نچلے درجے کے کام کئے۔ گھر، گلیاں صاف کرنا، کھیتی باڑی کرنا، گائیں بھیڑیں چرانا، کتوں کی نگہبانی کرنا وغیرہ اور پھر جب سنہ 1850ء میں غلامی پر پابندی عائد کی گئی تو یہ لوگ رومانیہ چھوڑ کر یورپ کے دوسرے ممالک کی طرف نکل پڑے۔

پورے یورپ میں جپسیوں کو آج بھی نچلی ذات سمجھا جاتا ہے لیکن ان جپسیوں کی آپس میں بھی درجہ بندی ہے جو ان کے کام کے مطابق مثلاً گانے بجانے والے اور زیورات بنانے والے اعلیٰ ذات کے سمجھے جاتے ہیں۔ اس کے بعد پھول بیچنے والے، جانور پالنے والے، ریچھوں کا کرتب دکھانے والے اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں بھٹکنے والے ہیں۔ سارے یورپ میں ان کی تعداد ایک کروڑ (دس ملین) ہو گی۔ یہ لوگ جس ملک میں رہتے ہیں اس کی زبان سیکھتے ہیں لیکن آپس میں اپنی زبان رومانی میں بات چیت کرتے ہیں جو کہا جاتا ہے کہ ہندی، سنسکرت، پنجابی اور یورپی زبانوں کا ملغوبہ ہے۔

فن لینڈ اور تھائی لینڈ میں فرق

ہیلسنکی (فن لینڈ) میری ٹائم ایڈمنسٹریشن کی طرف سے ہم جہاز رانی سے وابستہ لوگوں کو ہیلسنکی میں چند ہفتے رہ کر ان کے میری ٹائم ادارے کے کام کا طریقہ کار سمجھنا تھا۔ ڈنمارک، سوئیڈن اور ناروے کی طرح فن لینڈ بھی اسکینڈی نیویا کا ملک ہے۔ ہیلسنکی اس کی بہت بڑی بندر گاہ اور دارالحکومت بھی ہے۔ تعلیمی اداروں اور جہاز سازی کے کارخانوں کی وجہ سے ہیلسنکی انتہائی اہم شہر ہے۔

ہیلسنکی ائیر پورٹ پر مے رے ساتھ اسی طیارے سے تھائی لینڈ کی بحریہ کے کمانڈر سوتی بھی اترے۔ سوتی کے ساتھ میں ناروے میں بھی رہ چکا تھا۔

"سوتی! تمہیں ساتھ دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی، کھانے کا مسئلہ حل ہو گیا۔" سوتی کو جہاز میں دیکھ کر میں نے اس سے کہا۔

"اور میری انگریزی کا مسئلہ حل ہو گیا۔ میری طرف سے بولنے اور لکھنے کا کام آپ کے حوالے۔" سوتی نے کہا۔ سوتی کی انگریزی بہت ہی کمزور ہے اس نے یہاں یورپ میں آکر تھوڑی بہت انگریزی سیکھی تھی۔ اپنے ملک کے اسکول اور کالجوں میں کبھی نہیں پڑھی تھی۔

امیگریشن اور کسٹم سے آزاد ہو کر ائیر پورٹ سے باہر نکلے تو کیپٹن پیکا کو استقبال کے لئے منتظر پایا۔ کیپٹن پیکا (پورا نام Pekka korhonen) مقامی میری ٹائم ایڈمن کے افسر ہیں۔ کئی مرتبہ پاکستان بھی آچکے ہیں۔ دوسرے فنس (فن لینڈ کے لوگوں) کی طرح ان کو بھی پہچاننا مشکل ہے کیونکہ ہم جیسے باہر کے لوگوں کو، اسکینڈی نیویا کے ملکوں کے سارے لوگ ایک جے سے لگتے ہیں۔ البتہ بعض ناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نارویجن ہے اور یہ سوئیڈ۔ جے سے اللہ ودھایو کسی سندھی کا ہی نام ہو سکتا ہے اور اللہ دتہ کسی پنجابی کا شیر گل پٹھان کا۔

ہیلسنکی کے ائیر پورٹ وانتا (Vantaa) سے شہر تقریباً بیس میل دور ہے راستے میں کیپٹن پیکا نے بتایا کہ ہم دونوں کی رہائش کا بندوبست ایک ہی ہوٹل میں ہے اور کمرے میں چھوٹا سا کچن بھی ہے تاکہ ہم جب چاہیں اپنے ملک کی کوئی ڈش بنا سکیں۔ روزانہ کیپٹن پیکا کے ساتھ دفتر یا جہاز پر جا کر کام دیکھنا ہو گا۔ پیکا کی انگریزی اچھی تھی لیکن فن لینڈ کے دوسرے لوگوں کی طرح کیپٹن پیکا بھی انگریزی کے بعض حروف کی درست ادائیگی نہیں کر پاتا تھا جے سے عرب لوگ P کو B بولتے ہیں یعنی پاکستان کو باکستان کہتے ہیں اسی طرح فن لینڈ کے لوگ TH (تھ) کو D بولتے ہیں۔ تھینک یو کو ڈینک یو کہیں گے۔ ہمارا تھائی دوست وے سے ہی انگریزی میں بات کرتے ہوئے شرما رہا تھا بہر حال اس کے اس سوال پر کہ

"?How old are you"

کیپٹن پیکا نے فوراً جواب دیا۔

"I am dirty" (میں بہت گندا ہوں)

اور پھر سگریٹ کا لمبا کش لگا کر سوتی کی طرف مڑ کر کہا۔

And my wife is also dirty

سوتی ہکا بکا رہ گیا اور حیرت سے میری طرف دے کھنے لگا تو میں نے تین مرتبہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو کھول اور بند کر کے اسے بتایا کہ کیپٹن پیکا کا مطلب تیس (تھرٹی) ہے ڈرٹی نہیں۔

شہر کی طرف آتے ہوئے راستے میں کیپٹن پیکا نے بتایا کہ اس نے تھائی لینڈ کبھی نہیں دیکھا ہے اور پھر سوتی سے پوچھا۔How is Thailand

"Same Same" سوتی نے مختصر جواب دے نے میں عافیت سمجھی۔

"کیا مطلب؟" کیپٹن پیکا نے حیرت سے پوچھا۔

"میں بتاتا ہوں پیکا۔" سوتی کو خاموش دے کھ کر ماحول کو خوشگوار بنانے کے لئے میں نے مداخلت کی۔

"کیپٹن پیکا! کمانڈر سوتی کا مطلب ہے کہ تھائی لینڈ اور فن لینڈ ایک ہی جیسے ملک ہیں۔"

"یہ کے سے ہو سکتا ہے" پیکا نے کہا۔ "یہاں فن لینڈ میں اتنی شدید سردی پڑتی ہے اور ہم لوگ شمالی قطب کے قریب ہیں۔ تھائی لینڈ تو خط استوا کے قریب ہے۔"

"وہ صحیح ہے لیکن تھائی لینڈ خوبصورت ٹانگوں (Thighs) کی دھرتی ہے اور فن لینڈ فن (موج مستی) کی سر زمین۔"

"اوہ نو! نو!" سوتی نے سختی سے احتجاج کیا۔

"چلیں کوئی بات نہیں یہ تو مذاق تھا۔" میں نے ان سے کہا۔ "وے سے یہ ہے کہ دونوں ملکوں کے اصل نام اور ہیں اور S سے شروع ہوتے ہیں تھائی لینڈ کا نام سیام (Siam) تھا اور فن لینڈ کا سومی (Soumi)۔ دونوں ملکوں کی بلیلاں مشہور ہیں۔ دونوں ملک برطانیہ، جرمنی، فرانس، اسپین جیسی یورپی طاقت کے قبضے میں نہیں رہے۔ ایشیا کے سارے ممالک یورپی کالونیاں بن گئے مگر جنگ عظیم کے دنوں میں بھی تھائی لینڈ (سیام) نے اپنی آزاد حیثیت برقرار رکھی اور تھائی لینڈ کے بادشاہ کی حکمت عملی کی وجہ سے جاپانی بھی اس ملک میں آتے جاتے رہے مگر اسے اپنی کالونی نہیں بنا سکے۔ اسی طرح یورپ کے کئی ممالک پر نازی حکومت کا تھوڑا یا زیادہ قبضہ رہا مگر خوش نصیبی سے فن لینڈ بچ گیا۔ تھائی لینڈ اور فن لینڈ میں ایک نمایاں فرق ضرور ہے تھائی لینڈ میں بادشاہت ہے فن لینڈ شروع سے اس سے آزاد رہا ہے۔"

میری یہ آخری والی بات کیپٹن پیکا کو بڑی پسند آئی۔ "یہ بہت بڑی بات ہے۔" کیپٹن پیکا نے کالر درست کرتے ہوئے کہا۔ "اس معاملے میں ہمارا فن لینڈ اپنے بھائی بہنوں (ڈنمارک، ناروے، سوئیڈن) سے بھی الگ تھلگ رہا ہے کیونکہ اسکینڈی نیویا کے باقی تمام ممالک میں بادشاہت ہے۔"

فن لینڈ سیسو اور ساناکا ملک

فن لینڈ کے مشرق میں پڑوسی ملک روس ہے لیکن فن لینڈ کا زیادہ تعلق سوئیڈن اور ناروے سے ہے جو اس کے مغرب اور شمال کے پڑوسی ہیں۔ جنوب میں بحیرہ بالٹک ہے۔ سردی، خوبصورتی، سماجی و معاشی ترقی اور جنسی آزادی کی وجہ سے اسکینڈے نیویا مشہور ہے۔ اسکینڈی نیویا جن پانچ ممالک کا گروپ ہے ان میں سے تین ناروے سوئیڈن اور فن لینڈ ایک دوسرے سے اے سے ملے ہوئے ہیں جے سے پاکستان بھارت اور بنگلہ دیش اس کا چوتھا ملک ڈنمارک ہے جو سری لنکا کی طرح تقریباً جزیرہ ہے بلکہ جزیروں کا مجموعہ ہے جن میں سے ایک بڑا جزیرہ جنوب میں جرمنی سے ملا ہوا ہے۔ پانچواں ملک آئس لینڈ ہے جو ناروے سے تقریباً ایک ہزار کلومیٹر دور بحر اوقیانوس میں بطخ کی شکل نما ایک جزیرہ ہے جہاں انسان کم اور بطخوں جے سے آبی پرندی (پینگوئن وغیرہ) زیادہ نظر آتے ہیں۔

فن لینڈ کا رقبہ تقریباً سوا تین لاکھ مربع کلومیٹر ہے یعنی جاپان جتنا بڑا ملک ہے لیکن مردم شماری صرف پچاس لاکھ ہے (جاپان کی آبادی اس سے پچیس گنا زیادہ ہے اور ہمارے صرف ایک شہر کراچی کی مردم شماری ایک کروڑ سے زیادہ ہے) فن لینڈ پاکستان کی طرح شمال اور جنوب میں تقریباً 1200 کلومیٹر لمبا ہے۔ لوگوں کی بڑی تعداد جنوبی علاقوں میں رہتی ہے۔ ملک کی بڑی بندرگاہ اور دارالحکومت ہیلسنکی فن لینڈ کے بالکل جنوب میں اے سے ہی ہے جیسے پاکستان میں کراچی۔ ہیلسنکی جہاز ساز کارخانوں، صنعتوں، تعلیمی اداروں کے اعتبار سے کراچی، کلکتہ اور بمبئی کے مقابلے کا شہر ہے۔ لیکن مردم شماری جو کہ صرف پانچ لاکھ ہے سکھر، ساہیوال، بغداد اور بصرہ سے بھی کم ہے۔

فن لینڈ میں دو قومی زبانیں ہیں جے سے کینیڈا میں فرانسیسی اور انگریزی ہے، ایک یہاں کے مقامی زبان فنس (Finnis) اور دوسری پڑوسی ملک سوئیڈن کی سوئیڈش ہے۔ سوئیڈش بولنے والے بمشکل سات فیصد ہیں لیکن سوئیڈن کا اس ملک (فن لینڈ) پر کافی اثر رہا ہے جو ابھی تک قائم ہے یہاں تک کہ ہیلسنکی شہر کی بنیاد بھی 1550ء میں سوئیڈن کے اس وقت کے بادشاہ گستاؤ واسا نے رکھی۔ فن لینڈ 1155ء سے لے کر 1809ء تک سوئیڈن کا حصہ

رہا۔1809ء میں روسیوں نے فن لینڈ فتح کر لیا اور پوری صدی 1917ء تک روسیوں کے قبضے میں رہا۔1917ء میں روسی انقلاب کے دوران فن لینڈ نے موقع پا کر اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

فن لینڈ میں سڑکوں کے نام اور حکومت کی طرف سے درس و تدریس فنس اور سوئیڈش دونوں زبانوں میں ہوتی ہے اور بعض جگہوں پر جہاں غیر ملکی لوگوں کا واسطہ پڑتا ہے تیسری انگریزی زبان بھی چلتی ہے۔ مثلاً ایئرپورٹ پر مردانہ ٹوائلٹ کے باہر فنس زبان میں Meihille، سوئیڈش میں Herr اور انگریزی میں Gents لکھا ہوا نظر آئے گا اور اسی طرح عورتوں کے ٹوائلٹ کے باہر ان تینوں زبانوں میں Naisile، Dame اور Ladies لکھا ہوا ہو گا۔ اسی طرح سڑکوں کے نام سوئیڈش اور فنس زبانوں میں لکھے ملیں گے۔ ہم جس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے اس سڑک کا سوئیڈش نام Slotts-gatan تھا اور فنس نام Linnan-Katu تھا۔ سوئیڈش زبان میں سڑک کو گاتن کہتے ہیں اور فنس زبان میں کاٹو کہتے ہیں۔

فن لینڈ میں پارلیمانی نظام حکومت رائج ہے۔ پارلیمنٹ کے لئے ہر چار چار سال کے بعد ملک بھر سے 200 نمائندے منتخب کئے جاتے ہیں۔ ملک کا سربراہ صدر ہوتا ہے جو چھ سال کے لئے ہوتا ہے اور اسے اچھے خاصے انتظامی اختیارات ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ پورے ملک میں بارہ وزیر ہوتے ہیں۔ وزیر اعظم کا چناؤ ملک کا صدر کرتا ہے۔ فن لینڈ یورپ کا پہلا ملک ہے۔ جس نے 1906ء میں خواتین کو حق رائے دہی دیا۔

فن لینڈ حالانکہ جاپان، جرمنی جتنا بڑا ملک ہے مگر زراعت کے لئے مشکل سے دس فیصد زمین استعمال میں آتی ہے۔ ملک کا بڑا یعنی ساٹھ یا ستر فیصد حصہ گھنے جنگلات جبکہ دس فیصد دریاؤں اور سمندری نالوں پر مشتمل ہے۔ جنگلات میں جو درخت ہیں ان کی نرم لکڑی کاغذ بنانے کے کام آتی ہے۔ فن لینڈ اور سوئیڈن وہ ممالک ہیں جہاں دنیا کا بہترین کاغذ بنتا ہے۔ دنیا میں استعمال ہونے والے کاغذ کا 20 فیصد کاغذ فن لینڈ مہیا کرتا ہے۔

فن لینڈ جہاز اور بڑی مشینری کے علاوہ کاغذ کی برآمدات سے بھی غیر ملکی زرمبالہ کماتا ہے۔ جے سے سوئیڈن VOLVO گاڑیوں کے لئے مشہور ہے۔ جرمنی مرسڈیز گاڑیوں کے لئے اس طرح یہ ملک (فن لینڈ) سیسو (Sisu) بسوں کے لئے مشہور ہے۔

فن لینڈ کے لوگ پیراکی اور اسکیٹنگ کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ مختلف کھیلوں کے بھی شائقین ہیں لیکن ان کو سب سے زیادہ دلچسپی سانا (Sauna) باتھ سے ہے۔ ہوٹلوں، ہاسٹلوں یہاں تک کہ کئی گھروں میں باتھ روم کی طرح ایک کمرہ سانا کے لئے بھی مخصوص ہوتا ہے جہاں الیکٹرک ہیٹر یا بھاپ سے گرمائش پیدا کی جاتی ہے۔ کچھ دیر بھاپ کی گرمی کھا کر ٹھنڈے پانی سے نہانا "سانا" ہے۔ بہرحال سانا باتھ لوگوں کو اچھا لگتا ہے یا نہیں مگر یہ لفظ (سانا) فن لینڈ والوں کی ایجاد ہے۔ سانا کے علاوہ ایک اور لفظ Sisu (سی سو) بھی فنس زبان کا لفظ ہے۔ سیسو کا مطلب ہے طاقت،

ہمت، پکا ارادہ وغیرہ۔ کسی بات پر قائم رہنے کو سیسو کہتے ہیں۔ یہاں کی بنی ہوئی مضبوط لاری اور ٹرک کا نام Sisu بھی اسی مقصد کے لئے رکھا گیا ہے۔

بہر حال سانا اور سیسو فن لینڈ کی زبان فنس کے خالص الفاظ ہیں جیسے یوگا اور نروان ہندی کے، سوموا اور سایونارا جاپانی کے پیزا اور اسپاگھٹی اطالوی کے کمیسٹری اور الجبرا عربی کے، جو اب ساری دنیا میں مشہور ہو گئے ہیں۔

فن لینڈ کو گیارہ صوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر صوبے کو اچھے خاصے اختیارات ملے ہوئے ہیں۔ اسکینڈی نیویا کے تمام ملکوں کی کرنسی کا نام کرونا ہے لیکن فن لینڈ کے نوٹ کا نام مارکا ہے۔

فن لینڈ کے دارالحکومت ہیلسنکی میں 1952ء میں اولمپک کے کھیل منعقد ہوئے تھے اور 1983ء میں ورلڈ چیمپئن شپ ہوئی تھی۔ ہیلسنکی وہ جگہ ہے جہاں مغربی اور مشرقی یورپ کے جہاز اور لوگ گزرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس شہر ہیلسنکی کو مشرق (کمیونسٹ یورپ) اور مغرب (سرمایہ دار یورپ) کا ملغوبہ کہتے ہیں۔ بحیرہ بالٹک میں ہیلسنکی سب سے زیادہ بڑی مصروف ترین اور خوبصورت بندرگاہ ہے۔ شاید اس لئے (یا کسی اور وجہ سے) اس شہر ہیلسنکی کو دختر بالٹک (Daughter of Baltic) کہتے ہیں۔